

کاروانِ ملت



مولانا وحید الدین خاں

کاروان ملت

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

Karwane Millat
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 1992
Reprinted 2008

This Book is free from Copyright

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market
New Delhi - 110 013
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Printed in India

۵	آمن از کلام	باب اول
۷	احیاء ملت	
۱۳	تعمیر نو کا مسئلہ	
۲۸	عمل کا رخ	
۳۶	خیر امنت	
۴۲	اسلامی جہاد	
۶۱	کاروان ملت	باب دوم
۶۸	صراط مستقیم سے انحراف	
۷۵	الامر بالمعروف والنہی عن المنکر	
۸۳	دور جدید کی مسلم تحریکیں	
۹۳	کامیابی کی شرط	
۱۰۰	اصلاح اعمال	
۱۱۷	مسائل ملت	باب سوم
۱۳۵	ادوات انسانی	
۱۴۳	غلط رہنمائی	
۱۴۹	صبر کا ہتھیار	
۱۵۶	فرقہ وارانہ مسئلہ	
۱۶۵	امن اور ترقی کی طرف	
۱۷۹	امنت مسلمہ	باب چہارم
۱۸۹	دعوتِ حق	
۲۰۵	اسلام کا سیلاب	
۲۱۱	راہِ نجات	
۲۲۲	اسلامی دعوت بدلتی ہوئی دنیا میں	

آغاز کلام

ایک مرتبہ میری ملاقات ایک مسلمان آئی اے اس سے ہوئی۔ انہوں نے کہا: میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ مجھے آپ سے سخت اختلاف ہے۔ آپ اسلام کو اور مسلمان کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی جیسے مولاناؤں نے اسلام کو برباد کیا ہے۔

یہ بات بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھیے تو یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ وہ خواہ مذکورہ قسم کے الفاظ نہ بولیں مگر عملاً ان کا خیال یہی ہے کہ مسلمانوں ہی کا دوسرا نام اسلام ہے، اور مسلمان جو کچھ کریں، اپنے آپ وہ اسلام بن جائے گا۔

اس کی ایک واضح علامت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے کسی کام (مثلاً مدعو اقوام سے ان کی لڑنے بھڑنے کی سیاست) کو غلط بتایا جائے تو وہ فوراً بگڑ جائیں گے۔ ان کی اس روش کے خلاف قرآن و حدیث سے خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل دیے جائیں مگر وہ اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ وہ سارے دلائل و حقائق کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیں گے کہ تم مسلم دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہو، تم مسلم مفاد کے خلاف کام کر رہے ہو۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کریں، اسی کا نام اسلام ہے۔ ایسے مسلمان کم ملیں گے جو اپنی زبان سے مذکورہ مسلمان آئی اے اس جیسا کلمہ بولیں مگر ہر مسلمان عملاً یہی کہہ رہا ہے کہ ہم کو اسلام پر نہ جانچو بلکہ خود اسلام کو ہمارے اوپر جانچو۔

زیر نظر کتاب کے مرتب کو موجودہ مسلمانوں کی اس نگر سے اتفاق نہیں۔ اس کتاب میں مسلمانوں کے طرز عمل کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اس میں قرآن و سنت کی روشنی میں مسلمانوں کے طرز عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو قرآن و سنت کی روشنی میں جانچیں اور اپنی روش کو قرآن و سنت کے مطابق بنائیں۔ قرآن و سنت کو چھوڑ کر ہی وہ موجودہ زمانہ میں برباد ہوئے ہیں اور قرآن و سنت کو اختیار کر کے ہی وہ خدا کی نظر میں دوبارہ فلاح کا استحقاق حاصل کر سکتے ہیں۔

باب اول

Faint, mostly illegible text in Arabic script, likely bleed-through from the reverse side of the page. The text appears to be a preface or introductory section.

احیاء ملت

پاکستان کے مشہور اخبار انوائس وقت (۳۰ مئی ۱۹۹۰ء) میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی عالمی زبوں حالی کا ذکر تھا اور اس کا عنوان حسب ذیل لفظوں میں قائم کیا گیا تھا:

امت پر تری آکے عجب وقت پڑا ہے

یہ مصرعہ دراصل ”مسدس عالی“ سے لیا گیا ہے۔ اس منظوم کتاب کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں ایک مناجات شامل کی گئی تھی۔ اس مناجات کا پہلا شعر یہ تھا:

اے خاصہ خاصانِ رسل وقت دعا ہے امت پر تری آکے عجب وقت پڑا ہے

سوسال پہلے جب الطافِ حسین عالی نے اپنی یہ کتاب تیار کر کے سرید احمد خاں (۱۸۹۸-۱۸۷۷ء) کو دی، تو سرید اتنا خوش ہوئے کہ انہوں نے کہا: خدا اگر قیامت میں پوچھے کہ کیلائے تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھو الایا ہوں۔

اس وقت سے لے کر اب تک مسلمانوں کے درمیان بے شمار رہنما اٹھے، بے شمار بڑی بڑی تحریکیں ابھریں۔ ان رہنماؤں اور ان تحریکوں کے غلغلے سے زمین و آسمان گونج اٹھے۔ مگر یہ تمام کی تمام تحریکیں سراسر بے نتیجہ رہیں۔ وہ مسلمانوں کی حالتِ زوال کو دوبارہ حالتِ عسروں تک پہنچانے والی نہایت نہیں ہوئیں۔ حالی کا شعر سوسال بعد بھی دہرا جا رہا ہے۔

مسلم رہنماؤں کی سوسالہ کوششیں کیوں جھٹا محال کا نمونہ بن کر رہ گئیں۔ اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ انہوں نے مرض کی تشفی میں غلطی کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی ساری کوششیں غلط مقام پر صرف کرتے رہے۔ وہ ملت کے درخت کی پتیوں پر پانی ڈالتے رہے۔ جب کہ اصل ضرورت یہ تھی کہ ملت کے درخت کی جڑ کو پانی سے سیراب کیا جائے۔

ہمارے تقریباً تمام رہنماؤں نے کارِ اول کو چھوڑ کر کارِ ثانی پر اپنی ساری توجہ صرف کر دی۔ وہ بنیاد کی تعمیر سے پہلے چت کھڑی کرنے میں لگے رہے۔ وہ تیاری کے بغیر امتِ عام کی نادانی کرتے رہے۔ ایسی جہد و جہد کے لئے موجودہ دنیا میں یہی مفہم رہے کہ وہ بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

ایک مثال

ایک شخص کے یہاں دو چھوٹے بچے ہیں۔ وہ پتا بتا ہے کہ اپنے بچوں کے بارہ میں اپنی ذمہ داریاں بانٹنے کے لئے قرآن و حدیث کا حکم معلوم کرے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے اس قول کو اپنا رہنما بنائے کہ: مَا خَلَّ وَالِدٌ وَوَلَدًا مِنْ خَلٍّ أَفْضَلُ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ (۳۲۹/۳) جو شخص اس حدیث رسول سے اپنا حکم اخذ کرے اور اس کی رہنمائی میں اپنے عمل کا نقشہ بنائے، وہ کیا کرے گا۔ وہ اپنی ساری توجہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر لگا دے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ اس کے بچے جب بڑھے ہوں تو وہ علم اور اخلاق کے اعتبار سے پوری طرح تیار ہوں۔ وہ خدا کے حقوق کو اور اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھیں۔ وہ اس قابل ہو چکے ہوں کہ زندگی کے شور سے پوری طرح مستغنی ہو کر زندگی کے میدان میں داخل ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مذکورہ آدمی "نکاح" کی آیتوں اور حدیثوں سے اپنی ذمہ داریوں کا تعین کرے۔ مثلاً وہ اس حدیث رسول سے اپنا حکم معلوم کرے کہ: عَلَيْكُمْ بِأَبَائِهِمْ وَبَنَاتِهِمْ أَنْ تَغْضُؤُا لِبَصْرِهِمْ وَأَخْضُؤُا لِبَفْسَرِحِهِمْ (الترمذی، ابواب النکاح)

جو آدمی اس حدیث رسول سے اپنا حکم اخذ کرے، وہ اپنے بچوں کے بارہ میں کس چیز کو اپنی ذمہ داری سمجھے گا۔ وہ سمجھے گا کہ سب سے ضروری کام بچوں کے نکاح کا انتظام کرنا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے لئے ایک شوہر اور اپنے بچہ کے لئے ایک بیوی کی تلاش میں مصروف ہو جائے گا۔ اور چاہے گا کہ جلد سے جلد ان کا جوڑا فراہم کرے کہ ان کا نکاح کر دے، خواہ ہندستان کی بعض پست اقوام کی طرح اس کو ایسا کیوں نہ کرنا پڑے کہ وہ دو لہا اور دلہن کو اپنی گود میں بٹھا کر مقام نکاح تک لے جائے۔

موجودہ زمانہ میں ایسا امت کے معاملہ میں ہمارے رہنماؤں نے وہی غلطی کی ہے جو غلطی وہ شخص کرے گا جو اپنے چھوٹے بچوں کے بارہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے نکاح کے حکم کو اپنا پہلا رہنما بنالے۔

آج کے مسلمان

موجودہ زمانہ میں جو مسلم نسلیں ہیں، ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ زوال کا شکار ہو گئیں۔ اب ضرورت تھی کہ ان کو دوبارہ عروج کی طرف لے جایا جائے۔ موجودہ زمانہ میں ہزاروں کی تعداد

میں ایسے رہنا اٹھے جن کا مقصد یہی تھا۔ یعنی ملت مسلمہ کا احیاء۔

ان رہنماؤں کے سامنے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ قرآن کی وہ کون سی آیت ہے جو اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کرتی ہے، اور جس کی روشنی میں ہم اپنے عمل کا نظام بنانا چاہئے۔ تقریباً بلا استثنا ہر ایک نے یہ کیا کہ اس نے خلافت و امامت کی آیات کو اپنے لیے رہنما آیت قرار دیا :

سكنتم خيرا امة اخرجت للناس تا مرون تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکال گئی ہے۔
 بالمعروف و قنہون عن المنکر تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے
 (آل عمران ۱۱۰) ہو۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے احیاء کے لئے کیا کرنا ہے، اس کا حکم ہمارے رہنماؤں نے مذکورہ قسم کی آیتوں سے نکالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک اول دن سے مسلمانوں کو مجاہدانہ اقدام اور قیام امامت کا سبق دینے لگا۔ ہر ایک نے مسلمانوں کے ذہن میں یہ تصور بٹھانا شروع کیا کہ تم دنیا کے فوجدار ہو، اٹھو اور دنیا کو سفر کر کے خلافت ارضی کا مقام سنبھالو۔ اقبال نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا :

سبق پڑھو صداقت کا عدالت کا شہادت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
 یہی بات مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان الفاظ میں کہی ہے: مسلمان اپنے دین کی رو سے دنیا کے محاسب اور خدائی فوجدار ہیں۔ جس دن وہ بیدار ہوں گے اور اپنا فرض منصبی انجام دیں گے، وہ مشرق اور مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب ہوگا۔ (عروج و زوال، صفحہ ۳۹۴)

مولانا موصوف دوسری جگہ "انتساب کائنات" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: امت مسلمہ پر عالمی نگرانی، اخلاق و رہنمائی، انفرادی و بین الاقوامی طرز عمل کے انتساب، انصاف کے قیام، شہادت حق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے: (اسلام کے اثرات و احسانات، صفحہ ۱۲۴)

یہی موجودہ زمانہ کے تمام مفکروں اور رہنماؤں کا معاملہ ہے۔ ہر ایک نے خلافت و امامت کی آیتوں کو اپنا اولین رہنما بنایا۔ ان کے الفاظ اور ان کی تعبیرات اگرچہ ایک دوسرے سے جدا تھیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے سب کا خلاصہ ایک تھا۔ یعنی مسلمانوں کو دنیا کا فوجدار بننے

کی دعوت دینا۔

آزاد سماںی مسلمانوں کو تعین کرتے تھے کہ آپس میں اس طرح سلام کیا کرو۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ
نعمن غلیفۃ اللہ۔ کچھ دوسرے لوگ اس جھوٹے پن تک نہیں گئے۔ انہوں نے اسی بات کو زیادہ
ہنڈب انداز میں بیان کیا جس کی ایک مثال اوپر کے اقتباس میں نظر آتی ہے۔

موجودہ زمانہ کی مسلم نسلوں کے احیاء کے لئے عمل کا آغاز کہاں سے کرنا ہے، اس کا حکم
ہمارے رہنماؤں نے امامت اور قیادت جیسی آیتوں سے اخذ کیا۔ ان کا یہ استنباط غلط تھا،
چنانچہ ان کا سارا عمل غلط ہو کر رہ گیا۔ ہمارے رہنماؤں کی اٹھائی ہوئی تحریکیں اس فارسی شعر کا
مصدق بن گئیں کہ سمار جب پہلی ایسٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو اس کے بعد خریا تک دیوار ٹیڑھی ہو جاتی
ہے :

خشت اول چوں نہد سمار کج تاثریامی رود دیوار کج

ایک مشہور مسلم رہنما نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا : تم ہی تو ہو جس
نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دئے تھے۔ یہ ایک بے اصل کلام ہے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ
موجودہ مسلمان گویا دور اول کے مسلمانوں کا تسلسل ہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ
موجودہ زمانہ کے مسلمان دور اول کے مسلمانوں کی بعد کی نسل ہیں۔ مزید یہ کہ عقیدہ اور کردار کے پہلو
سے موجودہ مسلمانوں کی جو حالت ہے، اس کے اعتبار سے یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ موجودہ زمانہ کے
مسلمان دور اول کے مسلمانوں کی اگلی نسل ہیں۔

ان حقائق کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو مسلم ہو گا کہ موجودہ مسلم نسلوں کے معاملہ میں قرآن کا حکم
جاننے کے لئے صحیح اور متعلق آیت حسب ذیل ہے :

الم یأمن اللذین آمنوا ان تفتح قلوبہم
لذکر اللہ وما نزل من الحق۔ ولا یكونوا
کالذین اتوا الکتاب من قبل فظال
علیہم الامۃ فقت قلوبہم وکثیر
منہم فاستقون۔ اعلمو ان اللہ یحیی

کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان
کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور
اس حق کے آگے جو نازل ہوا ہے۔ اور وہ ان
لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی
تھی۔ پھر ان پر ایسی مدت گزر گئی تو ان کے دل سنت

الارض بعد موتها. قد بئت نكلم الایات
 لعنکم تعقلون
 ہونگے۔ اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ جان لو
 کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد۔
 ہم نے تمہارے لئے نشانیاں بیان کر دی ہیں تاکہ
 تم سمجھو۔

(الحمدید ۱۶-۱۷)

خدا کی ہدایت ابتداً جب آتی ہے تو جو لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں، ان کا متاثر نہ ہونا ہی انقلاب
 کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ان کے اندر ایمان ایک زندہ طاقت کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے۔ ان کی
 پوری زندگی جاہلیت سے نکل کر اسلام پر قائم ہو جاتی ہے۔ اب وہ پہلے والے انسان نہیں
 ہوتے، بلکہ بالکل نئے انسان بن جاتے ہیں۔
 یہ پہلی اسلامی نسل کی بات ہے۔ اس کے بعد دور اول کے لوگ وفات پاتے جاتے ہیں اور
 ان کی جگہ دوسرے مسلمان آنے لگتے ہیں جو توالد و تناسل کے ذریعہ اسلام کی جماعت میں شامل
 ہونے لگتے۔

یہ اسلام کی بعد کی نسلیں ہیں۔ قرآن کے مطابق، ان لوگوں میں مساوت و قلب (الحمدید ۱۶)
 کی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی دور اول کے مسلمانوں کا ایمان اگر تڑپ والا ایمان تھا تو بعد کی
 مسلم نسلیں کا ایمان بے حس کا شکار ہو جاتا ہے۔ دور اول کے لوگوں میں اسلام اگر روح (اسپرٹ)
 اور ہیئت (فارم) دونوں کے اعتبار سے موجود تھا تو دور ابعد کے لوگوں میں روح غائب ہو جاتی
 ہے اور صرف ظاہری ہیئت باقی رہ جاتی ہے۔ دور اول کے لوگوں کے لئے دین کا ماخذ اگر قرآن
 و سنت تھا تو دور ابعد کے لوگوں کے یہاں قرآن و سنت کی عقیدہ کے خانہ میں چلا جاتا ہے، اور
 دین کے ماخذ کی حیثیت سے انھیں جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ صرف وہ تاریخ ہے جو بعد کے زمانوں
 میں ایک یا دوسری شکل میں بنی۔

ان اسباب کے نتیجہ میں دونوں گروہوں کے درمیان بنیادی فرق واقع ہو جاتا ہے۔ دور اول کے
 مسلمان اگر زندہ ملت تھے تو دور ابعد کے مسلمان مردہ ملت بن جاتے ہیں۔ دور اول کے لوگ اگر ہرے
 بھرے درخت کی مانند تھے تو دور ابعد کے لوگ سوکھے ہوئے درخت کی مانند ہو جاتے ہیں جس کے کسی
 کو نہ سایہ ملے اور نہ پھل۔

کوئی مسلم نسل جب زوال کی اس حالت کو پہنچ جائے تو اس وقت اس کے احیاء نوکے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اس کا جواب مذکورہ آیت (الحمدید ۱۷) میں دیا گیا ہے۔ ایسی نسل کی مثال مردہ زمین کی ہے، اور اس کو دوبارہ زندگی دینے کے لئے وہی عمل کرنا چاہئے جو مردہ زمین کے ساتھ کوئی کسان کرتا ہے۔

کسان کو جب ایک مردہ زمین ملتی ہے تو وہ ایسا نہیں کرتا کہ پہلے ہی مرحلہ میں اس کے اندر بیج بکھیر دے۔ وہ یہ کرتا ہے کہ پہلے زمین کو تیار کرتا ہے۔ اس کا لٹ پھرنکا لٹا ہے۔ اس کے جھاڑ بھنکار کو کاٹتا ہے۔ اس کو ہموار کرتا ہے۔ اس کو جوڑتا ہے اور اس میں پانی دیتا ہے۔ اس ابتدائی عمل کے بعد جب زمین تیار ہو کر قابل کاشت ہو جاتی ہے، اس وقت وہ اس میں بیج ڈالتا ہے۔ اس کے بعد بہت جلد دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس کی زمین میں ہلہاتی ہوئی فصل کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ یہ کرتا کہ زمین کو تیار نہ کرے جیسے اس میں بیج بکھیر دیتا تو اس کے حصہ میں آخر کار کچھ بھی نہ آتا۔

مسلم دینہا اگر قرآن کی اس آیت سے موجودہ مسلمانوں کا حکم اخذ کرتے تو وہ کسان کی طرح ایک ایک مسلمان کی تسلیم و تربیت میں لگ جاتے۔ وہ ان کے رسی عقیدہ کو زندہ عقیدہ بناتے۔ وہ ان کے اندر اسلام کی اسپرٹ ابھارتے۔ وہ ان کے ایمان کو ذہنی انقلاب کے درجہ تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ وہ خدا کے ساتھ ان کے تعلق کو اس طرح استوار کرتے کہ خدا ان کے لئے ایک حاضر و ناظر حقیقت بن جائے۔

یہ بلاشبہ ایک نیشک عمل ہے۔ اس کو گم نامی کی سطح پر انجام دینا پڑتا ہے۔ اس عمل کے دور ان ایک مقبول آدمی بھی اپنی قوم کے اندر نامقبول بن جاتا ہے۔ لیکن اگر ہمارے رہنما ان تمام ناموافق باتوں کو برداشت کرتے ہوئے اس ابتدائی کام کو انجام دیتے اور اس کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچاتے تو یقیناً آج ہمارے سامنے مسلم ملت ایک سرسبز و شاداب باغ کی صورت میں موجود ہوتی۔ مگر جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو ان کے تمام پرشور ہنگاموں کے باوجود ملت ہر طرف ایک ویران باغ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

اب ماضی کی اس غلطی کی کم سے کم تلافی یہ ہے کہ حال میں اس کو نہ دہرایا جائے۔ اب تمام مسلم

رہنماؤں اور تمام مسلم دانشوروں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ اپنی موجودہ لائسنسی سرگرمیوں کو بالکل بند کر دیں۔ سب کے سب پیچھے لوٹیں اور ملت کی ذہنی بیداری کے کام میں لگ جائیں۔ ملت کے افراد میں ایمان و اسلام کی بنیاد پر ذہنی بیداری لائسنسی غیر عملی اقدام کی سیاست چلانا صرف ایک جرم ہے نہ کہ کوئی حقیقی عمل۔

موجودہ زمانہ میں ایسا، اسلام کے لئے ہم کو جو عمل کرنا ہے وہ یہی ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا عمل صرف وقت اور قوت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

تعمیر نو کا مسئلہ

تہبید

اسلام اور اہل اسلام کی تاریخ چودہ سو سال کی مدت تک پھیلی ہوئی ہے۔ ابتدائی تقریباً ایک ہزار سال ایسے ہیں جب کہ اہل اسلام کو غلبہ ملا ہوا تھا۔ ان کی تہذیب غالب تہذیب کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بعد مسلم قوموں پر زوال آیا۔ وہ دوسری قوموں سے شکست کھا گئے۔ شکست اور مغلوبیت کی یہ صورت تا حال باقی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ ملکوں میں وہ مقامی اکثریت کے ہاتھوں مغلوب ہیں اور دوسرے ملکوں میں بیرونی قوموں نے انہیں مغلوب کر رکھا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ جو مصیبت بھی تمہارے اوپر آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے کے کائناتیہ ہوتی ہے (التوبہ ۳۰)۔ اس قانون الہی کی روشنی میں یہ اتنا ہو گا کہ مغلوبیت کی موجودہ صورت حال کا سبب باہر نہیں ہے بلکہ اندر ہے۔ یہ خود اہل اسلام کی داخلی کیاں ہیں جنہوں نے ان کو موجودہ حالت میں مبتلا کر دیا ہے۔

اسلام کے دور اول میں غزوہ احد (۶۳) میں اہل اسلام کو شکست ہوئی۔ یہ جنگ اگرچہ واضح طور پر مخالفین کے ظلم اور جارحیت کا نتیجہ تھی۔ مگر قرآن میں اس کی ذمہ داری خود مسلمانوں کے اوپر ڈالنے ہوئے کہا گیا کہ اس کا سبب تمہارا باہمی نزاع (آل عمران ۱۵۲) تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر تم چاہتے ہو کہ دوبارہ تمہارے ساتھ احد جیسا المیہ نہ پیش آئے تو اپنے اندر نزاع کی حالت کو ختم کرو۔ تم ایک بے نزاع گروہ بن جاؤ۔

اس طرح غزوہ حنین (۶۸) میں ابتداً اہل اسلام کو شکست ہوئی اور انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ جنگ بھی تمام تر مخالفین اسلام کی سازش اور جارحیت کی بنا پر پیش آئی۔ مگر قرآن میں جب اس پر تبصرو کیا گیا تو ابتدائی شکست اور نقصان کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کی داخلی کمی پر ڈال دی گئی اور فرمایا گیا کہ یہ حادثہ اس لئے پیش آیا کہ تم کو اپنی کثرت پر ناز (التوبہ ۲۵) ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ حنین جیسا حادثہ نہ دہرایا جائے تو تم اپنے آپ کو فخر و ناز کی نفسیات سے بچاؤ۔ اپنے اندر تواضع کا مزاج پیدا کرو۔

اس سے معلوم ہو کہ اس طرح کا معاملہ پیش آنے کی صورت میں صبح اسلامی دوسرے دن سے اپنے اندر پائے جانے والے سبب کو دور کیا جائے نہ کہ بیرونی ظالم کے خلاف احتجاج کا طوفان کھڑا کیا جائے۔ مسئلہ کا حل ہمارے اندر ہے نہ کہ ہمارے باہر۔

قرآن فطرت انسانی کا شرعی بیان ہے۔ قرآن میں جو بات شریعت کی زبان میں کہی گئی ہے وہ ہر آدمی کی فطرت میں پیدا نشی طور پر موجود ہے۔ ہر آدمی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، جب کسی شکست سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی فطرت اس کو یہی بات بھاتی ہے کہ تمہاری کیوں کی بنا پر ایسا ہوا۔ اس لیے اپنی کیوں کو دور کر کے ایسے انجام سے بچو۔ اس کے خلاف صوفی اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی کے آس پاس کچھ بھگانے والے لوگ موجود ہوں اور وہ اس کو بھگا کر اس کے ذہن کو غلط رخ پر موڑ دیں۔

اس کی ایک انفرادی مثال رابرٹ امیان (Robert Immian) ہے۔ وہ لمبی کوڈ کا عالمی چیمپین ہے۔ ایک بار وہ مقابلہ میں ہار گیا۔ اس کے بعد اس سے پوچھا گیا کہ اب تمہارا پروگرام کیا ہے۔ ٹائلس آف اٹریا (۱۵ اپریل ۱۹۸۸ء) کے مطابق اس نے جواب دیا کہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں اپنے ان نقص سے چھٹکارا حاصل کروں جو میرے لئے ابھی کارکردگی میں رکاوٹ ہیں :

The most important is to get rid of the defects which prevent me from improving my performance.

یہ دراصل فطرت کا سبق تھا جو مذکورہ کھلاڑی کی زبان پر جاری ہوا۔ جب بھی کوئی شخص زندگی کی دوڑ میں گر پڑتا ہے تو اس کی فطرت خاموش زبان میں اس سے کہتی ہے کہ تم اپنی کیوں کو دور کرو، اس کے بعد تم اپنے آپ کو دوبارہ اٹھانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ فطرت کے اسی سبق کو رہنما بنا کر ہزاروں افراد نے ایک بار ناکام ہونے کے بعد دوسری بار کامیابی کی منزل کو پایا ہے۔

فرد کے احیاء اور ناکامی جو اصول ہے وہی قوم کے احیاء اور ناکامی کا بھی اصول ہے۔ مقابلہ کی اس دنیا میں بار بار لڑا جاتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے شکست کھا جاتی ہے۔ اس وقت فطرت کا خود کار نظام اپنے آپ جاگ پڑتا ہے۔ وہ قوم کو سکھاتا ہے کہ تمہاری شکست کا سبب خود تمہاری اندرونی کمزوری ہے۔ اس کمزوری کو دور کرنے میں لگ جاناؤ۔ جب تمہاری داخلی کمزوری دور ہوگی تو اس کے بعد تمہاری شکست بھی فتح میں تبدیل ہو چکی ہوگی۔

رہنمائی ذمہ داری

ایک آدمی کے ہاتھ یا پاؤں کی ہڈی ٹوٹ جانے تو کوئی بھی ڈاکٹر بطور خود اس کو دوبارہ جوڑ نہیں سکتا۔ ایسے کیس میں ڈاکٹر جو کچھ کرتا ہے وہ حقیقتاً مدد ہے نہ کہ شفا۔ ڈاکٹر صرف یہ کرتا ہے کہ وہ ہڈی کے دونوں سروں کو ٹھیک طور پر ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے، اور پھر ٹریشن (traction) وغیرہ کے ذریعہ عضو کے اوپر خارجی بندش قائم کر دیتا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے نہ پائے۔ اس کے بعد دونوں ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑنے کا پورا عمل فطرت انجام دیتی ہے (17/821)

یہی معاملہ پورے علم طب کا ہے۔ طبیب یا ڈاکٹر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے کہ "طبیعت مدبرہ بدن" کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جائے۔ اصل کام فطرت (طبیعت مدبرہ بدن) کرتی ہے۔ معالج صرف اس کا مددگار بن جاتا ہے، وہ اس کے راستگی رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ قوم کے احیاء نو کا بھی ہے۔ کوئی قوم جب شکست سے دوچار ہوتی ہے تو اس کے اندر خود فطرت کے قائم کردہ نظام کے تحت حیات نو کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ یہاں رہنما کا کام بس وہی ہے جو کسی علاج میں ڈاکٹر کا ہوتا ہے۔ رہنما کو یہ کرنا ہے کہ وہ فطرت کے تحت ابھرنے والے عمل کے ابھرنے میں مدد دے، وہ اس کو غلط رخ کی طرف جانے سے روکے۔ فطرت ہمیشہ ان کو صحیح رخ پر متحرک کرتی ہے۔ یہ صرف غلط رہنما ہیں جو ان کے ذہن کو بلا ڈاکٹر اس کو رخ سے بے رخ کر دیتے ہیں، وہ اس کو تعمیر کے بجائے تخریب کے راستہ میں دوڑا دیتے ہیں۔

مسلمان ایک تاریخی استثناء

تاریخ میں بار بار قوموں کے ساتھ شکست کا معاملہ پیش آیا ہے۔ مگر بار بار ایسا ہوا کہ ایک قوم گر کر بہت کم مدت میں دوبارہ اٹھ گئی۔ اس معاملہ میں موجودہ مسلمانوں کی مثال ایک استثنائی مثال ہے۔ مسلمانوں کی مغلوبیت پر دو سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت گزر گئی۔ مگر اب تک ان کے اندر کیوں کو دور کرنے کا مذکورہ عمل جاری نہیں ہوا۔ اس لئے ان کی مغلوبیت بھی دوبارہ غلبہ میں تبدیل نہ ہو سکی۔

مسلمانوں کے ساتھ یہ استثنائی معاملہ اس لئے پیش آیا کہ ان کے درمیان فطرت کا وہ عمل جاری نہ ہو سکا جو دوسری قوموں میں بلاتناخیر جاری ہو گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ ہوا کہ شکست کا واقعہ پیش آنے کے فوراً بعد ان کے درمیان ایسے رہنما اٹھ کر آئے جو اصل حقیقت سے بے خبر تھے۔

ان کی اٹنی رہنمائی فطرت کے اوپر ایک قسم کا پردہ بن گئی۔ انھوں نے قوم کو مثبت رد عمل کے بجائے منفی رد عمل کی سمت میں موڑ دیا۔

شکست کا واقعہ پیش آنے کے بعد فطرت یہ سبق دیتی ہے کہ اسباب شکست کو دور کر دو۔ مگر مسلمانوں کے رہنماؤں نے اپنے بے جا جوش کے تحت انھیں اکایا کہ تم خالوں سے لاجب آؤ۔ اس طرح یہ ہوا کہ جو وقت تعمیر خویش کی جدوجہد میں لگتا وہ تخریب فیکری کا کام کوششوں میں ضائع ہوتا رہا۔ اور تادم تخریب بہت بڑے پیمانے پر ضائع ہو رہا ہے۔

دوسوا سالہ مسئلہ

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۸۲۳-۱۷۶۲)، شاہ ولی اللہ کے فرزند تھے۔ ان کے زمانہ میں "نصرانی حکام کا حکم دہلی تک بے دخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالہرب ہو گیا ہے (فتاویٰ عزیزی، جلد اول)، انھوں نے اپنے ایک عربی شعر میں کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ انگریز جو دولت کے مالک ہیں انھوں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر رکھا ہے:

وإني أرى الأضرخ اصحاب ثروة لقد افسدوا ما بين دہلی وکابل

اس زمانہ کے ایک اور بزرگ سید احمد شہید بریلوی (۱۸۳۱-۱۷۸۶) نے اپنے ایک خط میں شاہ سلیمان حاکم چترال کو لکھا کہ عیسائی اور مشرکین جیسے برے لوگوں نے ہندوستان کے بیشتر حصہ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور اس ملک کو ظلم و جور سے بھر دیا ہے، انصاری ٹھوکیدہ خصال و مشرکین بد کمال براکثر بلاد ہندوستان یا اقتدو آں دیار را بنظلمات ظلم و بیداد مشرکوں ساختند

سید صاحب نے ایک اور خط میں غلام حیدر خاں کو لکھا جو اس وقت ریاست گوالیار کے ایک فوجی افسر تھے۔ انھوں نے لکھا کہ ملک ہندوستان کا بیشتر حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے اور انھوں نے ہر جگہ ظلم و جور کا قانون جاری کر رکھا ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی ہے اکثر بلاد ہندوستان بدست بیگانگان افتادہ و الیشاں ہر جا بنیاد و آئین جو رو ظلم نہادہ ہر ریاست رؤساے ہندوستان برباد رفتہ، تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ پنجم، صفحہ ۳۷۰

ہمارے بزرگوں نے یہ بات انیسویں صدی کے شروع میں ہی تھی۔ گویا انھوں نے تقریباً دو سو سال پہلے یہ اعلان کیا کہ برصغیر ہند کے مسلمان دوسری قوموں کے ظلم و ستم کی زد میں آگئے ہیں۔ آج

دوسو برس بعد بھی ہمارے رہنماؤں کے پاس کہنے کی جو بات ہے وہ یہی ہے۔ آج بھی مزید شدت کے ساتھ وہ اسی بات کو دہرا رہے ہیں۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کے نکلنے اور بولنے والے آج بھی متفقہ طور پر کہہ رہے ہیں کہ مسلمان غیر قوموں کے ظلم و جور کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہر جگہ ان کو تعصب اور جارحانہ ذریعوں کا سامنا پیش آرہا ہے۔

زیادہ اہم سوال

دوسو سال سے مسلمانوں کے تمام اہل علم اور اہل زبان یہ پکار رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اوپر ظلم کیا جا رہا ہے۔ مگر بات اسی پکار پر ختم نہیں ہو جاتی۔ فطرت کے مذکورہ قانون کی روشنی میں دیکھتے تو اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اتنی لمبی مدت گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں کی حالت بدلی کیوں نہیں۔ کیا وجہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں کی شکست اور مغلوبیت کی حالت بدستور جاری ہے۔ اتنی مدت یا اس سے بھی کم مدت میں دوسری دینی ہوئی تو میں دوبارہ ابھر آؤں۔ پھر مسلمان ایک بار گرنے کے بعد دوبارہ کیوں نہیں ابھر رہے ہیں۔

یہ تاریخ کا ایک انوکھا معاملہ ہے جو صرف مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ معلوم تاریخ میں کسی بھی دوسری قوم کے ساتھ کبھی اس قسم کا حالانہ معاملہ پیش نہیں آیا جو مسلسل سیکڑوں سال تک جاری رہے، پھر بھی اس کا خاتمہ نہ ہو سکے۔

تاریخ کا تجربہ یہ ہے کہ دباؤ سے تو میں ابھرتی ہیں۔ ظلم و فساد ان کو نئی ترقیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ناموافق صورت حال کا پیش آنا ہمیشہ قوموں کے لئے عروج کا نیا زمین ثابت ہوا ہے۔ اس وقت انوں اقوام کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کم من ذنۃ قلیلة غلبت ذنۃ کثیرۃ باذن اللہ (البقرہ ۲۳۹) یعنی کتنی ہی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل جماعت ایک کثیر جماعت پر اللہ کے اذن سے غالب آئی ہے۔

اس آیت میں "قلیل" سے مراد صرف عددی قلت نہیں ہے۔ بلکہ ہر اعتبار سے قلت ہے۔ عربی زبان میں قلیل کا لفظ اس قسم کے جامع مفہوم کے لئے معروف ہے۔ حماسی شاعر نے کہا ہے:

فان ألف فی بشر اکم قلیل فان فی خیار کم کثیر

قرآن کا یہ بیان تاریخ کے عین مطابق ہے۔ آرنلڈ ٹوانسن بی (۱۹۰۵ - ۱۸۸۹) کی کتاب تاریخ

کا مطالعہ (A Study of History) جو بارہ ضخیم جلدوں میں ہے، گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔ اگریز مورخ نے اس کتاب میں پوری معلوم تاریخ کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ جو قومیں مسیح کی زد میں آئیں وہی قومیں ابھری ہیں اور انہیں نے بڑی بڑی تاریخ بنائی ہے۔ گویا اس دنیا میں جو تاریخی قانون رائج ہے وہ یہ کہ جو قومیں مغلوبیت کا شکار ہوں وہ دوبارہ ابھریں اور غالب آئیں۔ اس معاملہ کی وضاحت کے لئے دو مثال لیں، ایک اسلامی تاریخ کی، اور دوسری غیر مسلموں کی تاریخ کی۔

تاریخ کی مثال

اس سلسلہ میں ایک نمایاں مثال خود اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ملتی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو اپنے ابتدائی وطن مکہ میں اس کو شدید ترین قسم کے ظلم و زیادتی کا شکار ہونا پڑا۔ مگر اس ظلم و زیادتی نے اسلام کی تحریک کو اور اہل اسلام کی مختلف جماعت کو صرف منظم ہونا نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ مغلوبیت کی اس حالت سے فتح و غلبہ کا ایک نیا دور پیدا ہوا۔ جس گروہ کو اپنے وطن مکہ میں جگہ نہیں ملی تھی اس نے ایک صدی کے اندر تمام عالم میں اپنے لئے ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی۔ دوسری مثال یورپ کی کئی قوموں کی ہے۔ مسلمانوں نے صلیبی جنگوں (۱۲۹۱-۱۰۹۵ء) میں مسیحی قوموں کو شدید ترین شکست دی۔ مگر یہ شکست مغربی قوموں کے مستقبل کا خاتمہ نہ کر سکی۔ شکست کے چند سو سال بعد یہ مسیحی قومیں نئی تہذیب اور نئی طاقت کے ساتھ ابھریں۔ انہوں نے مسلمانوں سمیت تمام اقوام کے اوپر براہ راست یا بالواسطہ طور پر غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ غلبہ تا حال جاری اور قائم ہے۔

اذن اللہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغلوب گروہوں کو دوبارہ غلبہ کا یہ مقام کیسے ملا۔ اس کا سادہ سا جواب صرف ایک لفظ میں چھپا ہوا ہے اور وہ قرآن کی مذکورہ آیت کے مطابق اذن اللہ (البقرہ ۲۲۹) ہے۔ یعنی اللہ کا حکم، بالفاظ دیگر، قانون فطرت کی پیروی۔

فطرت کی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے یہ قانون جاری کر رکھا ہے کہ کوئی چیز ہمیشہ کے لئے ضائع نہ ہو سکے۔ جب بھی کسی چیز کے ساتھ نقصان کی کوئی صورت پیش آئے تو وہ اپنی کھوئی ہوئی صلاحیت کو دوبارہ حاصل کر کے اپنی سابقہ حیثیت کو از سر نو بحال کر لے۔ یہ اذن اللہ (قانون فطرت) ہے۔ قوموں کے عروج و زوال

کے معاملہ کو اسی کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ فطرت کا ایک آفاقی اصول ہے۔ وہ نہ صرف انسانوں میں بلکہ ساری دنیا میں قائم ہے۔ اس اصول کو عام طور پر تعویض (compensation) کا اصول کہا جاتا ہے۔ فطرت میں جب بھی کوئی کمی واقع ہوتی ہے تو وہیں اس کمی کی تلافی یا تعویض کا عمل بھی جاری ہو جاتا ہے۔ فوراً ایسے اسباب حرکت میں آجاتے ہیں جو کمی کی تلافی کر کے سابقہ صورت حال کو دوبارہ بحال کر سکیں۔

کمی کی تلافی (compensation) کا یہ اصول فطرت کا ایک عام اصول ہے۔ مثلاً اپنے مکروہ میں آپ ہوا نکالنے والا پتھرا (کزن اسٹ فین) لگائیں تو جب وہ مکروہ کی ہوا باہر نکالے گا تو فوراً ہی باہر کی ہوا مکروہ کے اندر آنا شروع ہو جائے گی تاکہ مکروہ کو دوبارہ ہوا سے پر کر سکے۔ انسان کے جسم میں خون کی مقدار اوسط طور پر اس کے جسم کے وزن کا سات سے آٹھ فی صد حصہ ہوتا ہے۔ اگر کسی حادثہ کی وجہ سے خون کا ایک حصہ نکل جائے تو پورے جسم میں ایمرجنسی کی حالت قائم ہو جاتی ہے تاکہ خون کی مقدار کو جلد از جلد برابر کر لیا جاسکے (2/1112)

حیاتیاتی نظام کی ایک اصطلاح ہے جس کو تعویضی امتداد (compensatory hypertrophy) یا انسا لبرائے تعویض (compensatory growth) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خود کار نظام ہے۔ جسم کے اندر جب بھی کسی قسم کی کمی واقع ہوتی ہے تو یہ نظام اپنے آپ حرکت میں آجاتا ہے اور جسم کے تمام ذرائع کو استعمال کر کے کم سے کم وقت میں مذکورہ کمی کی تلافی کر دیتا ہے۔

جیوانی جسم کے اکثر اعضاء جوڑے جوڑے کی صورت میں ہیں۔ اگر کسی جوڑے کا ایک عضو ضائع ہو جائے تو باقی رہنے والا عضو جرم میں بڑھنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے استعمال کی بڑھی ہوئی مانگ کو پورا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے جسم میں دو گردے ہوتے ہیں۔ اگر ایک گردے کو آپریشن کے ذریعہ نکال لیا جائے تو دوسرے گردے کا جرم اپنے آپ بڑھ جائے گا تاکہ ایک گردہ دو گردوں کا کام کر سکے۔ اس کو تعویضی رد عمل کہا جاتا ہے:

Many organs of animals occur in pairs, and if one is lost the remaining member increases in size, as if responding to the demands of increased use. If one of the two kidneys of a human is removed, for example, the other increases in size. This is called a compensatory reaction. (8/442)

قرآن کی آیت: البقرہ ۲۳۹ میں اذن اللہ سے مراد فطرت کا ہی تانوں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کی فطرت اس ڈھنگ پر بنائی ہے کہ جب کسی چیز کو نقصان کا تجربہ ہو تو فوراً وہ اپنی اس کی کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہو جائے جس کی بنا پر اس کو یہ نقصان اٹھانا پڑا۔ جو لوگ فطرت کے اس قانون کا اتباع کریں گے وہ بالآخر اپنے کھونے پھونے کے مقام کو دوبارہ پالیں گے۔

اسی قانون فطرت کی بنا پر ایسا ہے کہ جب بھی کسی فرد یا قوم کے ساتھ کسی نقصان کا معاملہ ہوتا ہے تو اس کی اندرونی فطرت اس کو یہ رہنمائی دینے لگتی ہے کہ تم اپنی کیوں کی کٹائی کرو۔ اس طرح تم کوٹنی ہوئی چیز کو دوبارہ حاصل کر لو گے۔ یہ قانون فطرت اس بات کا ضامن ہے کہ ہر ناکامی میں کامیابی کا پہلو لٹکائے ہر زوال کے اندر وہ اسباب پیدا ہو جائیں جو قوم کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے والے ہوں۔

فطرت کی رہنمائی

اب اس قانون کی روشنی میں تاریخ کے مذکورہ دونوں واقعہ کو دیکھئے۔ ہر واقعہ میں آپ کو فطرت کا یہی قانون کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔

مثال کے طور پر اہل اسلام کی ابتدائی تاریخ میں کیا ہوا۔ مکہ میں یہ صورتحال پیش آئی کہ اہل شرک ان کے ظالم بن گئے اور اہل اسلام ان کے مقابلہ میں مظلومیت کی مد پر پہنچ گئے۔ اس کا سبب بنیادی طور پر اہل اسلام کی عددی قلت تھی۔ اس وقت مکہ کی آبادی کی اکثریت شرک پر عقیدہ رکھتی تھی۔ اسی طرح عرب کے تمام قبائل بھی مشرک تھے۔ اس بنا پر اہل مکہ کو ان کی حمایت حاصل رہتی تھی۔ اس عددی فرق نے اہل شرک کو یہ موقع دے دیا کہ وہ اہل توحید کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا سکیں۔

اہل اسلام نے اس وقت اپنی اس کمی کا اور اک کیا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ مکہ میں بے فائدہ طور پر اہل شرک سے ٹکراؤ کرتے رہیں۔ اس کے بجائے انھوں نے ہجرت کا طریقہ اختیار کر لیا، تاکہ ایک نئے مقام پر جا کر وہاں اپنا دعوتی مرکز بنائیں اور اس طرح عددی افسانہ کے لئے اپنے منصوبہ کو زیر عمل لانے کی کوشش کریں۔

یہ دعوتی عمل خاموشی کے ساتھ دس برس تک جاری رہا جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دس سال کی مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ عرب میں عددی تناسب بدل گیا۔ اہل شرک اقلیت بن گئے اور اہل اسلام نے ملک میں اکثریتی طبقہ کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس

کے بعد کوئی چیز نہیں تھی جو اہل اسلام کو فتح و غلبہ تک پہنچنے سے روک سکے۔

” اذن اللہ کے تمت پیش آنے والے اس معاملہ کو قرآن میں آخری دور کی ایک سورہ میں ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے: اذا جاء نصر الله والفتح۔ ورايت الناس يبدخلون في دين الله افواجا (جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح۔ اور تم دیکھو کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں)

اسی طرح صلیبی جنگوں کے بعد یورپی قوموں کے معاملہ کو لپیٹے۔ ان جنگوں میں کامل شکست کے بعد یورپی قوموں کے مدبرین نے غور کیا کہ ہماری اس ذلت آمیز شکست کا سبب کیا ہے۔ وہ اس رائے پر پہنچے کہ مسلمان علم کے میدان میں ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ہمارے پاس صرف تلو اور ہتھیار اور ان کے پاس تلوار اور علم دونوں ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے پچھڑے پن کو مانتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جب تک ہم اس نابرابری کو ختم نہ کریں، ہم مسلمانوں کے مقابلہ میں جیت نہیں سکتے۔

اس کے بعد مغربی قوموں نے جنگ اور مقابلہ کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ پوری سرگرمی کے ساتھ علم کے حصول میں لگ گئے۔ یہ کوشش کئی سو سال تک مسلسل جاری رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے نہ صرف اپنے زمانے کے تمام علوم کو سیکھا بلکہ خود علم کو ایک نئے دور ترقی میں پہنچا دیا، انہوں نے تاریخ میں پہلی بار طاقت کے معیار کو بدل دیا۔

اُس زمانہ میں لوگوں کے پاس جو علم تھا وہ صرف روایتی علم تھا۔ یورپی قوموں نے علم کے قافلہ کو روایتی دور سے آگے بڑھا کر سائنس و فنون کے دور میں پہنچا دیا۔ انہوں نے دستکاری کی صنعت کو شینت صنعت میں تبدیل کر دیا۔ فطرت کی دنیا میں جو خزانے اربوں سال سے چھپے ہوئے تھے ان کو انہوں نے نکال کر انہیں انسانی خدمت میں لگا دیا، وغیرہ۔

مسیحی قوموں نے جب ایسا کیا تو نہ صرف ان کی کمزوریوں کی تلافی ہوئی بلکہ ان کے ان صحت بخش کارناموں نے ان کو سارے عالم انسانی کا ہیرو بنا دیا۔

شاہراہ سے انحراف

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ قوموں کی تاریخ میں عام طور پر یہ ملتا ہے کہ جب انہیں کسی کے مقابلہ میں شکست پیش آتی ہے تو ان کی فطرت رہنمائی کرتی ہے۔ شکست کے جلد ہی بعد ان

کے اندر اپنی کمیوں کی تلافی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ قوم اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کر لیتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں فرانس، جرمنی، جاپان وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ یہ تو میں دوسری عالمی جنگ میں بردہ ہو گئی تھیں۔ مگر ہنگ کے فوراً بعد ان کے اندر تلافی کا عمل جاری ہو گیا۔ آج یہ قومیں پہلے سے بجز زیادہ طاقت و حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔

لیکن مسلمانوں کا معاملہ استثنائی طور پر اس سے الگ ہے۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں شکست سے دوچار ہوئے۔ مگر کئی سو سال کی مدت گزر گئی اور اب تک ان کے اندر قومی پیمانہ پر تلافی یافتہ عمل جاری نہ ہو سکا۔ اس کا واحد سبب غلط رہنمائی ہے۔ مسلم رہنماؤں نے اپنی غلط رہنمائی سے مسلمانوں کے ذہن کو اس طرح بگاڑا کہ وہ اس قابل نہ رہے کہ فطرت کی آواز کو سنیں اور اس کی پیروی میں اپنی تعمیر نو کا کام انجام دیں۔

ایک علامتی واقعہ

مولانا حسین احمد مدنی (۱۹۵۷-۱۸۷۹) نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بتایا ہے کہ علماء دیوبند میں ایک ممتاز عالم مولانا شیخ محمد صاحب تھے۔ مولانا کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کو ناہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں:

اس موضوع پر غور و فکر کے لئے دیوبند میں اکابر علماء کا ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر مولانا قاسم نانوتوی نے نہایت ادب کے ساتھ مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت، کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر چہاؤ کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلام اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروساں ہیں۔ مولانا نانوتوی نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوہ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد نے سکوت فرمایا (نقش حیات، جلد دوم، ۱۹۵۴، صفحہ ۴۰)۔

اس کے بعد علماء اور عوام کی ایک جماعت جہاد کے لئے نکلی۔ مشائی (سہارن پور) کے میدان میں انگریزی فوج سے اس کا مقابلہ ہوا۔ مسلم جہادین کے پاس زیادہ تر تلوار اور بھالے تھے اور انگریزوں کے پاس بندوق اور توپ۔ چنانچہ بدترین شکست ہوئی۔ کچھ لوگ مارے گئے، کچھ لوگوں کو انگریزوں

نے اپنا قیدی بنالیا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: سوانح قاسم، از مولانا مناظر احسن گیلانی)

یہ واقعہ علامتی طور پر بہت آتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جب غیر قوموں نے مسلمانوں کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا تو اس کے بعد وہ کون سا حادثہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کی جدید تاریخ کو مسلسل بربادی کی تاریخ بنا دیا۔ وہ دراصل اذن اللہ (قانون فطرت) سے انحراف تھا۔

مذکورہ واقعہ میں مولانا شیخ محمد صاحب گویا فطرت کے ترجمان تھے۔ ان کا شعور یہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت اصل مسئلہ طاقت کی نابرابری کا ہے۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے اس نابرابری کو ختم کرنا چاہئے۔ اس نابرابری کو دور کرنے کی لڑائی لازماً صرف خود کشی ہے۔ مگر دوسرے ملاد و عمل کے جذبات سے منقلب ہو کر اس ضروری پہلو کو بھول گئے۔ وہ جوش میں آکر صرف جنگی اقدام کی باتیں کرنے لگے۔ اس ماحول میں مولانا شیخ محمد صاحب برسرِ حق ہونے کے باوجود اکیلے رہ گئے۔ چنانچہ مدت کا تانہ، غلط رہنمائی کے نتیجے میں فطرت کی شاہراہ کو چھوڑ کر بے فائدہ ٹکراؤ کی اندھی راہوں میں چل پڑا۔ اس کے بعد اس نے قرآنی کی مثالیں تو ضرورتاً لیں، مگر وہ قوم کی تعمیر جدید اور اس کے از سر نو غلبہ کی مثال قائم نہ کر سکے

تجسید موت

یہاں مسلمانوں کے سلسلہ میں ایک اور عجیب تر اشتنا د سامنے آیا ہے۔ اور وہ ہے مسلسل ہلاکت کے بعد بھی کوئی سبق نہ لینا۔ دوسری قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ابتدائی رد عمل کے وقت اگر انہوں نے غیر مساوی فریق کے ساتھ جنگ کر لی اور اس کے نتیجے میں ہلاکت پیش آئی تو قوم فوراً سنبھل گئی۔ اس نے مزید بے فائدہ ٹکراؤ جاری نہیں رکھا۔ مثال کے طور پر ۱۸۵۰ میں جاپان کا امریکہ سے ابتدائی ٹکراؤ کے بعد حصولِ علم میں لگ جانا۔ مگر مسلمان حیرت انگیز طور پر یہ نمونہ پیش کر رہے ہیں کہ وہ ناقابلِ بیان ہلاکتوں کے باوجود اپنے رویہ پر نظر ثانی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایک ایسا عقیدہ ہے جو دوسری کسی قوم کو حاصل نہیں۔ یہ عقیدہ "شہادت" کا تصور ہے۔ مسلمان کے لئے اپنے عقیدہ کی رو سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر ہلاکت کو شہادت بنا کر اس کو اپنے کارنامہ کے خزانہ میں ڈال سکے۔

موجودہ دور کے مسلم رہنماؤں نے اس عقیدہ کا مبالغہ آمیز حد تک بے جا استعمال کیا۔ وہ مسلمانوں کی ہر ہلاکت کو شہادت بنا کر اس کو گھوڑی فائی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ بذاتِ خود مر شے کو مقصودِ ملی

بنکر پیش کیا۔ مسلمانوں کی مجلسیں ہر طرف اس قسم کے پر جوش ترانوں سے گونج اٹھیں :

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن ذمال غنیمت ذکورشور کشائی

نامساوی ٹکراؤ کے بعد مسلمانوں کو جس یک طرفہ ہلاکت کا تجربہ ہوا، اس کے بعد یہ بالکل فطری تھا کہ لوگوں کے اندر نئی سوجھ بیدار ہو۔ وہ بے فائدہ تصادم کو چھوڑ کر اپنی مثبت تعمیر میں لگ جائیں۔ مگرموت کو شہادت بنا کر اس کا جو مبالغہ آمیز گوری ٹیکیشن (glorification) کیا گیا اس نے مسلمانوں سے یہ ذہن پھین لیا کہ وہ اپنی تباہی کو تباہی سمجھیں اور اس سے سبق لے کر از سر نو اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔

ملت کا قائلہ جو فطرت کی صراط مستقیم سے ہٹ کر تباہی کے راستوں پر چل پڑا تھا وہ بدستور اس پر چلتا رہا۔ اور آج تک اسی رخ پر چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنے بچے سے ہوئے ذہن کی بنا پر وہ اپنے اس عمل کو مجاہدانہ قربانی سمجھ رہا ہے نہ کہ امحاء ہلاکت۔

ہیروانہ کردار

نفیسات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان جب کسی سخت حادثہ سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں سخت ہیجان برپا ہوتا ہے۔ علماء نفیسات کے الفاظ میں، اس کے اندر ایک قسم کے دماغی طوفان (brainstorming) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت عام انسان ایک غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔ ایک غیر معروف آدمی ہیرو اور کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کی جدید تاریخ میں یہ واقعہ عملاً پیش آچکا ہے۔ مغربی قوموں نے جب مسلمانوں سے ان کا سیاسی اقتدار چھینا اور ان کی تہذیبی عظمت کو پامال کیا تو لاکھوں مسلمانوں کے اندر وہی کیفیت شدت کے ساتھ پیدا ہو گئی جس کو نفیسات میں دماغی طوفان کہا جاتا ہے۔ ان میں کا ایک ایک شخص ہیرو کے روپ میں ابھر آیا اور انہوں نے جنگ کے میدان میں غیر معمولی ہسار درمی دکھائی۔

سلطان ٹیپو ۱۷۹۹ء میں تنہا برٹش سلطنت سے ٹکرا گئے۔ حالانکہ اس وقت یہ ٹکرائنا ایسا ہی تھا جیسے جیونٹی کا ہاتھی سے ٹکرائنا۔ سید احمد بریلوی کا فائدہ ۱۸۳۱ء میں ہمارا جرنیت سنگھ کی فوجوں سے بے باکانہ طور پر لڑ گیا۔ حالانکہ ہمارا جرنیت کے پاس مقابلہ بہت زیادہ طاقت و فوج تھی، اور اس کی فوج کو ٹیپو کے فوجی افسروں نے تربیت دی تھی۔ علامہ ہند کی جماعت نے ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی

کی منظم فوج سے نہایت دلیرانہ جنگ کی۔ حالانکہ علماء کے پاس زیادہ تر تلواریں تھیں، اور انگریزوں کے پاس پورا توپ خانہ موجود تھا۔ وغیرہ، وغیرہ

مغزلی مسیخ پیش آنے کے بعد مسلمانوں کے اندر ایک شدید قسم کا "دماغی طوفان" اٹھا تھا۔ فطرت کے قانون نے اس وقت مسلمانوں کو بے پناہ بنا دیا تھا۔ یہ بلاشبہ ملت کا عظیم ترین سرمایہ تھا جو بیروانہ کردار ادا کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ مگر ہمارے رہنماؤں نے اس جذبہ کو غلط رخ پر ڈال دیا۔ اگر بروقت صبح رہنمائی دی جاتی اور اس طوفانی جوش کو فادری ٹکراؤ کے بہانے اندرونی تعمیر کے محاذ پر لگایا جاتا تو یقینی طور پر آج ملت مسلمہ کی تاریخ دوسری ہوتی۔

ضرورت تھی کہ اس وقت مسلمانوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ تمہارا مسئلہ حقیقتہً داخلی کمی کا مسئلہ ہے نہ کہ خارجی جارحیت کا مسئلہ۔ آج زمانہ سائنسی طاقت کے دور میں پہنچ گیا ہے اور تم ابھی تک روایتی طاقت کے دور میں ہی رہے ہو۔ اس لئے تم کو چاہئے کہ جھراؤ سے اعراض کرتے ہوئے اپنی کمزوریوں کو دور کرو۔ اگر تم نے جدید تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو تیار کر لیا تو اس کے بعد اپنے آپ وہ وقت آئے گا کہ تم دوبارہ غالب حیثیت حاصل کر لو گے۔

اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو مسلمانوں کے ابھرے ہوئے جذبات علم کے حصول اور ترقیاتی نشانیوں کی تکمیل میں لگ جاتے۔ جو بیروانہ کردار جنگ کے میدان میں ضائع ہو گیا وہ تعمیر و استحکام کے محاذ پر استعمال ہوتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو بھٹکا دیا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں دوبارہ صبح رہنمائی دے کر انہیں ترقی اور کامیابی کی منزل کی طرف سرگرم سفر کیا جاسکتا ہے۔

اعداد قوت نہ کہ استعمال قوت

قرآن کا ایک حکم وہ ہے جو قاتلوا (التہو ۱۹۰) کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔ یعنی اے مسلمانو، جنگ کرو۔ قرآن کا دوسرا حکم وہ ہے جو مسلمانوں کو اعداد قوت (الانفال ۶۰) کی تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے مسلمانو، قوت فراہم کرو۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان قاتلوا کے حکم کے مخاطب نہ تھے۔ کیوں کہ ان کے اندر وہ شرطیں موجود ہی نہ تھیں جو قتال کے عمل کے لئے ضروری ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ عملی حالت کے ساتھ جنگ کرنا ان کے لئے صرف خودکشی کرنے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسلمانوں نے اپنے مفروضہ دشمنوں سے

ہزاروں بار ٹکراؤ گیا، اور ہر ٹکراؤ ایک طرف طور پر مسلمانوں کی کامل بربادی پر ختم ہوا۔
 مسلمان موجودہ زمانہ میں اعداد و قوت کے حکم قرآنی کے مطابق تھے۔ یعنی فریق ثانی کے مقابلہ میں
 اپنی کیوں کو جاننا اور ان کیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا جہاد اعداد و قوت
 تھا نہ کہ استقامت قوت۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے رہنماؤں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ ناقابل فہم نادانی
 کے تحت وہ مسلمانوں کو جوش دلا کر انہیں ان کے حریفوں سے ٹکراتے رہے۔ انہوں نے اپنے عمل کا آغاز
 ”بانگ درا“ سے کیا نہ کہ خاموشن تیار سے۔ اس قسم کی نادانی کا آخری نتیجہ بربادی تھا۔ اور وہی اپنی
 کامل ترین صورت میں مسلمانوں کے حصہ میں آیا۔

کرنے کا کام

ملت کے احیاء کے لئے اس وقت کرنے کا کام صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ملت کے افراد
 میں اس فطری عمل کے جاری ہونے کے مواقع پیدا کئے جائیں جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ فطرت
 خود سب سے بہتر رہنما ہے۔ اگر بیرونی رہنما بھٹکانے کا کام نہ کریں تو اندرونی فطرت اپنے آپ لوگوں کی
 رہنما بن جائے گی۔ وہ وہی کریں گے جو انہیں کرنا چاہئے، اور وہ نہیں کریں گے جو ان کو نہیں کرنا چاہئے۔
 اس وقت ملت کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ وہ تعلیم یافتہ بنے۔ اس کے شعور کی صلاحیت کو ابھارا جائے۔
 اس کے اندر حقیقت پسندانہ فکر پیدا کیا جائے۔ ناممکن چٹانوں سے سڑنمکانے کے بجائے اس کو مسکن
 میدانوں میں سرگرم عمل کیا جائے۔ خوش خیالیوں میں جینے کے بجائے لوگوں کو حقائق میں جینے والا بنایا
 جائے۔ جو لوگ آج سماج کا احتجاجی گروپ (protestant group) بنے ہوئے ہیں، ان کو اٹھ کر
 سماج کا تخلیقی گروپ (creative group) بنا دیا جائے۔

تعمیر خویش کا یہ عمل صرف پر امن حالات میں جاری ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ یہ بھی لازمی طور
 پر ضروری ہے کہ جنگ اور محاربت سے آخری حد تک پرہیز کیا جائے۔ اشتعال انگیزی پر مشتمل ہونے کا طریقہ
 مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ ناخوشگوار باتوں کے متعلق شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ ان سے الجھنا نہیں ہے
 بلکہ ان سے اعراض کرنا ہے۔ اختلافی امور میں رد عمل کے بجائے صبر کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

ایک کام کو کرنے کے لئے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر آپ چھوڑنے والے کام کو نہ چھوڑیں تو آپ
 کرنے والے کام کو بھی انجام نہیں دے سکتے۔

عمل کا رخ

سوچنے کا عمل (thought process) سب سے بڑا عمل ہے جو انسان کی شخصیت کے اندر واقع ہوتا ہے۔ تمام اعمال اسی سوچ کے تحت انجام پاتے ہیں۔ قدیم فلاسفہ بھی متفرق طور پر اس انسانی ظاہرہ پر اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس موضوع پر مستقل تحقیقات ہوئی ہیں اور بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں :

Stuart Hamshire, *Thought and Action*, 1959

Myles Brand, *The Nature of Human Action*, 1970

D. Rapaport, *Toward a Theory of Thinking*, 1951

W.E. Vinacke, *The Psychology of Thinking*, 1952

D.M. Johnson, *The Psychology of Thought and Judgement*, 1955

F.C. Bartlett, *Thinking*, 1958

Max Wertheimer, *Productive Thinking*, 1959

H. Bergson, *The Creative Mind*, 1946

N. Berdyaev, *The Meaning of the Creative Act*, 1955

Arthur Koestler, *The Act of Creation*, 1964.

سوچنے کا یہ عمل عام حالات میں بھی انسان کے دماغ میں برابر جاری رہتا ہے۔ مگر جب انسان کسی اندرونی یا بیرونی حادثہ سے دوچار ہوتا ہے تو یہ عمل بے پناہ حد تک بڑھ جاتا ہے۔ اس وقت آدمی کے اندر ایک سخت ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو علم انفسیات دماغی طوفان (brainstorming) کا نام دیتے ہیں۔

اس فکری رجحان کے وقت آدمی ایسی باتیں سوچتا ہے جن کو وہ عام حالات میں نہیں سوچ سکتا، وہ ایسے کام کو گزرتا ہے جن کو وہ عام حالات میں نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے چیلنج جب آتے ہیں تو وہ آدمی کو بیروہ بنا دیتے ہیں۔ وہ اس کی دماغی قوتوں کو اس طرح جگا دیتے ہیں کہ عام حالات میں اگر اس کا ذہن صرف حل (solution) تک پہنچ سکتا تھا تو اب وہ برتر حل (superior solution) تک پہنچ جاتا ہے (18/357)

یہی مشکل حالات آدمی کے اندر وہ انتہائی قیمتی چیز پیدا کرتے ہیں جس کو تخلیقی فکر (creative thinking) کہا جاتا ہے۔ عام حالات میں آدمی کا ذہن صرف معمولی کی باتیں سوچ پاتا ہے۔ غیر معمولی حالات میں آدمی کا ذہن غیر معمولی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ اور جب تک یہ غیر معمولی سوچ

نہ ابھرے کوئی آدمی کبھی تخلیقی معنہ نہ بن سکتا۔

کسی فرد یا کسی قوم کی زندگی میں جب اس قسم کے سنگین لمحات آتے ہیں تو یہ اس فرد یا قوم کے لیے بے حد نازک وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا تجربہ اس کو بیک وقت دو انتہائی امکانات کے کنارے کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ وہ فیصلہ کن وقت ہوتا ہے جب کہ یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت کا موازنہ سیلاب کون سا رخ اختیار کرے۔ تعمیر کا رخ، یا تخریب کا رخ۔ جذباتی رجحان کو اگر تعمیر کی سمت میں موڑ دیا جائے تو قوم ترقی کرے گی۔ اور اگر ان جذبات کو تخریب کی سمت میں موڑ دیا جائے تو پوری قوم تباہ ہو کر رہ جائے گی۔

جاپان کی مثال

انیسویں صدی کے وسط تک جاپان بند ملک کی حیثیت رکھتا تھا۔ صرف ندر لینڈ ایک ایسا ملک تھا جس سے جاپان کے تجارتی تعلقات تھے۔ امریکہ اور برطانیہ اور فرانس نے جاپان کو ایک کھلا ملک بنائیں اور وہاں داخل ہو کر تجارت کریں۔ مگر جاپان کی حکومت اس کے لیے راضی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد برطانیہ اور فرانس اور امریکہ نے اپنے جنگی جہاز (warships) جاپان کے ساحل پر پہنچا دیے۔ یہ جہاز اسٹیم انجن سے چلتے تھے۔ مگر جاپان ابھی تک اسٹیم پاور کو اختیار نہ کر سکا تھا۔ اس وقت جاپان کے پاس دستی ہتھیار تھے اور مغربی قوموں کے پاس دور مار ہتھیار۔ چنانچہ جاپان نے ابتدائی ٹکراؤ کے بعد ہی جان لیا کہ جنگ میں ہم ان قوموں سے جیت نہیں سکتے۔

حکومت جاپان نے جلد ہی ٹکراؤ کو ختم کر دیا۔ جاپانی مفکرین نے اپنی قوم کے ابھرتے ہوئے جذبات کو انتہا پسندی کے بجائے حقیقت پسندی کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اہل مغرب کی ہندوؤں کے مقابلہ میں ہماری تلواریں کارآمد نہیں ہیں۔ ہماری چوہوں سے چلنے والی کشتیاں ان کے اسٹیم انجن سے چلنے والے جہازوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان بیرونی قوموں کو فوجی طاقت میں فیصلہ کن برتری حاصل ہے۔ ان پر واضح ہو گیا کہ بیرونی قوموں کو طاقت کے ذریعہ بھگانا ناممکن نہیں (EB-10/78)

پہلے ہی تجربہ میں جاپانی رہنماؤں نے اعتراف کر لیا کہ ان کے اور مغرب کے درمیان ایک فیصلہ کن فرق واقع ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ جاپان جسمانی طاقت کے دور میں ہے، اور مغربی قومیں

دماغی طاقت کے دور میں پہنچ گئی ہیں۔ اس لیے پہلا کام اس فرق کو ختم کرنا ہے نہ کہ بے فائدہ طور پر مغربی قوموں سے ٹکراؤ کرنا۔ اس کے بعد انھوں نے مغربی قوموں سے ٹکراؤ کو ختم کرنے کے لیے جاپان کے دروازے کھول دیے۔

اس تجربہ کے بعد جاپانیوں میں شدید جذبات ابھرے تھے۔ مگر ان کے رہنماؤں نے ان جذبات کو صحیح رخ دیا۔ انھوں نے ٹکراؤ کے میدان سے ہٹ کر علم کے میدان میں اپنی محنت شروع کر دی۔ اس کے بعد ان کے یہاں تبدیلی کا وہ دور آیا جس کو میجی رستوریشن (Meiji restoration) کہا جاتا ہے۔ ٹکراؤ کے میدان سے ہٹنے کا نتیجہ ہوا کہ جاپان کی سائنسی اور صنعتی ترقی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ جدید ٹکنالوجی کے دور میں پہنچ گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت دوبارہ یہی صورت حال پیدا ہوئی۔ جاپان نے ابتداءً امریکہ اور اس کے مغربی ملیفوں سے ٹکری۔ مگر ۱۹۴۵ء میں جب امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم گرائے تو دوبارہ جاپانیوں نے یہ جانا کہ وہ اگرچہ ٹکنالوجی کے دور میں داخل ہو گئے ہیں، مگر امریکہ سپر ٹکنالوجی کے دور میں پہنچ چکا ہے۔ جاپانی رہنماؤں نے دوبارہ اپنی قوم کے ابھرتے ہوئے جذبات کو تعمیری رخ دیا۔ انھوں نے بے فائدہ جنگ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا اور از سر نو سائنس کے میدان میں ترقی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ جاپان ایک صنعتی دیو (industrial giant) بن کر دنیا کے نقشہ پر چھا گیا۔

مسلمان دور جدید میں

انیسویں اور بیسویں صدی کے مسلمان کم از کم دو بار اس قسم کے شدید حالات سے گزرے جبکہ ان کے اندر شخصی اور قومی سطح پر دماغی طوفان کی مذکورہ بالا کیفیت پیدا ہوئی۔ اب اہم ترین مزورت تھی کہ ان کو بروقت صحیح رہنمائی ملے۔ مگر دونوں بار مسلم رہنماؤں نے ناقابل فہم حد تک غلط رہنمائی دی۔ اس وقت اصل کام یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر اٹھتے ہوئے فکری طوفان کو تعمیری طرف موڑ دیا جائے۔ مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ تمام مسلم رہنماؤں نے انتہائی نادانی کے تحت مسلمانوں کے جذبات کو تخریب کی طرف موڑ دیا۔

اس غلط رہنمائی کا یہ نتیجہ ہے کہ دو سو سال کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود مسلم ملت کے حصہ میں تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور نہیں آیا۔

۳۱ جولائی ۱۹۸۸ کو کشمیر میں جو مسلح تحریک شروع ہوئی وہ بھی اسی فظور رہنمائی کی ایک تازہ مثال ہے۔ کشمیر کے نوجوانوں کے اندر ان کے حالات کے نتیجہ میں ”دماغی طوفان“ برپا ہوا تھا۔ اندر اور باہر کے کچھ نادان رہنماؤں نے اس دماغی طوفان کو تخریب کی طرف موڑ دیا۔ اس کے نتیجہ میں کشمیر نے پایا تو کچھ نہیں۔ البتہ اس کے تمام بہترین امکانات ناقابل تلافی مد تک برباد ہو کر رہ گئے۔

کشمیر کے نوجوانوں کے اندر ان کے حالات کے نتیجہ میں جو دماغی طوفان ابھرا تھا اس کو اگر حقیقی معنوں میں تعمیر کی طرف موڑ دیا جاتا تو ان کا سارا جوش مثبت تیاریوں میں استعمال ہونے لگتا۔ وہ کشمیر کی قدرتی حسن کی دنیا میں انسانی ترقیوں کا ایک چمنستان آگاتے۔ اور پھر کشمیر میں تعمیری انقلاب کی ایک ایسی دنیا ابھرتی جو اس کو حقیقی معنوں میں برصغیر ہند کا تاج بنا دیتی۔

اسلام ایک ابدی مذہب ہے۔ اس میں ہر قسم کے حالات کے لیے رہنمائی موجود ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ میں واضح رہنمائی موجود تھی۔ مگر موجودہ مسلم قائدین کا المیہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کو اپنے لیے فخر تو بنایا، مگر وہ اس کو اپنے لیے رہنمائی نہ بنا سکے۔ اور جب دین کو سامان فخر بنا لیا جائے تو وہ سامان ہدایت کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھودیتا ہے۔ قدیم مکہ میں جب رسول اور اصحاب رسول نے توحید کی دعوت دی تو اہل مکہ کی طرف سے شدید ترین مزاحمت کی جانے لگی۔ اہل مکہ کی زیادتیوں اور اشتعال انگیز کارروائیوں نے اہل اسلام کے اندر ”دماغی طوفان“ کی حالت پیدا کر دی۔ اپنے ابتدائی تاثر کے تحت وہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فکری رسواں کو تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف موڑ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم سب لوگ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جاؤ اور اس کو اسلامی مرکز بن کر وہاں اپنا دعوتی کام کرو۔

حدیبیہ کے موقع پر بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ اہل مکہ کی ضد اور اشتعال انگیزی کے نتیجہ میں دوبارہ صحابہ کے اندر ”دماغی طوفان“ اٹھا۔ اس کے زیر اثر وہ اہل مکہ سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ ان کے جذبات کو تخریب سے تعمیر کی طرف موڑ دیا، صحابہ کے جوش و خروش کو جنگ کے بجائے دعوت کے میدان میں مصروف عمل کر دیا۔

اللہ کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ اس نے مشکلات کو ہمارے لیے مزید ترقی کا زینہ بنا دیا۔ اس نے

اپنی قدرت خاص سے ہمارے نہیں کو ہمارے ہے میں تبدیل کر دیا۔

چیلنج کا جواب

انگریز مورخ ٹوائسن بی (Arnold Toynbee) نے عالمی تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد اپنی مشہور کتاب مطالعہ تاریخ (A Study of History) لکھی جو ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ٹوائسن بی کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ چیلنج اور اس کا جواب (Challenge-response) میکانزم وہ چیز ہے جو قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔

ٹوائسن بی کے مطابق، خارجی چیلنج ہی وہ لازمی عمل ہے جو افراد یا قوموں کے امکانات کو جگا دیتا ہے۔ تہذیب کا ابتدائی اور بنیادی مرحلہ ماحول کے ایسے چیلنج سے ظہور میں آتا ہے جو نہ اتنا سست ہو کہ ترقی کو روک دے، نہ اتنا موافق ہو کہ وہ تخلیقیت کو معطل کر دے۔ قوم کی ایک تخلیقی اقلیت اس چیلنج کا جواب دیتی ہے اور قوم کے لئے رہنمائی فراہم کرتی ہے:

The initial stage of a civilization is its growth, brought about by an environmental challenge, neither too severe to stifle progress nor too favourable to inhibit creativity, which finds a response among a creative minority that provides leadership to the passive majority. (X/76)

اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی مصیبتیں (troubles) لوگوں کی صلاحیتوں کو جگاتی ہیں بشرطیکہ وہ اتنی زیادہ نہ ہوں کہ آدمی اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔ اس اعتبار سے دیکھنے تو مومن سب سے زیادہ تخلیقی انسان ثابت ہو سکتا ہے، کیوں کہ مومن کے اندر رہنے اور تاب لانے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

عام انسان صرف اپنے آپ میں عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ صرف اپنی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے دوسری طرف مومن کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ خدا کے برتر میں عقیدہ رکھتا ہے اور خدا کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ انسان کی قوتیں محدود ہیں، خدا کی قوتیں لامحدود۔ اس بنا پر عام انسان کے لئے کسی نہ کسی مقام پر حد آجاتی ہے۔ جب کہ مومن کے لئے کبھی حد نہیں آتی۔ جہاں

مومن کی اپنی حد ختم ہو جائے ، وہاں اس کا خدا اس کی کمی کی تلافی کے لئے موجود ہوتا ہے۔
 مومن دوسروں کے مقابلہ میں مصیبت اور مشکلات کو زیادہ برداشت کر سکتا ہے۔ اس
 لئے وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ تخلیقی ثابت ہوتا ہے۔

مصیبتیں کیوں آدمی کو تخلیقی بناتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصیبتیں انسان کے دماغ کے
 اجزاء (particles) کو جگاتی ہیں۔ وہ اس کی خواہش پیدا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے
 کہ جب آدمی کے اوپر مشکلات آتی ہیں تو اس کی سوچنے اور کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ
 بڑھ جاتی ہے۔

اس واقعے کے پیش نظر یہ کہنا صحیح ہے کہ عام انسان کے دماغ کے اجزاء صرف محدود طور
 پر جاتے ہیں۔ جب کہ مومن کے دماغ کے اجزاء لامحدود طور پر جاگ اٹھتے ہیں۔ عام انسان کی تخلیقیت
 کی ایک حد ہے ، مگر مومن کی تخلیقیت کی کوئی حد نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے (الطلاق ۳)
 ارشاد ہوا ہے کہ تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو (المائدہ ۳) اسی طرح فرمایا گیا ہے کہ اے
 ایمان والو ، اللہ سے ڈرو ، اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا (الاحزاب ۴۰-۴۱)

اس قسم کی آیتوں کا مطالعہ کیجئے ، اور پھر فطرت کے مذکورہ قانون کو سامنے رکھئے تو
 اس سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ اہل ایمان پر جب بھی مشکلات و مصائب کا لمحہ آئے تو اس
 وقت جو ضروری کام کرنا ہے وہ یہ کہ ان کے اندر اعتماد علی اللہ کی کیفیت کو ابھارا جائے۔ اللہ
 پر توکل اور اعتماد ان کے اندر برداشت کا مادہ پیدا کرے گا۔ اور جن لوگوں کے اندر سہانے
 اور برداشت کرنے کی صفت ابھر آئے وہ مشکلات کے وقت ہیرو بن جاتے ہیں۔ وہ مشکلات
 کو اپنے لئے نفسیاتی مائیک بنا لیتے ہیں۔

اس دنیا میں مشکل کا پیش آنا بذات خود کوئی مسئلہ نہیں ، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مشکل پیش
 آنے کے وقت آدمی اس کو سہانے کی طاقت کو دے۔ اس لئے مشکل پیش آنے کے وقت شکایت
 اور احتجاج میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ یہ کوشش کرنا چاہئے کہ آدمی کے اندر سہانے
 اور برداشت کرنے کی طاقت جاگ اٹھے۔ مشکل کے وقت آدمی اگر پست بہت ہونے سے بچ

جائے تو اس کے بعد اس کا ذہن مزید طاقت کے ساتھ متحرک ہو کر اپنے آپ مسئلہ کو حل کرنے لگا۔

عصر کے ساتھ لیسر

ایک بار کا واقعہ ہے۔ میں مسلمانوں کے ایک اجتماع میں شریک ہوا۔ یہ اجتماع شہر کے ایک شاندار ہال میں کیا گیا تھا۔ بے ریش اور باریش مسلمانوں سے ہال کی کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ اجتماع کا پروگرام قرأت سے شروع ہونے والا تھا۔ مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ کوئی قساری یا حافظ اجتماع میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ کالج کے ایک استاد اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے پارہ عم سے دو سورتیں سادہ طور پر پڑھ کر سنائیں۔ سورہ والضحیٰ اور سورہ الم نشرح۔

اس ابتدائی کارروائی کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔ ایک کے بعد ایک لوگ اسٹیج پر آنا شروع ہوئے۔ لوگوں کی پرجوش تقریروں سے ہال گونجنے لگا۔ تمام تقریروں کا خلاصہ صرف ایک تھا — اسلام آج مخالفانہ سازشوں سے گھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے دشمن ان کو فنا کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو آج ہر طرف تعصب، ظلم، سازش اور عناد کا سامنا ہے۔ اسی قسم کی باتوں پر اجتماع شروع ہوا اور اسی قسم کی باتوں پر آخر کار وہ ختم ہو گیا۔

آخر میں میں مالک پر آیا۔ میں نے کہا کہ آپ حضرات نے افیاء کے خلاف تقریریں کی ہیں، مگر مجھے خود آپ کے خلاف بولنا ہے۔ آپ کو دوسروں سے شکایت ہے مجھے خود آپ سے شکایت ہے۔

آپ نے اپنے اجتماع اگرچہ قرآن کی تلاوت سے شروع کیا۔ مگر یہ تلاوت مضربکی تھی، بلکہ وہ قرآن کی نفی کے ہم معنی تھی۔ آپ لوگوں نے قرآن کو پڑھ کر قرآن کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

آپ نے اپنے اجتماع کے آغاز میں سورہ الم نشرح کی تلاوت کی۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے تکرار کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ مشکل کے ساتھ ہمیشہ آسانی ہوتی ہے، مشکل کے ساتھ ہمیشہ آسانی ہوتی ہے (فان مع العسر یسر، ان مع العسر یسر)

قرآن کی اس آیت کے مطابق لازماً ایسا ہونا چاہئے کہ موجودہ حالات میں اگر کچھ باتیں ہمارے خلاف ہوں، تو اسی کے ساتھ کچھ باتیں ہمارے موافق بھی ہوں۔ قرآن کے لفظوں میں، عسر کے ساتھ یسر بھی ہو۔ مگر آپ سب لوگوں نے صرف غیر موافق باتوں (عسر) کا اعلان کیا۔ آپ میں سے کسی نے موافق باتوں (یسر) کا انکشاف نہیں کیا۔ اس طرح آپ نے قرآن کے ایک جز کا تو خوب ذکر کیا، مگر قرآن کے دوسرے جز کو آپ نے یکسر حذف کر دیا۔

یہودی یا اور کوئی فرقہ اگر قرآن کا ایسا نسخہ چھاپے جس میں قرآن کی ایک آیت کو نکل دیا گیا ہو تو ساری دنیا کے مسلمان اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے سرگرم ہو جائیں گے۔ مگر خود مسلمان مسلمان ہی کام کر رہے ہیں۔ آج ہر جگہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ "عسر" کے واقعات کا خوب چرچا کرتے ہیں، مگر وہ "یسر" کے پہلوؤں کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ دوسرے لوگ اگر قرآن میں کمی بیشی کریں تو مسلمان اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر خود مسلمان ہی کام زیادہ بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں تو اس کا غلط ہونا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

لوگ قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں مگر وہ قرآن سے بے خبر ہیں۔ لوگ اپنے جلسوں کا آغاز قرآن سے کرتے ہیں، مگر وہ صرف رکی تیرک کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اس سے رہنمائی لینے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے چرچا کے باوجود قرآن کا فائدہ لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن بلاشبہ قوموں کو اٹھانے والی کتاب ہے۔ مگر قرآن کا یہ معجزہ اس قوم کے حق میں ظاہر ہوتا ہے جو قرآن کو اپنا رہنما بنائے نہ کہ ان لوگوں کے لئے جو قرآن کے الفاظ خوش الحانی کے ساتھ دہرائیں اور اس کے بعد اس کو بند کر کے حلق پر رکھ دیں۔

خیر امت

عام تصور یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم خیر امت کے مقام پر فائز ہیں۔ وہ تمام قوموں میں سب سے بہتر قوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی خیال کو مولانا الطاف حسین حالی نے ان لفظوں میں نظم کیا ہے:

وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا

مگر اس میں ایک غلط فہمی شامل ہے۔ خیر امت کا لفظ کوئی قومی لقب نہیں ہے، بلکہ وہ صفت کو بتاتا ہے۔ یعنی خیر امت مسلمانوں کا قومی یا نسلی امتیاز نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو لوگ یہ مطلوبہ صفات اپنے اندر پیدا کریں گے وہ اللہ کے نزدیک خیر امت قرار پائیں گے۔

عن قتادة عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خير امتي الذين اتبعوا ما آتاهم مني حتى ينزلون بهم الحجاره
خیر امت، انہ تلا هذه الآية ثم قال يا ايها الناس من سره ان يكون في الاممة التي اخرجت للناس فليؤد شرط الله فيها.

قتادہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق نے آیت اکتتم خیر امتہ، انہ تلا هذه الآية ثم قال يا ايها الناس من سره ان يكون في الاممة التي اخرجت للناس فليؤد شرط الله فيها.

(التفسير المقہری ۲ / ۱۱۸)

خیر امت کا مطلب

اب اس آیت پر غور یہ کیجئے جس میں خیر امت کا لفظ آیا ہے۔

کنتم خیر امتہ اخرجت للناس
تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر و تؤمنون بالله (آل عمران ۱۱۰)

تم بہترین گروہ ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

مفسر ابن کثیر نے خیر امت کی تشریح میں یہ الفاظ لکھے ہیں: یعنی خیر الناس للناس۔ والمعنی انکم خیر الامم وانفع الناس للناس (یعنی وہ لوگوں کے لئے سب لوگوں سے بہتر ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب امتوں میں بہتر ہیں اور لوگوں کے لئے سب سے زیادہ نافع ہیں) گویا وہ خیر امت اس لئے ہیں کہ وہ خیر یا نافعیت کی صفت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ وہ لوگوں

کے لئے بالفعل خیر بننے سے خیر امت بنے ہیں نہ کہ مجرد ایک نسلی گروہ میں شامل ہونے سے۔
 یہ الفاظ اب تداً اصحاب رسول کے لئے اترے۔ جب وہ اپنے عملی اوصاف کے اعتبار
 سے بطور واقعہ بہتر گروہ بن گئے تو ہجرت کے بعد اس واقعہ کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا کہ تم
 خیر امت ہو۔ اصحاب رسول کے بعد دوسرے اہل ایمان خیر امت میں شامل کئے جانے کے
 مستحق اس وقت ہوں گے جب کہ وہ عملی اعتبار سے ان اوصاف پر قائم ہو جائیں۔ اصحاب رسول خیر
 امت کا ماڈل ہیں۔ جو شخص خیر امت میں شامل ہونا چاہے وہ اس ماڈل کو اپنی زندگی میں اپنائے۔

منصب شہادت

آیت میں "خیر امت" کا منصب یہ بتایا گیا ہے کہ انھیں لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے
 (اخرجت للناس) یعنی اس کا ایک مشن ہے جس کو اسے تو ام عالم کے اوپر انہماک دینا ہے۔ یہ مقررہ مشن
 قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے جو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں آیا ہے:
 وكذالك جعلناكم امة وسطا لتكونوا
 شهداء على الناس ويكون الرسول
 عليكم شهيدا (البقرة ۱۴۳)
 گواہ ہو۔

امت وسط سے مراد امت عدل ہے۔ اس سے مراد تقریباً وہی ہے جس کے لئے دوسری جگہ
 خیر امت کا لفظ آیا ہے۔ دونوں لفظ ایک ہی حقیقت کے دو پہلوؤں کو بتاتے ہیں۔ یعنی یہ امت اپنے قول و عمل
 کے اعتبار سے عدل پر قائم ہوگی، اور چونکہ وہ عدل پر قائم ہوگی اس لئے وہ اہل عالم کے لئے سراپا خیر بن جائے گی۔
 شہادت (گواہی) سے مراد خدا کے بندوں کو خدا کی مرضی سے باخبر کرنا ہے۔ اسی باخبری پر
 قیامت میں لوگوں سے ان کے کارنامہ حیات کا حساب لیا جانے والا ہے۔ تمام انسان خدا کے آگے
 مسئول (جواب دہ) ہیں۔ مگر یہ مسؤلیت اسی وقت صبح ہو سکتی ہے جب انھیں اصل حقیقت سے
 باخبر کر دیا گیا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں شہادت (دعوت) کا نظام قائم کیا تاکہ اس کی بنیاد
 پر آخرت میں لوگوں سے ہائپر سس کیا جاسکے۔

دنیا میں شہادت دینے والے ہی آخرت کے شاہد ہیں (ق ۲۱) دنیا میں جو لوگ
 قوموں کو باخبر کرنے کی ذمہ داری ادا کریں گے، وہی قیامت کے دن خدا کی عدالت میں کھڑے ہو کر یہ

گواہی دیں گے کہ کس نے حق کے پیغام کو مانا اور وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے اس کا انکار کر دیا۔

یہی وہ خاص مقصد ہے جس کے لئے امت محمدی کا "اخراج" ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنے زمانے کے لوگوں پر شہادت کی ذمہ داری ادا فرمائی، اس طرح بعد کے تمام زمانوں میں آپ کی امت کو لوگوں کے اوپر شہادت کا فرض ادا کرنا ہے۔

شہادت کا خاص مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس تخلیقی منصوبہ سے باخبر کیا جائے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کر کے اس زمین پر آباد کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ابدی نسلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کے عرصہ حیات کا بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں رکھا اور بقیہ تمام حصہ موت کے بعد آنے والی کامل دنیا میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ انسان کے لئے موت سے پہلے کی زندگی آزمائش کی زندگی ہوگی اور موت کے بعد کی زندگی انجام پانے کی زندگی۔ موجودہ دنیا کے عمل کے مطابق، بعد کی دنیا میں کسی کو جنت میں جگہ ملے گی اور کسی کو جہنم میں۔

موت سے پہلے کی دنیا میں آدمی کو مکمل آزادی ہے۔ اسی آزادی کے معاملہ میں انسان کا امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون شخص اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون شخص اس کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جو شخص آزادی اور اختیار کے باوجود حق کے آگے جھک گیا، وہ امتحان میں پورا اترتا۔ اور جو شخص آزادی اور اختیار پا کر بیک گیا اور سرکشی کا طریقہ اختیار کیا وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ پہلے انسان کے لئے آخرت میں خدا کا انعام ہے اور دوسرے انسان کے لئے آخرت میں خدا کی سزا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ اور اس کی تمام ضروری تفصیلات قرآن اور حدیث میں بتا دی گئی ہیں۔ اہل اسلام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے گہرے مطالعے سے اس حقیقت کو سمجھیں اور اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ اس کو اقوام عالم تک پہنچائیں۔ پیغام رسانی کے اس عمل کا کامل نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں موجود ہے۔ اسی نمونہ کی پیروی کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ کام انجام دینا ہے، اس کے بعد ہی وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شہادت کا انعام پاسکے ہیں۔

امر بالمعروف، نہی عن المنکر

خیر امت کی بابت مذکورہ آیت میں کہا گیا ہے کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔ تَامُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، اس سے مراد داخلی نصیحت اور اندرونی احتساب کا وہ نظام ہے جو امت اپنے دائرہ کے اندر قائم کرتی ہے۔ امت کا ہر فرد نہ صرف اپنی ذات کی اصلاح کرتا ہے بلکہ وہ امت کے دوسرے لوگوں کے لئے ناصح اور نگران بن جاتا ہے، تاکہ امت برابر خیر کی حالت پر قائم رہے۔ افراد امت کی یہی اسپرٹ امت کو خیر امت بنانے رکھنے کی اصل ضمانت ہے۔ اس بات کو سورۃ کی دوسری آیت میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ
وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

اور تم میں سے ایک گروہ ہونا چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے اور مجھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

(آل عمران ۱۰۳)

اس آیت میں مسلمانوں کے اندر جس مطلب گروہ کی ضرورت بتائی گئی ہے وہ داخلی مسلمین کا گروہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم امت کو ایمانی کمزوری، داخلی انتشار اور باہمی بے انصافی سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں یہ مزاج موجود ہو کہ وہ ایک دوسرے کی کمزوریوں پر ٹوکیں۔ وہ ایک دوسرے کی اصلاح پر کمر بستہ رہیں۔ ہر آدمی یا کم از کم ایک گروہ، اپنے آپ کو دوسروں کا نگران سمجھے۔ اس کے بغیر مسلمان "خیر امت" کے مظلوم معیار پر باقی نہیں رہ سکتے۔ شہادت علی الناس اس امت کا منصبی مشن ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کا تربیتی نظام۔ شریعت میں جو احکام ہیں ان میں سے ہر حکم کے لیے الگ الگ الفاظ ہیں۔ کسی حکم کے لیے صلوة کا لفظ ہے اور کسی حکم کے لیے صوم کا۔ کسی حکم کے لیے زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اور کسی حکم کے لیے حج کا، وغیرہ۔ اسی طرح ایک حکم وہ ہے جس کے لیے قرآن و حدیث میں الامر بالمعروف و النہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مسلمان کے اوپر لازم ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے، طاقت ہو تو ہاتھ سے۔ ہاتھ سے نہ کر سکے تو زبان سے، اور زبان سے نہ کر سکے تو دل سے۔

یہ حکم دراصل مسلمانوں کی باہمی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے اوپر نگران بن جائے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس کا حق نہ دے تو قریب کے مسلمان اس پر زور ڈال کر اس کو حق دار کا حق دینے پر مجبور کریں۔ ایک مسلمان ظالماً زوروش اختیار کرے تو اس کے آس پاس جو مسلمان ہیں وہ سب مل کر اس کے پیچھے پڑ جائیں اور اس کو ظلم و ستم کا رویہ چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ کام اپنی استطاعت کے بقدر کرنا ہے۔ ہاتھ سے ممکن ہو تو ہاتھ سے، ورنہ زبان سے، اور زبان سے ممکن نہ ہو تو آخری درجہ یہ ہے کہ دل سے۔

اہل المعروف اور نہی عن المنکر کی اسی خاص نوعیت کی بنا پر قرآن میں اس کے لیے مشارکت کے صیغے آئے ہیں، یعنی ایسا صیغہ جس میں آپس میں ایک دوسرے کے اندر کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہو۔ مثلاً اَنتُمْ بِالْعُرُوفِ (وانتروا بینکم بمعروف، الطلاق ۶) اور تَنبِہُوا عَنِ الْمُنْكَرِ (کلانوا لایتنہون عن منکر فعلوک، المائدہ ۷۹)

مسلمانوں کی اصلاح معاشرہ کے لیے یہی اصل کام ہے جو مسلمانوں کو کرنا ہے۔ اس حکم کا مطلب یہ کہ مسلمان کے اندر اپنے بھائی کی مدد کرنے کا جذبہ موجود ہو۔ جہاں کوئی مسلمان حق کے خلاف چلتا ہوا نظر آئے فوراً اس علاقہ کے مسلمان ایسے مسلمان سے ملیں، وہ ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کریں۔ وہ ہر شخص کے معاملہ میں دخل دے کر اس کو حق پر قائم رہنے اور ناحق کو چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ حقیقت ایک سماجی کام ہے نہ کہ کوئی حکومتی کام۔

ایمان باللہ

آیت کے آخر میں فرمایا کہ تو مومنوں باللہ (تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو) یہ تمام مطلوب باتوں کی کلید اور اس کی بنیاد ہے۔ اللہ پر ایمان لانا تمام حقیقتوں کے اصل سرے کو پالینا ہے۔ اور جو آدمی حقیقت کے سرے کو پالے اس نے گویا سب کچھ پالیا۔ اسی سے ان اعمال کا صدور ہو سکتا ہے جو ایک صاحب ایمان کے اندر باعتبار میسر و مونا پنا ہے۔ بخاری و مسلم نے ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اقدرون ما الایمان باللہ وحدہ۔ قالوا اللہ ورسولہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ ایک اللہ پر ایمان رکھنا کیا ہے۔ لوگوں نے کہا

اعلم۔ قال شهادة ان لا اله الا الله
وان محمداً رسول الله واقام الصلاة
وايتاء الزكاة وصيام رمضان وان
تعطوا من المغنم الخمس
(التقريب المظہری ۲ / ۱۳۰)

کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ
نے فرمایا کہ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا
کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں
اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور رمضان
کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم غنیمت میں سے پانچواں
حصہ ادا کرو۔

اس حدیث میں اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار ایمان کا براہ
راست پہلو ہے اور دوسری چیزیں ایمان کا بالواسطہ پہلو ہیں۔ وہ ایمان کے نتیجے اور تقاضے کے
تحت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ تاہم یہ بالواسطہ تقاضوں کی مکمل فہرست نہیں ہے۔ حقیقت
یہ ہے کہ تمام دینی احکام ایمان باللہ کے تقاضے میں شامل ہیں۔ جس طرح درخت کا ہر جزء اس کے
بیج کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی جب صحیح معنوں میں ایمان کی حقیقت کو اپنا تہ ہے تو اس کی
زندگی کے تمام اعمال میں اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی پوری زندگی اللہ کے رنگ میں رنگ جاتی ہے
اللہ سب کچھ ہے، وہی اصل حقیقت ہے۔ اللہ کے حکم سے تمام چیزیں ظہور میں آتی ہیں اور
پھر اسی کی طرف تمام چیزیں لوٹتی ہیں۔ اللہ تمام کائنات کا رب ہے۔ وہی ہر چیز کا مطلوب و
مقصود ہے۔

اللہ پر ایمان دین کی اصل اساس ہے۔ ایک شخص کو جب اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کی
پوری شخصیت سب سے بڑے نور سے چمک اٹتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے اندر وہ تمام اوصاف
پیدا ہو جاتے ہیں جو خیر امت سے وابستہ ایک فرد کے اندر مطلوب ہیں۔ مثلاً تواضع، احساس
ذمہ داری، بندوں کی خیر خواہی، انصاف پسندی، اپنے اور غیر کو ایک نظر سے دیکھنا، سچائی کا
اعتراف کرنا وغیرہ۔ انہیں اوصاف سے متصف انسان کا نام مومن ہے۔ اور جو شخص ان ربانی اوصاف
سے متصف ہو وہی خیر امت کا رکن بن سکتا ہے۔

شہادت علی الناس عمومی دعوت، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (داخل اصلاح) یہ دونوں
کام وہی لوگ مطلوب معیار پر انجام دے سکتے ہیں جن کی معرفت خداوندی نے ان کے اندر یہ اوصاف پیدا

کردے ہوں۔ اس کے بغیر اس کام کی انجام دہی ممکن نہیں۔

خارجی مسلمان حق اور داخلی امر وہی، یہ دونوں نازک ترین ذمہ داری کے کام ہیں۔ ان کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے اللہ کا وہ خوف درکار ہے جس نے آدمی کی شخصیت کو پوری طرح بدل ڈالا ہو۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی دوسروں کا خیر خواہ بنے۔ وہ احساس ذمہ داری کے تحت یہ کام انجام دے سکے۔ انہما برتری کے لئے۔ وہ لوگوں کی زیادتیوں کو ایک طرف طور پر برداشت کرے۔ وہ لوگوں کی طرف سے کسی قسم کے بدلے کا امیدوار نہ ہو۔ اس کا کلام دل سوزی کا کلام ہو۔ وہ اتنا زیادہ لوگوں کی ہدایت کا حربہ نہیں ہو کہ اس کے دل سے ان کے لئے دعائیں نکلنے لگیں۔

ایمان باللہ کے بغیر آدمی کی زندگی فی فطری زندگی ہوتی ہے، ایمان باللہ کے بعد وہ اپنی اصل فطرت پر آجاتا ہے۔ اب وہ مصنوعی انسان کے بجائے حقیقی انسان بن جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے محور پر چلنے کے بجائے اللہ عز و جل کے محور پر چلنے لگتا ہے۔ وہ خود ساختہ شریعت کو چھوڑ کر اللہ کی مقرر کی ہوئی شریعت پر تامل ہو جاتا ہے۔

اس طرح جو انسان بنتے ہیں، انہیں کے مجموعہ کا نام خیر امت ہے۔ انہیں انسانوں سے وہ کردار ظاہر ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے اور جس کا ذکر آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

اسلامی جہاد

جہاد کے لفظی معنی کوشش (struggle) کے ہیں۔ اس میں مبالغہ کا مفہوم شامل ہے۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں جہدت رقی۔ یعنی میں نے اس معاملہ میں بہت زیادہ غور و فکر کیا۔ قرآن میں ہے کہ واقصوا باللہ جہد ایمانہم (المائدہ ۵۳) یعنی قسم کھانے میں شدت برتنا، مبالغہ کرنا۔ اسلام شروع سے آخر تک جہاد ہے۔ آدمی جب اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک مجاہدانہ زندگی میں داخل ہوتا ہے جو برابر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی راہ میں آدمی کی موت آجائے۔

اس جہاد کا پہلا محاذ آدمی کی خود اپنی ذات ہے۔ جب آدمی اپنے آپ کو مومن و مسلم کہتا ہے تو وہ گویا یہ عہد کرتا ہے کہ وہ نفسیاتی محرکات کو دبائے گا اور شیطانی ترغیبوں سے راکر خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر قائم رہے گا۔ اس کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کے لیے اپنی نفس سے جہاد کرے (الجاهد من جاهد نفسه فی طاعة اللہ)

جہاد کا دوسرا محاذ دعوت ہے۔ یعنی اللہ کے پیغام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کے لیے اپنی ساری ممکن کوشش صرف کرنا۔ یہ اتنا بڑا عمل ہے کہ قرآن میں اس کو جہاد کبیر کہا گیا ہے (وجاہدہم بجمہاد اکبیراً) اللہ کے دین کا خطاب تمام انسانوں اور تمام قوموں سے ہے۔ اس کو اس کے تمام آداب اور تقاضوں کے ساتھ سارے اہل عالم تک پہنچانا ہے۔ اس لحاظ سے بلاشبہ دعوت کا عمل عظیم ترین جہاد ہے، اس سے بڑا جہاد اور کوئی نہیں۔

جہاد کا تیسرا محاذ دفاع ہے۔ یعنی اسلام کے دشمن اگر ایک طرف طور پر اہل اسلام کے اوپر جارحانہ حملہ کریں، اور ان کو حملے سے باز رکھنے کی تمام ممکن تدبیریں غیر موثر ثابت ہوئی ہوں تو ایسی صورت میں بشرط استطاعت ان سے مقابلہ کر کے انہیں پسپا کرنا اور ان کے حملہ کو ناکام بنا دینا۔ جہاد کی یہی تیسری قسم ہے جس کو شریعت میں قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔

جہاد نفس اور جہاد دعوت ایک مستقل عمل ہے، وہ مومن کی زندگی میں ہر روز اور ہر لمحہ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جہاد اعداء ایک اتفاقی اور استثنائی عمل ہے۔ اس کا مقصد دفاع ہے اور دفاع اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی کی طرف سے جارحیت کا آغاز کر دیا جائے۔

جہاد عمومی معنی میں ہر وقت جاری رہنے والا عمل ہے اور قتال کے معنی میں وقتی طور پر پیش آنے والا عمل۔ یہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا ایک مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

جہاد قتال کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ وہ کامل جہاد جہد کے ہم معنی ہے۔ اس اعتبار سے جہاد کا تعلق زندگی کے ہر معاملہ سے ہے۔ مشہور تابعی الحسن البصری نے کہا ہے کہ آدمی جہاد کرتا ہے اور وہ ساری عمر میں ایک دن بھی کسی کو تلوار نہیں مارتا، ان الرجل یجاہد وما ضرب یوما من الدھر بسیف، تفسیر ابن کثیر ۳/۴۰۴

جہاد کے لفظی معنی کو شمش کے ہیں۔ البتہ اس کے مفہوم میں مبالغہ ہے۔ یعنی اس کا مطلب ہے بہت زیادہ کوشش کرنا (جہد الرجل فی کذا) یعنی جد و جہاد، لسان العرب، اس اعتبار سے جہاد وہی چیز ہے جس کو اردو میں جہاد اور انگریزی میں "اسٹرگل" کہا جاتا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں جب ایک شخص ایمان قبول کرتا ہے تو یہ اس کے لئے کوئی سادہ بات نہیں ہوتی۔ یہ دراصل غیر مومنانہ حالات میں مومنانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی پوری زندگی جہاد جہد کی زندگی بن جاتی ہے۔ سوچ اور عمل ہر اعتبار سے اس کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ اپنے آپ کو غیر خدائی طریقہ سے بنائے، اور جو خدائی طریقہ ہے اس کو پوری طرح اپنی زندگی میں اختیار کرے۔

قرآن کی سورہ العنکبوت میں عمل اسلام کو عمل جہاد کہا گیا ہے۔ حالانکہ العنکبوت ایک مکی سورہ ہے۔ اور مکی دور میں ابھی قتال کا حکم آیا ہی نہیں تھا۔ ارشاد ہوا ہے:

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو جانچنا نہ جائے گا۔ اور ہم نے ان لوگوں کو جانچنا ہے جو ان سے پہلے تھے۔ پس اللہ ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو بچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو بھی ضرور معلوم کرے گا۔ کیا جو لوگ برائیاں کر رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سے نکل جائیں گے۔ بہت برا فیصلہ ہے جو وہ کہتے ہیں۔ جو شخص اللہ سے لڑنے کی امید رکھتا ہے تو اللہ کا وعدہ ضرور آنے والا ہے، اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اور جو شخص جہاد کرے تو وہ اپنے ہی لئے جہاد کرتا ہے۔ بے شک اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے (العنکبوت ۱-۶)

یہاں "جہاد" سے مراد یقیناً طور پر قتال نہیں ہے۔ یہاں جہاد سے مراد وہ غیر معمولی محنت ہے

جو آدمی کو ایمان اور عمل صالح والی زندگی اختیار کرنے کے لئے اس دنیا میں کرنا پڑتا ہے۔ یہ شخص جہادِ ہر آدمی کو لازماً کرنا ہے، اس کے بغیر وہ ایمان اور عمل صالح کی روشنی پر قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک شخص جب مومن بنتا ہے تو اس کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ اس نے عام روش سے الگ ایک زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لوگ خدا کو رسمی طور پر مان رہے ہوتے ہیں، وہ خدا کو زندہ عقیدہ کے طور پر ماننا چاہتا ہے۔ لوگ پیغمبر کو اپنا فرزند بنائے ہوئے ہوتے ہیں، وہ پیغمبر کو اپنا مہمان بنانا چاہتا ہے۔ لوگ آخرت سے بے خوفی میں پڑے ہوتے ہیں، وہ آخرت سے خوف والی زندگی کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ لوگ ماحول کی بھلائی اور برائی سے بے تعلق ہو کر اپنا ذاتی آشیانہ بنا کر ٹھہر رہتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ اچھے کو اچھا کہے اور برے کو برا بتائے۔ لوگ اپنے بڑوں کو میاں بنائے ہوئے ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ بڑے اور چھوٹے دونوں کو یکساں طور پر خدا کے معیار حق پر جانپنے۔ لوگ زمانہ سے معاملات کر کے زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ زمانہ سے بے پروا ہو کر صداقت کو مرکز توجہ بنائے۔ لوگ ظواہر پر اپنی زندگی کو مہم سمجھتے ہوئے ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ حقائق کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

یہ فرق ایک سچے مومن کے لئے اس کی پوری زندگی کو مشقت اور قربانی کی زندگی بنا دیتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو آندھی اور طوفان کے اٹنے رخ پر چلنا چاہتا ہو۔ ایسے آدمی کے لئے سفر سخت محنت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اسی طرح سچے مومن کے لئے موجودہ دنیا میں زندگی گزارنا محنت و مشقت کا ایک عمل ہے۔ اسی پر مشقت عمل کا نام جہاد ہے۔

جہاد نفس اور شیطان سے لڑنے کا ہتھیار ہے۔ جہاد با اصول زندگی گزارنے کی قیمت ہے۔ جہاد دارالامتحان میں اپنے امتحان کے پرچہ کو صحیح طور پر کرنے کی کوشش ہے۔ جہاد کسی خارجی نظام کو نافذ کرنے کا عمل نہیں، جہاد خود اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر کھڑا کرنے کی محنت ہے۔ جہاد کی لازمی شرط فی سبیل اللہ ہے، جو جہاد، فی سبیل اللہ ہو وہ ہرگز جہاد نہیں اور نہ اس پر خدا کی وہ برکتیں نازل ہونے والی ہیں، جو صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مقدر کی گئی ہیں۔

ایک لفظ کافی نہیں

جو لوگ جہاد کو جنگ اور قتال کے ہم معنی سمجھتے ہیں، ان کا حال یہ

ہے کہ اگر کسی آیت یا حدیث میں قتال یا اس کے ہم معنی لفظ لیا جائے تو اس کو اپنے حق میں کافی دلیل سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ کسی کلام میں قتال یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا آجانا اس بات کا کافی ثبوت نہیں کہ اس سے مراد شہیری جنگ ہے۔ بعض اوقات کلام میں شدت پیدا کرنے کے لئے بھی قتال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک معاملہ میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا۔ حضرت عمر کا انداز شدید ہو گیا تو حضرت ابو بکر نے فرمایا: اتھا ربی یا ابن الخطاب (اے خطاب کے بیٹے، کیا تم مجھ سے جنگ کرو گے)

حضرت ابو بکر کے اس قول (اتھا ربی) سے مراد نیزہ اور تلوار کی جنگ نہیں ہے۔ یہاں دراصل حضرت عمر کے انداز کے خلاف شدت انہما کے لئے حرب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کلام کا یہ اسلوب ہرزبان میں رائج ہے۔

علمی و فکری جنگ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد، الفاظ کے معمول فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ ابو داؤد کے الفاظ یہ ہیں:

عن عمران بن حصین قال ، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	عمران بن حصین فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، لا تنزال طائفۃ	وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کے
من امتی یقاتلون علی الحق ظاہرین	لئے لڑتا رہے گا، وہ ان پر غالب رہے گا جو ان
علی من ناو اہم حتی یقاتل آخرہم	سے دشمنی کرے گا، یہاں تک کہ ان کا آخری گروہ
المسیح الدجال	سک دجال سے جنگ کرے گا۔

بعض لوگ اس حدیث سے جنگ کا مسئلہ نکالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر زمانہ میں مخالفین سے جنگ کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ان حضرات کے اس استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ اس حدیث میں "قتال" کا لفظ آیا ہے۔ مگر یہاں قتال سے مراد ہتھیاروں کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فکری اور نظریاتی مقابلہ ہے۔ چنانچہ محدثین نے اس روایت میں قتال سے یہی مراد لیا ہے۔

صحیح البخاری میں "کتاب الامتصام بالکتاب والسنۃ" کے تحت جو ابواب ہیں، ان میں سے ایک باب کے تحت امام نسائی نے مذکورہ مفہوم کی دو روایتیں نقل کی ہیں۔ اس کا ترجمہ ابواب انہوں نے ان الفاظ

میں قائم کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے بیان میں کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہتے ہوئے جنگ کرتا رہے گا، اور وہ اہل علم ہیں (باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تزال طائفة من امتی ظاہرین علی الحق تا ملون وہم اہل العلم) اس سے معلوم ہو کہ مذکورہ حدیث میں قتال کا لفظ، امام بخاری کے نزدیک، مجازی معنوں میں ہے، وہ حقیقی معنوں میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ حدیث میں قتال سے انھوں نے علماء کی بدوجہ بد و جہد کو مراد لیا ہے۔

حافظ ابن حجر العسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب رہیں گے، ان کی مخالفت کرنے والا ان کو نقصان نہ پہنچائے گا (قاہرین لعدوہم لا یضرہم من خالفہم)۔

حافظ ابن حجر نے علی بن المدینی کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد علماء، حدیث میں (ہم اصحاب الحدیث)، اسی طرح انھوں نے امام احمد بن حنبل کا قول اس حدیث کی تشریح میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے مراد اگر علماء، حدیث نہیں تو مجھ کو نہیں معلوم کہ اور کون لوگ اس سے مراد ہیں (ان لم یکنوا اہل الحدیث فلا ادعی من ہم) فتح الباری، جز: ۱۳، ۱۰۱۳، القاہرہ، ۵۱۳۳۸، ۲۵۰ نمبر۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں قتال کا لفظ مقابلہ یا مجاہدہ کے مفہوم میں ہے۔ ایسے مواقع پر قتال یا جنگ کا لفظ مفہوم میں شدت پیدا کرنے کے لئے آتا ہے نہ کہ اپنے ظاہری لغوی مفہوم میں۔ ایک اخبار نویس کا انتقال ہوا تو اس کے حالات کے تحت لکھا گیا کہ "وہ ساری عمر فرقہ واریت سے لڑتے رہے۔" ظاہر ہے کہ یہاں لڑنے کا لفظ ظہمی بد و جہد کے معنی میں ہے نہ کہ حسرتی شکر اؤ کے معنی میں۔

مذکورہ حدیث رسول میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ امت محمدی کبھی علماء حق سے خالی نہیں ہوگی۔ اس میں ہمیشہ ایسے افراد موجود رہیں گے جو دین کا صحیح علم رکھتے ہوں، اپنی زبان و قلم سے اس کا اعلان کریں، اور جو لوگ دین کے تصور کو بگاڑیں، ان سے ٹکری مقابلہ کر کے ان کا غلط ہونا ثابت کریں۔ یہ صورت حال جاری رہے گی یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

جہاد وقتال سے مراد اصلاً اور اولاً یہی فکری جدوجہد ہے۔ تشدد و از جنگ تو بہت بعد

آتی ہے ، اور وہ بھی بطور دفاع ذکر بطور اقسام۔

اعلام کلمۃ اللہ

سورہ التوبہ میں ہجرت کے واقعہ کو یاد دلاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جب مکہ کے مسکرمین نے پیغمبر کو کہہ کر نکال دیا۔ جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب پیغمبر اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو ، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اپنی سکینت اس کے اوپر اتاری اور اس کی مدد دے کر لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے۔ اور اللہ نے منکروں کا گلہ نیچا کر دیا اور اللہ کا کلمہ ہی اونچا ہے۔ اور اللہ عزوجل بزرگ سیکم ہے (التوبہ ۴۰)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ انکار کرنے والوں کے کلمہ سے مراد شرک ہے اور کلمۃ اللہ سے مراد لا الہ الا اللہ ہے (قال ابن عباس : یعنی بکلمۃ الذین کفروا بالشرك وكلمۃ اللہ ہی لا الہ الا اللہ ، تفسیر ابن کثیر ۲/۳۵۸) اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی آتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

عن ابی موسیٰ قال۔ جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال۔ الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للمذکر والرجل یقاتل لیس فی مکانہ فمن فی سبیل اللہ ، قال : من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فهو فی سبیل اللہ (متفق علیہ)

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ کوئی آدمی مال کے لئے لڑتا ہے۔ کوئی آدمی شہرت کے لئے لڑتا ہے۔ کوئی آدمی اس لئے لڑتا ہے تاکہ اس کو ممتاز مقام حاصل ہو۔ ان میں سے کون اللہ کے راستہ میں لڑنے والا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جو اس لئے لڑے کہ اللہ کا کلمہ ہی بلند کلمہ ہو جائے۔

اس آیت ، اور اس حدیث میں اعلام کلمۃ اللہ سے مراد اعلام کلمہ ہے نہ کہ اقامت نظام بعین اس سے مراد یہ ہے کہ نظریہ شرک فکری حیثیت سے دب جائے اور نظریہ توحید فکری حیثیت سے بالا و برتر ہو جائے۔

فکری غلبہ کا یہ واقعہ اصل فکری ہمد و جہد کے ذریعہ ہوتا ہے۔ دلائل کے میدان میں توحید کو شرک کے اوپر غالب کیا جاتا ہے۔ تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اہل باطل و دلیل کے میدان میں مغلوب

ہونے کے بعد جارحیت کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ اہل حق کے اوپر ہتھیاروں کے ذریعہ حملہ کر دیتے ہیں۔ اس وقت اہل حق کو اپنے اور حق کے دفاع میں جو اہلی کارروائی کرنی پڑتی ہے۔

خود ساختہ تعبیر

موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں نے جہاد فی سبیل اللہ کو جہاد سیاسی کے ہم معنی بنا دیا ہے۔ مثلاً "جہاد فی سبیل اللہ" نامی ایک کتاب میں جہاد کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"اسلامی جہاد کا مقصد غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ اسلام یہ انقلاب صرف ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ابتداً مسلم پارٹی کے ارکان کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہوں وہاں کے نظام حکومت میں انقلاب پیدا کریں۔ لیکن ان کی آخری منزل مقصود ایک عالم گیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں (مسلم پارٹی ہر جگہ، لاکھوں اسلامی حکومتوں کو متاثر دے گی اور ان کی جگہ اسلامی حکومت قائم کسے گی) (۲۲-۲۳)

اسلامی جہاد کا یہ تصور سراسر بے بنیاد ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سارے قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی موجود نہیں جس کے براہ راست مفہوم کے طور پر سیاسی انقلاب کا یہ نظریہ برآمد ہوتا ہو۔ مذکورہ کتاب میں اس نظریہ کے حق میں جو "دلائل" دئے گئے ہیں، وہ سب انشا پر دازی کی نوعیت کے ہیں۔ کچھ آیتیں اور حدیثیں پیش کی گئی ہیں۔ مگر وہ سب اصل سلسلے سے مشتعل ہیں۔ حتیٰ کہ ایک کچھوڑ کر کسی آیت یا حدیث میں جہاد کا صیغہ تک موجود نہیں۔

نقل کردہ آیتوں میں صرف ایک آیت ایسی ہے جس میں یجاہدوا باموالہم وانفسہم کا لفظ آیا ہے۔ یہ سورہ التوبہ کی آیت ۴۴ ہے۔ مگر اس آیت میں مذکورہ نظریہ کے حق میں کوئی دلیل نہیں۔ یہاں دشمنان اسلام کی جارحیت کے مقابلہ میں دفاعی جنگ لڑنے کے لئے نکلنے کا ذکر ہے۔ "مکل نظام قائم کرنے کے لئے جہاد کرو۔ اس قسم کے نام نہاد انقلابی نظریہ کا ذکر نہ اس آیت میں ہے اور نہ قرآن کی کسی دوسری آیت میں۔

اصل بات حذف

اس نظریہ جہاد کا غلط ہونا اسی سے ثابت ہے کہ وہ پورے دین سے منکر جاتا ہے۔ اس کو اختیار کرنے کی صورت میں پورے دین کا نقصہ مگر جاتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے اس نظریہ جہاد کے شبوہ

ترین و کمیل کا اقتباس دیکھئے :

”ہمیں سے یہ سوال بھی مل ہو جاتا ہے کہ کسی ملک پر اسلامی نظام کی حکومت قائم ہو جانے کی صورت میں ان لوگوں کی کیا حیثیت ہوگی جو کسی دوسرے عقیدہ و مسلک کے متبع ہوں۔ اسلام کا جہاد لوگوں کے عقیدہ و مسلک اور ان کے طریق عبادت یا قوانین معاشرت سے تعرض نہیں کرتا۔ وہ ان کو پوری آزادی دیتا ہے کہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں اور جس مسلک پر چاہیں چلیں۔ البتہ وہ ان کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ ان کی خاطر کسی ایسے طریقہ پر حکومت کا انجام چلایا جائے جو اسلام کی نگاہ میں فاسد ہے۔ نیز وہ ان کے اس حق کو بھی نہیں مانتا کہ وہ معاملات کے ان طریقوں کو اسلامی نظام حکومت میں جاری رکھیں جو اسلام کے نزدیک اجتماعی فلاح کے لئے مہلک ہیں (مثلاً سود، چوری، جو، وغیرہ)۔ جہاد فی سبیل اللہ، صفحہ ۲۵-۲۶۔ اس نظریہ جہاد کے مطابق، اسلامی جہاد لوگوں کے عقیدہ اور عبادت سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ اس کا سارا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اوپر اسلام کے اجتماعی اور سیاسی قانون کی حکومت قائم ہو جائے۔ یہ سراسر ایک خود ساختہ نظریہ ہے۔ اس میں جہاد کا اصل مقصد مذہب ہو گیا ہے، اور جہاد کا جو مقصد سارے قرآن و حدیث میں کہیں مذکور نہیں، وہی اس کا اصل مقصد قرار دیا گیا ہے۔

سورہ الفرقان میں توحید (آیت ۲) اور اٹھ کی عبادت (آیت ۵۵) کا ذکر ہے اور توحید اور عبادت کی اس دعوت کے خلاف منکرین جو مشہدات پھیلا رہے تھے، ان کو دلائل سے رد کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کے ذریعے سے ان کے اوپر جہاد کبیر (۵۲) کر دو۔ یہاں واضح طور پر جہاد سے مراد وہ عمل ہے جو توحید اور عبادت الہی کی تبلیغ کے لئے کیا جاتا ہے۔

اس طرح کی دوسری بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں جو دعوت توحید کے عمل کو جہاد کا عمل بتاتی ہیں۔ جب کہ قرآن اور حدیث کے پورے ذخیرے میں کوئی بھی آیت یا حدیث موجود نہیں جس میں مذکورہ نوعیت کے سیاسی عمل کو جہاد قرار دیا گیا ہو۔

جہاد کا مذکورہ نظریہ دراصل جہاد کی سیاسی تعبیر ہے۔ اس میں جہاد کا تصور بنیادی طور پر بدل جاتا ہے اور دین کا پورا نقشہ سمیٹ ہو جاتا ہے۔

دین میں اصل اہمیت تواضع کی نفسیات کی ہے، مگر جہاد کا مذکورہ نظریہ اس کے برعکس، سرکشی کی نفسیات پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں دین کا رد و معافی پہلو غالب ہو جاتا ہے اور سیاسی پہلو غیر متناسب طور

پرا بھرتا ہے۔ جن لوگوں کا مزاج اس نظریہ کے تحت بنتا ہے، ان کی نظر میں داخل اعتبار سے ہٹ جاتی ہیں اور ساری توجہ خارجی اعتبار کی طرف مہلی جاتی ہیں۔ ایسا آدمی عین اپنے مزاج کے مطابق اپنی ذات پر لفظی تنقید بھی برداشت نہیں کرے گا۔ اور دوسروں کے اوپر گولی اور بم کی بارش کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھے گا۔ تعمیری میدان میں سرگرم ہونا اس کو غیر اہم نظر آنے کا اہمہتہ تجربہ کے پروگرام سے اس کو بہت زیادہ دل چسپی ہوگی۔ اسلام یہ مزاج دیتا ہے کہ اہل ایمان دوسرے بندگان خدا کے محبت کریں، وہ ان کی زیادتیوں کے باوجود ان کے لئے دعائیں کریں۔ مگر مذکورہ قسم کے سیاسی مبہدین کا حال یہ ہو گا کہ ان کے پاس دوسروں کے لئے صرف نفرت ہوگی۔ وہ دوسروں کو بدو عادینے والے ہوں گے مذکر ان کے حق میں دعا کرنے والے۔

ناقص استدلال

یہ انقلابی نظریہ ساز اپنے نظریہ کے حق میں قرآن کی جو آیتیں پیش کرتے ہیں، ان کی حیثیت محض بے جا جاسارت کی ہے۔ کیوں کہ ان آیتوں کا ان کے "انقلابی نظریہ" سے کوئی تعلق نہیں۔

مثلاً مذکورہ کتاب (جہاد فی سبیل اللہ) کا ایک حوالہ یہ ہے: "اسلامی دعوت عالمگیر اور کُل انقلاب کی دعوت تھی۔ اس نے پرکار کر کہا کہ ان المسلم اللہ۔ یعنی حکومت سوائے خدا کے اور کسی کی نہیں ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بذات خود انسانوں کا حکمران بن جائے اور اپنے اختیار سے جس چیز کا چاہے حکم دے اور جس چیز سے چاہے روک دے۔ کسی انسان کو بالذات امر و نہی کا مالک بھننا دراصل خدائی میں اسے شریک کرنا ہے اور دنیا میں ہی اسل بنائے فساد ہے" ۱۲ - ۱۳

اس اقتباس میں قرآن کی آیت (ان المسلم اللہ) کو اپنے انقلابی نظریہ کے حق میں بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس آیت کا مذکورہ نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔

ان المسلم اللہ کا فقرہ قرآن میں تین جگہ (الانعام ۵، یوسف ۴۰، یوسف ۶۷) آیا ہے۔ عینوں مقامات پر واضح طور پر وہ فرق اطمینان حکم کے معنی میں ہے، وہ ہرگز سیاسی حکم کے معنی میں نہیں۔ قرآن کی اس آیت کو کوئی ایسا شخص ہی مذکورہ انقلابی اور سیاسی مفہوم میں لے سکتا ہے جو خدا کی کتاب کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہو۔

اس طرح اس سیاسی نظریہ کے ایک حامی اس سیاسی نظریہ کے حق میں شہادت کی آیت (التکوذا

شہداء علی الناس اپیش کر تے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ امت محمدی کو سارے عالم کے سامنے دین حق کی گواہی دینا ہے۔ یہ گواہی محض دین کی ہونی چاہئے۔ اس لئے امت پر لازم ہے کہ وہ دین کے پورے نظام کو عملاً زمین پر قائم کرے تاکہ دنیا کے سامنے تمام دینی احکام اور پورے دینی نظام کا مظاہرہ ہو سکے۔ اس مشکل عملی مظاہرہ کے بعد ہی لوگوں کے اوپر خدا کے دین کی حجت پوری ہو سکتی ہے اور امت محمدی قیامت میں یہ کہہ سکتی ہے کہ اس کو جو دین ملا تھا، اس کو اس نے خدا کے بندوں تک پہنچا دیا۔

یہ سارا استدلال خود ساختہ مفروضہ پر قائم ہے۔ امت محمدی کو جو شہادت دینا ہے اس کا قانونی نظام اور سیاسی اقتدار سے کوئی تعلق نہیں۔ اس شہادت کا تعلق دین کے فکری اور تصور آتی پہلو سے ہے نہ کہ دین کے عملی نظام سے۔ اگر عملی نظام کے مظاہرہ کو ضروری قرار دیا جائے تو کسی بھی پیغمبر نے کسی کامل شہادت نہیں دی اور نہ اپنی قوموں پر تمام حجت کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ کسی بھی نبی نے عملی نظام قائم نہیں کیا۔ حتیٰ کہ پیغمبر اسلام کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق پیغمبر اسلام نے مکہ کے لوگوں پر تمام حجت کی حد تک شہادت کا کام انجام دے دیا۔ اس کے بعد آپ نے مکہ سے ہجرت فرمائی۔ مگر، جیسا کہ معلوم ہے، مکہ میں صرف فکری تبلیغ کا کام ہوا، وہاں کے منکروں کے سامنے کسی عملی نظام پیش نہیں کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ شہادت کا کام تمام تر ایک فکری پیغام رسانی کا کام ہے۔ اس کام کے لئے مزید جو چیز درکار ہے، وہ عملی نظام کا مظاہرہ نہیں۔ بلکہ دائمی کا انحصار ہے۔ دائمی کو یہ کام اس طرح کرنا ہے کہ وہ آخری حد تک مدعو کا غیر خواہ ہو۔ وہ نصح اور امانت کے جذبہ کے تحت یہ کام کرے۔ وہ حرص کی حد تک مدعو کی بدابیت کا طلب گار نہ رہے۔ وہ ایک طرف طور پر مدعو کی اذیتوں کو بے۔ وہ مدعو کے ظلم و سرکشی کے باوجود اس کے لئے نیک دعائیں کرے۔

جہاد کی مختلف صورتیں

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس کا تعلق صرف جنگ کے میدان سے نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر میدان اور ہر رنگی سے اس کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں قرآن و حدیث سے چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ قرآن میں ہے کہ جو لوگ ہمارے واسطے باہر کریں گے ان کو ہم ضرور اپنے راستے دکھائیں گے (الذین جاہدوا فینا لنمھدھنھم سبھنا، انکرتھ اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ جو لوگ ہماری

طلب میں مجاہدہ کریں گے ان کو ہم اپنی طرف پہنچنے کے راستے دکھائیں گے (الذین جاہدوا فی طلبنا لنجدینہم سبل الوصول الینا . تفسیر النبی)

اس آیت میں جہاد کا لفظ اس جدوجہد کے لئے استعمال ہوا ہے جو آدمی خدا کو پانے کے لئے روحانی سطح پر کرتا ہے۔ یہ جہاد ابتداءً تلاشِ حق کی صورت میں آدمی کے اندر ظاہر ہوتا ہے اور اس کے بدرساری عمر زیادہ سے زیادہ معرفت رب حاصل کرنے اور تعلق باللہ کو بڑھانے کے لئے جاری رہتا ہے۔

۲۔ جہاد کا سب سے بڑا اعجاز جو آدمی کی زندگی میں ہر وقت جاری رہتا ہے، وہ خود اپنے نفس کا اعجاز ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے اللہ کی اطاعت کے لئے لڑے (الجاہد من جاہد نفسه فی طاعة اللہ) دوسری حدیث میں ہے کہ اپنی خواہشوں سے جہاد کرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے لڑتے ہو (جاہدوا اھواؤکم کما تجاہدون اعداءکم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار دشمنوں سے مقابلہ کے بعد واپس آئے تو آپ نے فرمایا کہ ہم چھوٹے جہاد کے بعد اب بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں (رجعنا من الجھاد الا صغر الی الجھاد الکبیر)

موجودہ دنیا میں ہر وقت اصول اسلام اور خواہشِ نفس کے درمیان مقابلہ جاری رہتا ہے اس مقابلہ میں آدمی کو اصول اسلام کا حامی بن کر اپنی خواہشِ نفس سے لڑنا ہے اور اسے زیر کرنا ہے یہ سب سے زیادہ عام جہاد ہے اور وہ بلاشبہ سب سے بڑا جہاد ہے۔ یہ اپنے نفس کو کنٹرول کرنا اور اپنی خواہشوں پر روک لگانے کا جہاد ہے۔ اس جہاد کے بغیر کسی آدمی کے لئے خدا پرستی کی زندگی پر عمل کرنا ناممکن نہیں۔

۳۔ الترمذی، الہوداؤد اور الدارمی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کا حکم سن کر پوچھا۔ بیچتے ہوئے آپ نے ان سے پوچھا کہ کوئی معاملہ پیش آئے تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے۔ انھوں نے کہا کہ میں کتاب اللہ کے ذریعہ فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو تم کیسے کرو گے۔ انھوں نے کہا کہ پھر میں اللہ کے رسول کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ کے رسول کی سنت میں بھی نہ پاؤ۔ انھوں نے کہا کہ پھر میں اپنی رائے پر بیعت کروں گا اور اس میں کمی نہیں کروں گا (اجتہد رأی و لا آلو ، ۲/۱۱۳۰)

اس حدیث میں جہاد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہو گا کہ کسی معاملہ میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لئے مطالعہ اور غور و فکر میں منت کرنا بھی جہاد ہے۔ یہ عمل کا وہی میدان ہے جس کو دوسری حدیث میں تفتق فی الدین کہا گیا ہے۔

۴۰۔ حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مشرکوں سے جہاد کرو اپنے مال سے اور جان سے اور زبان سے (جاہدوا المشرکین باموالکم وانفسکم والسنتکم، مشکوٰۃ المعاریض ۲/۱۱۲۳)۔

اہل اسلام کا غیر اہل اسلام کے ساتھ جہاد (مقابلہ) بنیادی طور پر نہ صرف میدان پیش آتا ہے۔ وہ اسلام کے فکر کو بنیاد رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا غیر اسلامی فکر دنیا میں اوج نہ پا سکے۔ اس مقابلہ میں اہل اسلام کو کبھی مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی زبان سے ان کی باتوں کا توڑ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی نفسا ہوتا ہے کہ پوری جسمانی طاقت کو اس راہ میں لگا دیا جائے۔ اس قسم کی ہر کوشش مذکورہ حدیث کے مطابق جہاد کی فہرست میں داخل ہے۔

۵۔ عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے آپ سے جہاد کی اجازت مانگی۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تم انہیں تمہارا جہاد کرو (جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فاستأذنته في الجهاد فقال أختي وإلديك - قال نعم. قال فخصمهما فجاهد، متفق علیہ، ۳/۱۱۲۳)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی جہاد ہے۔ بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنے میں جو نفسیاتی یا جسمانی مشقت اٹھانی پڑتی ہے وہ سب اللہ کے یہاں جہاد کا عمل قرار پائے گی۔

۶۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت طلب کی۔ آپ نے فرمایا کہ عورتوں کا جہاد حج کرنا ہے (قات استأذنت النبي صلى الله عليه وسلم في الجهاد - فقال: جهادكن الحج، متفق علیہ، ۳/۱۱۲۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک عورت حج کے سفر میں اور جہاد کی ادائیگی میں جو مشقت اٹھاتی ہے۔ اس کے لئے وہی جہاد کا عمل بن جاتا ہے۔ حج روحانیت کو بڑھانے والا عمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا

ہے کہ اپنے اندر روحانیت اور ربانیت کو بڑھانے کے لئے جو محنت کی جائے وہ بھی اللہ کے نزدیک جہاد کی نوعیت کا عمل شمار ہوگا۔

۷۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اے نبی، تم مکہ میں کے اوپر قرآن کے ذریعہ جہاد کرو، بڑا جہاد (وجہا دہم بہ جہاد اکبیر) ۱، الفرقان (۵۲)

ظاہر ہے کہ قرآن کوئی تلوار نہیں ہے، وہ ایک کتاب ہے جس میں اسلام کی تعلیمات درج ہیں۔ قرآن کے ذریعہ جہاد کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تبلیغ قرآن کے عمل میں محنت کرو۔ یہ جہاد اللہ کی نظر میں اتنا اہم ہے کہ اس کو جہاد کہیے کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فکری پیغام رسانی کا کام نہ صرف جہاد ہے بلکہ وہ تمام جہادوں سے بڑا ہے، وہ جہاد کبیر کا درجہ رکھتا ہے۔

۸۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو، تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔ وہ ایمان والوں کے لئے نرم اور انکار کرنے والوں کے اوپر سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کس ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے (المائدہ ۵۴)

ایک سماج جہاں لوگوں کے اندر غیر اسلامی مزاج ہو، جہاں غیر اسلامی طریقے رائج ہو گئے ہوں، وہاں اسلام کے مطابق بولنا اور اسلامی اصولوں کے مطابق چلنا بے مشکل کام ہے۔ ایسے ماحول میں اسلام کو اختیار کرنے والا آدمی پورے ماحول میں اچھنی بن جاتا ہے۔ اس کو ہر طرف سے ملامت کے الفاظ سننے پڑتے ہیں۔ اس بنا پر اس کو بھی جہاد کہا گیا ہے۔ ملامت کو ہتے ہوئے کوئی کام کرنا اس دنیا کا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

لامت اور اجنبیت کے اس ماحول میں بے پلک انداز میں اسلام پر قائم رہنا بلاشبہ بہت بڑا جہاد ہے۔ مجاہدانہ جذبہ کے بغیر کوئی شخص ایسے ماحول میں اصول اسلام پر قائم نہیں رہ سکتا۔

۹۔ قرآن میں اگرچہ جہاد یا جہاد کا مادہ چالیس سے زیادہ بار استعمال ہوا ہے۔ مگر سارے قرآن میں کوئی ایک آیت ایسی نہیں ہے جس میں جہاد کا لفظ نامتہ صرف جنگ کے معنی میں آیا ہو۔ قرآن میں کہیں بھی "جہادوا" کا لفظ "قاتلوا" کے مرادف کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے۔

قرآن میں جب نامتہ صرف جنگ کا حکم بتاتا ہو تو وہاں قتال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً

يقاتلون في سبيل الله فيقتلون ويقتلون (التوبة ١١١) يا فاذا انسلخ الاشهر الحرم
 فاقتلوا المشركين (التوبة ٥) يا فان قاتلوكم فاقتلوهم (البقرة ١٩١) يا ان الله يحب
 الذين يقاتلون في سبيله صفاً (الصف ٣) يا وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة (البقرة ١٩٣)
 وغیره۔

قرآن میں جن آیتوں میں بھی جہاد کا حکم آیا ہے، وہاں جہاد سے یا تو غیر حربی میدان کی مدد و جہاد مراد
 ہے، مثلاً الفرقان (آیت ٥٢) جس میں جہاد سے مراد دعوتی و تبلیغی جہاد ہے۔ یا اگر جنگی نوعیت کے جہاد کا حکم
 ہے تو وہ عمومی جہاد کے تحت ہے، مثلاً التوبہ (آیت ٣١) قرآن کے مطابق، جہاد میں جنگ کا عمل بھی شامل ہے
 مگر جنگی عمل ہی کا نام جہاد نہیں ہے۔

جہاد بمعنی قتال

جنگ کی دو قسمیں ہیں؛ جارحانہ اور مدافعانہ۔ مثلاً غزوة احد (٣٣) کے موقع پر اہل مکہ
 نے ٣٠٠ میل سے آکر مدینہ پر حملہ کیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو لے کر
 اہل مکہ کا مقابلہ کیا۔ اس شمال میں اہل مکہ کا اقدام جارحانہ تھا اور رسول اور اصحاب رسول کا اقدام مدافعانہ۔
 اسلام میں مخصوص شرائط کے تحت صرف مدافعانہ جنگ کی اجازت ہے۔ جارحانہ جنگ اسلام میں
 جائز نہیں۔ البتہ اگر کوئی فریق جارحیت کا آغاز کر دے تو اس کے بعد جارحانہ اور مدافعانہ کا فرق ختم ہو جاتا
 ہے۔ اب فریق ثانی کے مخالفانہ عزائم کو توڑنے کے لئے اقدامی حملہ بھی حسب حالات جائز ہوگا۔ اسی
 طرح اگر کسی مینہ دشمن کے متعلق معلوم ہو کہ وہ تیاری کر رہا ہے اور وہ بہت جلد حملہ کرنے والا ہے تو ایسی
 صورت میں پیشگی اقدام جائز ہوگا اور وہ باہمت باحقیقت دفاع ہی سمجھا جائے گا۔

جنگ کے بارے میں اسلام کا یہ اصول قرآن کی متعدد آیتوں سے ثابت ہے، مثلاً سورۃ التوبہ
 (آیت ١١٣) میں مسلمانوں کو مشرک قوم کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کا سبب یہ بتلایا گیا ہے کہ
 وہی ہیں جنہوں نے پہلے جنگ کا آغاز کیا (وہم بذنوبکم اول مسوق) اسی طرح دوسری جگہ مشرکوں
 سے جنگ کا حکم دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے
 ہیں؛ وقت اتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (البقرہ ١٩٠) اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد
 ہوا ہے کہ ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے جن کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے؛ اذن للذین

يقاتلون بانهم ظلمو (الحج ۳۹) اسی طرح اہل ایمان کی یہ صفت بتائی کہ وہ ہمیشہ ظلم

کے بعد کسی سے بدلہ لیتے ہیں؛ وان تصروا من بعد ما ظلموا (الشعرا ۲۲۷)

اس معاملہ میں اسلامی تعلیم کی آخری حد یہ ہے کہ جارحانہ جنگ چھیڑنا تو درکنار، جارحانہ جنگ چھیڑنے کی تمنا سے بھی منع کیا گیا ہے۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتی ہے جس کو بخاری اور مسلم دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے:

ايها الناس، لا تمتمنوا لقاء العدو، واما انوا اے لوگو، تم دشمن سے ٹڈبھڑکی تمنا نہ کرو۔
 الله العاقبة، فاذا القيتهم فاهربوا اور اللہ سے عاقبت مانگو۔ البتہ جب ٹڈبھڑ ہو جائے
 واعدوا ان الجنة تعت ظلال السيوف تو انھیں مارو، اور جہان کو (اس وقت) جنت
 (ریاض الصالحین، صفحہ ۳۲۸) تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔

ایک جامع آیت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان لانے والو، رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور جہلائی کے کام کرو تاکہ تم کا پیاب ہو اور تم اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چننا ہے، اور اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔ اس نے تمہارا نام مسلم رکھا، اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ بنے اور تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو۔ پس تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو مضبوط پکڑو، وہی تمہارا مالک ہے۔ پس کیسا اچھا مالک ہے اور کیسا اچھا مددگار! (الحج ۷۷-۷۸)

قرآن کے اس بیان پر غور کیجئے۔ اس میں اہل ایمان کے لئے چار قسم کی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے خدا کی عبادت، عمل خیر (عمل صالح)، اتحاد اور شہادت علی الناس، ان چار احکام کے درمیان میں کہا گیا ہے کہ وجہ اعداؤ فی اللہ حق جہاد اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے)

ان الفاظ اور اس ترتیب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ادا تعلق ان چاروں احکام سے ہے۔ ان چاروں احکام پر اپنے آپ کو کھرا کرنے کے لئے مجاہدہ درکار ہے۔ اس کے لئے نفس کی خواہشوں کو دبانا ہے۔ اس کے لئے وقت اور مال خرچ کرنا ہے۔ اس کے لئے لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت

کرنا ہے۔ کیوں کہ جو شخص لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت نہ کرے وہ مشتعل ہو جائے گا، اور مشتعل آدمی اس دنیا میں کبھی کوئی صبح اور سنجیدہ کام نہیں کر سکتا۔

اس قسم کی ضروری صفات کا ثبوت وہی شخص دے سکتا ہے جو مومن ہونے کے ساتھ جہاد بن جائے، جو قربانی کی سطح پر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے تیار ہو۔

تصدیق رسالت

ہندستان ٹائمس (۱۹ اگست ۱۹۹۰) نے امریکی صحافی (Karen Tumulty) کی ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے پاس اس وقت اتنے زیادہ ہتھیار ہیں جو دنیا کی پوری آبادی کو پانچ ہزار بار ہلک کرنے کے لئے کافی ہیں:

Enough to kill everyone in the world 5,000 times.

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ سوویت روس کے پاس بھی تقریباً اتنے ہی ہتھیار ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ اور روس پچھلے ۷۰ سال سے ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک دوسرے کو ہلک کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہتھیاروں کے اتنے بڑے ذخیرہ کا مالک ہو کر وہ ان کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ کر سکے۔ بلکہ دونوں نے باہم یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے لڑائی نہیں کریں گے۔

اس کی وجہ زمانہ کافرق ہے۔ قدیم زمانہ میں لڑائی تلواروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ تلوار صرف اس آدمی کی گرجان کا شئی ہے جس کے اوپر تلوار چبائی گئی ہے۔ اس سے زیادہ تلوار کا کوئی مزید نقصان نہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے ہتھیاروں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ان کو استعمال کیا جائے تو ان کا نقصان تباہ کن گیسیوں، ہلاکت خیز شعاعوں اور دوسرے مضر اثرات کی صورت میں ساری زمین پر پھیل جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا نقصان خود اس قوم تک پہنچ جاتا ہے جس نے اپنے دشمن کے خلاف ان ہلک ہتھیاروں کو استعمال کیا تھا۔ اس واقعہ نے اب ہتھیاروں کی جنگ کو بے معنی بنا دیا ہے۔ چنانچہ موجودہ دنیا کے تمام انسان اختلافی معاملات میں پر امن بات چیت پر زور دے رہے ہیں۔ اب ساری دنیا میں کوئی بھی شخص جنگ و قتال کی وکالت کرنے والا نہیں۔

زمانہ کی اس تبدیلی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ایک نئے عنوان سے ثابت شدہ

بنادیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مقصد کی جدوجہد (یا جہاد) کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ اس کو جہنمی برعزت (daw'ah-based) ہونا چاہئے۔ اس کے بعد مارکس جیسے مفکرین اٹھے۔ انہوں نے پر امن طریقہ عمل کو بے کار بتایا اور مقصد کے حصول کے لئے جہنمی برعزت (violence-based) طریقہ کی پرزور وکالت کی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں مارکسی نظریہ کا اتنا غلبہ ہوا کہ بعض مسلم مفکرین نے اس سے متاثر ہو کر اسلامی جہاد کی تشدد و انتہا تعبیر شروع کر دی۔

مگر موجودہ صدی کے خاتمہ پر جو حقائق سامنے آئے ہیں، انہوں نے حیرت انگیز طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کی تصدیق کی ہے اور کارل مارکس کے نظریہ کو باطل ٹھہرایا ہے۔ اس طرح دو بارہ ثابت ہو گیا کہ پیغمبر اسلام کی رہنمائی الہامی رہنمائی ہے اور دوسرے تمام لوگوں کے نظریات ان کے اپنے محدود ذہن کی پیداوار ہیں جو ابدی حقائق کے سامنے ٹھہرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

پیغمبر اسلام کی صداقت کی یہ کیسی عجیب دلیل ہے کہ آپ کا پیغام زندگی کی تہذیبوں کے باوجود اپنی صداقت کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ جب کہ دوسرے انسانوں کے نظریات ہمارے بارزانی حقائق سے ٹکر اجاتے ہیں۔ وہ وقتی طور پر اپنی چمک دکھاتے ہیں اور اس کے بعد حرف باطل ثابت ہو کر تاریخ کی الماری میں پھلے جاتے ہیں۔

باب دوم

کاروانِ ملت

غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے جب کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵) کے تحت ہندوستان کا پہلا الیکشن ہوا۔ ہر طرف انتخابی سرگرمیوں کی دھوم مچتی۔ لوگ نہایت جوش و خروش میں تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵-۱۸۸۷) کا یہ شعر پہل بار میرے کانوں نے سنا:

اے کاروانِ ملت اٹھ تو بھی گامِ زن ہو ہر سمت سے صدائیں آتی ہیں طرّ قو کی

۱۹۳۶ء سے پہلے اور اس کے بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ملت کے قافلے اٹھے۔ مسلم رہنماؤں نے بے شمار تعداد میں طوفانِ فیض تحریریں چلائیں۔ ان سرگرمیوں سے لوگوں نے بہت بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لیں جس کا ریکارڈ ماسنی کے نظم و نثر کے ذخیرہ میں اب بھی موجود ہے۔ طفیل احمد منگلوری نے "روشن مستقبل" کے نام سے ضخیم کتاب لکھی۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۹۵۶-۱۸۷۱) نے اپنی ایک نظم میں یہ اعلان کیا:

عنقریب اسلام کی فصل بہار آنے کو ہے

ان سرگرمیوں پر نصف صدی سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے۔ مگر ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آسکا۔ اب ہمارے لکھنے اور بولنے والے دشمنانِ اسلام کی ان سازشوں کے انکشاف میں مشغول ہیں جنہوں نے ہماری پچھلی نسل کی طوفانی کوششوں کو بے نتیجہ کر دیا۔ مگر یہ صرف خود فریبی ہے۔ کیوں کہ خدا کا اٹل ستاؤن ہے کہ اس دنیا میں کوئی قوم ہمیشہ اپنی داخلی کیوں کی بنا پر بازی ہارتی ہے نہ کہ بیرونی سازشوں کی بنا پر۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اپنی قوم کو جو رہنمائی دی، وہ ایک لفظ میں یہ سہی کہ — ایک ہاتھ میں ستر آں اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر آگے بڑھو اور ساری دنیا میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دو۔ چنانچہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مسلمان لفظی یا عملی تلوار بازی کے اسی مشغلہ میں مصروف رہے ہیں۔ آج کل پاکستان اور کشمیر میں یہی منظر دیکھا جاسکتا ہے جہاں مسلم نوجوان دہشت گردی کے عمل میں مشغول ہیں اور پر جوش طور پر یہ ترانہ گارہے ہیں:

دل میں ہے اللہ کا خوف ہاتھ میں ہے کلاشنکوف (Kalashnikov)

اس رہنمائی میں بیک وقت دو غلطیاں تھیں۔ اس میں انتہائی معصومانہ طور پر یہ فرض کر لیا گیا کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں قرآن ہے اور ان کے دل میں اللہ کا خوف موجود ہے۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ تھا کہ صدیوں کے زوال کے نتیجہ میں مسترآن سے مسلمانوں کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا، اور قسادت کے نتیجہ میں ان کے دل اللہ کے خوف سے خالی ہو چکے تھے۔

ایسی حالت میں ضرورت تھی کہ لمبی اور خاموش جدوجہد کے ذریعہ جدید مسلم نسلوں کے دماغ میں دوبارہ مسترآن کی روشنی پیدا کی جائے اور ان کے دلوں کو دوبارہ خدا کے خوف سے کلپنے والا بنایا جائے۔ یہ ایک بے حد بھراؤنا کام تھا۔ مگر مسلم رہنماؤں نے اس داخلی محاذ پر محنت کیے بغیر خارجی نعروں پر قوم کو دوڑانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان کی ساری کوششوں کا انجام اس پھٹ کا سا ہوا جو دیکھ کر زدہ لکڑی کے اوپر لکڑی کر دی گئی ہو۔

اس رہنمائی میں دوسری بے باک غلطی یہ تھی کہ انہوں نے زمانہ کے منسرق کو نہیں سمجھا۔ قدیم زمانہ میں "سوار" طاقت کا نشان تھی، موجودہ زمانہ میں "علم" طاقت کا نشان ہے۔ مگر مسلم رہنما اندوہناک حد تک اس منسرق سے بے خبر رہے۔ انہوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت سائنس کے دور میں ہر طرف سوار کا ترانہ گانا شروع کر دیا۔

اس غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کی پوری نسل جنگ جویمانہ ذہنیت میں مبتلا ہو گئی۔ ہر شخص بس جنگ اور ٹکراؤ کی اصطلاحوں میں سوچنے لگا۔ جس کے پاس تلواری جنگ چھیڑنے کا موقع تھا۔ اس نے اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف تلواری جنگ چھیڑ دی۔ اور جن لوگوں کے پاس صرف الفاظ تھے، انہوں نے الفاظ کی لائقناہی بم باری کا مشغلہ اپنے لیے اختیار کر لیا۔

اس انداز کار کے نتیجہ میں نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب مسلمانوں میں وہی آوازیں مقبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہیں جو جنگ جویمانہ لہجے میں بولی گئی ہوں۔ تعمیر اور حقیقت پسندی کی بات مسلمانوں کو اپیل نہیں کرتی۔ جنگ جویمانہ نعروں پر پی انغور ان کی بیخبر جمع کی جاسکتی ہے مگر پراسن اور خاموشش پروگرام کے نام پر انہیں بلائیے تو آپ کا پنڈال بالکل سونا پڑا رہے گا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا پورا ادب اور ان کی تمام سرگرمیاں اسی بیخ پر قائم ہو گئی ہیں۔ ان کی ہر تحریک میں کسی نہ کسی اعتبار سے یہی روح کارسرا ہے۔ آپ ان کے جس

فکری یا عملی رخ کا مطالعہ کیجئے، ہر جگہ آپ کو اسی کی جھنکار سنائی دے گی۔

نثر کے دور میں شاعری، خاموش تدبیر کے دور میں خطابت، عملی منصوبہ بندی کے دور میں لفظی ہنگامہ آرائی۔ تعمیر کے دور میں تخریب، پُر اسن جدوجہد کے دور میں عسکری سرگرمی، سائنسی تفکیک کے دور میں روایتی تعسکیر، حقائق کی بنیاد پر اٹھنے کے دور میں خوش خیالیوں کی بنیاد پر اٹھنے کا خواب — سب اسی کے مظاہر ہیں، اور یہی مختصر طور پر موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنماؤں کی رہنمائی کا خلاصہ ہے۔ اس قسم کی ہر کوشش خلافت زمانہ حرکت (anachronism) کی مصداق تھی، اور خلافت زمانہ حرکت کبھی کسی کے لیے نتیجہ خیز نہ نہیں ہو سکتی۔

مقت کے کاروان کو دوبارہ متحرک کرنے کے لیے شاعری اور خطابت اور انشا پر داری کا انداز صرف اثنا نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔ اس قسم کی پرجوش لفظی کا نتیجہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک پھوٹی ہوئی قوم دوبارہ خوش فہمیوں کے گڑھے میں گر کر رہ جائے۔

اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ مقت کے افراد میں دوبارہ سچی دینی روح پیدا کی جائے۔ ان کو کلمہ گو، کی سطح سے اٹھا کر، کلمہ فہم کی سطح پر لایا جائے۔ تقلیدی ایمان کی جگہ ان کے اندر زندہ اور شعوری ایمان پیدا کیا جائے۔ ان کے عقیدہ کو دوبارہ منکری انقلاب بنا دیا جائے۔

دوسرا کام یہ ہے کہ مقت کو عصر حاضر کے تقاضوں سے باخبر کیا جائے۔ ایک روایت میں مومن کو بصیرت بزم صلتہ (اپنے زمانہ سے باخبر انسان، بتایا گیا ہے۔ یہ بلاشبہ انتہائی اہم ہے۔ اس کے بغیر ملت کا قائد اپنی مطلوب منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

اسی کے ساتھ ہی لازمی طور پر ضروری ہے کہ مسلمانوں کو ایک دائمی گروہ کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ کسی قوم کے اندر بلند فکری اور اعلیٰ حوصلگی کی خصوصیات ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ اس کے پاس کوئی برتر عالمی پیغام ہو جس کی تمام قوموں کو ضرورت ہو۔ کسی قوم کی سب سے بڑی نفسیاتی دولت اس کا یہ احساس ہے کہ اس کے پاس ایک اعلیٰ نظریہ ہے، ایک ایسا نظریہ جو اپنی صداقت اور نفع بخشی کی بنا پر اس قابل ہے کہ وہ تمام اقوام عالم تک پہنچے۔ یہ احساس ہی دراصل وہ سب سے بڑا سرچشمہ ہے جو کسی قوم کے افراد میں بلند ہمتی اور اولوالعزمی کے تمام اعلیٰ اوصاف پیدا کرتا ہے۔

مسلمانوں کو دعوت کی بنیاد پر کھڑا کرنا ایک طرف خدا کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کا

انتظام ہے۔ دوسری طرف بھی وہ عمل ہے جو مسلمانوں کے موجودہ وجود کو ختم کر کے انہیں سیلاب کی مانند رواں بنانے والا ہے یہی عمل انہیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ زندگی کی ہر شاہراہ میں داخل ہو جائیں۔

لارڈ لوتھین (۱۹۳۰-۱۸۸۲) برطانیہ کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنی وفات سے دو سال پہلے ۱۹۳۸ میں ہندوستان آئے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ پڑھا۔ اس خطبہ میں انہوں نے مسلمان نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

”یورپ اپنے سیاسی، معاشی، تمدنی اور عالمی مسائل کا تسلی بخش حل دریافت کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ آپ حضرات کا دعویٰ ہے کہ اسلام زندگی کا مکمل دستور اعلیٰ ہے۔ اور اس میں اجتماعی مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ اس لیے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بلاد مغرب میں جا کر وہاں کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کریں“

یورپ کے ایک ذمہ دار شخص نے ایک مسلم ادارہ میں یہ بات اب سے ۵۰ سال پہلے کہی تھی۔ مگر نصف صدی گزر گئی اور اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی قابل ذکر مسلمان نہیں اٹھا جو خدا کا دین لے کر اہل یورپ کے درمیان دیوانہ وار داخل ہو جائے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت مسلم شخصیتوں کے یورپ کے سفر ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ تمام اسفار صرف یورپ میں قیام کرنے والے مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں ذکر حقیقتہً یورپ کے ان اصل باشندوں کے درمیان جن کے ایک فرد لارڈ لوتھین تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ”اسلامی کیرکٹر“ کی حفاظت کے لیے ہمارے تمام چھوٹے بڑے لیڈر میدان جہاد میں سرگرم ہیں۔ مگر کسی لیڈر کو یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہونی کہ کیا وجہ ہے کہ پچھلے ۵۰ سال کے اندر علی گڑھ نے کوئی ایک قابل ذکر فرد ایسا پیدا نہیں کیا جو انگریزی زبان اور نئے علوم سے واقفیت حاصل کر کے یورپ جائے اور وہاں کے غیر مسلم باشندوں کو اسلام کا پیغام پہنچانے کا کام لے کر ”اسلامی کیرکٹر“ کی حفاظت کا مطلب اگر صرف یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے دانش اور ملازمت کا حق محفوظ رہے تو یہ اسلام کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ یہ اپنے قومی اغراض کے لیے اسلام کا نام استعمال کرنا ہے۔ اور جو لوگ اپنے قومی اغراض کے لیے اسلام کا نام استعمال کریں

وہ اللہ کے یہاں غضب کے مستحق ہوتے ہیں ذکر رحمت و مغفرت کے مستحق۔
 لارڈ لوٹین کی مذکورہ تجویز پر عمل کرنے کے لیے انگریزی دانی کی ضرورت تھی، اس لیے عام
 مسلم رہنماؤں کے لیے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں
 ایک اور دعوتی موقع پیدا کیا تھا، اور اس موقع کو استعمال کرنے کے لیے اپنی مادری زبان ہی
 کافی تھی۔ مگر یہاں بھی ہمارے رہنما صدنی صدنا کام رہے۔

یہ ارکان نوآبادیاتی نظام نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کی قومیں جدید طاقت کے زور پر ساری
 دنیا میں پھیل گئیں۔ اور جگہ جگہ انھوں نے اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس قسم کے لوگ خود اپنی ضرورت
 اور مسلمت کے تحت ہر جگہ کی مقامی زبان بھی سیکھتے تھے۔ مثلاً جو انگریز اس زمانہ میں ہندوستان
 آئے انھوں نے یہاں کی مقامی زبان بھی سیکھی اور یہ حیثیت اس زمانہ میں جس زبان کو
 حاصل تھی وہ اردو زبان تھی۔

جن ہندوستانیوں کی عمریں پچاس سال سے اوپر ہیں وہ بخوبی طور پر اس واقعہ کو جانتے
 ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے پہلے ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی
 زبان اردو تھی۔ تاہم جو لوگ بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں، ان کے سمجھنے کے لیے یہاں میں ایک
 حوالہ نقل کرتا ہوں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اردو زبان (Urdu Language)
 کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کی ملکی تقسیم سے پہلے اردو زبان
 شمالی ہند کی عمومی طور پر بولی جانے والی زبان تھی جو اس وقت ہندوستانی یا کھڑی بولی
 کہی جاتی تھی ۱

The spoken language, referred to before the 1947 partition as
 Hindustani or Khari Boli, was the lingua franca of northern
 India (X/297).

ایک واقعہ

میجر جنرل اجیت انیل ردما ۱۹۱۵ء میں ہندوستانی فوج میں داخل ہوئے۔ اب ان کی
 عمر ۹۰ سال ہو چکی ہے۔ ٹائٹس آف انڈیا (۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء) کے ایک اسٹاف رپورٹ سے بات
 چیت کرتے ہوئے انھوں نے پچھلے زمانہ کی اپنی بہت سی یادداشتیں بتائیں۔ انھوں نے

اس سلسلے میں جو واقعات بتائے ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا۔

۱۹۴۷ء سے پہلے جب وہ فوج کی باقاعدہ سروس میں تھے تو فیض احمد فیض بھی ان کے تحت کام کرتے تھے۔ فیض کا تعلق فوج کے رابطہ عامہ (Public relations) کے شعبے سے تھا۔ ایک بار فیض کے ذمہ یہ کام سپرد ہوا کہ وہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کا ہندستانی زبان میں ترجمہ کریں۔ فیض نے ترجمہ کر کے بھیج دیا۔ اس کے بعد فیض احمد فیض اور میجر جنرل ردرا دونوں وائس ریگل لاج (رائٹس پٹی بھون) بلائے گئے تاکہ وہ ادائیگی الفاظ کے معاملہ میں وائسرائے کی رہنمائی کر سکیں۔ اس کے بعد میجر جنرل ردرا کے الفاظ یہ ہیں :

When Faiz and myself called on the Viceroy to help him with the diction, Mountbatten was pacing up and down his room in the now christened Rashtrapati Bhawan rehearsing his speech. He was speaking Hindustani quite well, much to our surprise.

جب فیض احمد فیض اور میں وائسرائے کی ملاقات کے لیے گئے تاکہ الفاظ کی ادائیگی کے معاملہ میں ان کی مدد کریں، تو ماؤنٹ بیٹن اپنے موجودہ رائٹس پٹی بھون کے کمرے میں ادھر سے ادھر چل رہے تھے اور اپنی تقریر کو دہرا رہے تھے۔ اس وقت وہ بالکل صاف ہندستانی بول رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ہم کو سخت تعجب ہوا۔

یہ واقعہ ۱۹۴۷ء سے پہلے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب کہ ملک میں ہندستانی (یا اردو) کا غلبہ تھا۔ ملک کے اعلیٰ ترین حکام بھی اردو اور ہندستانی کو بولتے اور سمجھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہندستان کی اردو بولنے والی قوم اور حکمرانوں کے درمیان زبان کا وہ فاصلہ (Language gap) موجود نہ تھا جو آج پایا جا رہا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت داعی کی جو زبان تھی وہی مدعو کی زبان بھی تھی۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ داعیوں کے گروہ نے اس امکان کو ایک فیصد بھی استعمال نہیں کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے لیڈروں نے اس زمانہ میں ان حکمرانوں سے بے شمار ملاقاتیں کیں۔ مگر یہ تمام لیڈر ان حکمرانوں سے صرف مانگنے کے لیے ملتے تھے نہ کہ انہیں دینے کے لیے۔ وہ یہی کرتے رہے یہاں تک کہ وہ دور ختم ہو گیا جس میں اردو زبان نے عوامی اہمیت حاصل کی تھی۔

اردو اگرچہ اب بھی اس ملک میں باقی ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان رابطہ کی زبان کی حیثیت سے اس کی سابقہ اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ اب مسلمانوں کو ماضی کا نوحہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب انھیں یہ کرنا ہے کہ ملک کی قومی زبان نیز علاقائی زبانوں کو سیکھیں۔ تاکہ اردو کی سطح پر جو رشتہ ختم ہو گیا ہے اس کو دوسری زبانوں کی سطح پر دوبارہ حاصل کیا جاسکے۔

۔ ہی ماضی کی غلطی کی واحد تلافی ہے۔ مسلمانوں کو بین الاقوامی زبان بھی سیکھنا ہے اور اسی کے ساتھ ملکی اور قومی زبان بھی۔ اس طرح وہ موجودہ دنیا میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکتے ہیں۔ اور آج کی دنیا میں ایک داعی گروہ کی حیثیت سے نمایاں ہو سکتے ہیں۔

صراطِ مستقیم سے انحراف

وَأَنْ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
اور کہدو کہ یہ میری سیدھی شاہراہ ہے، پس تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستے سے جدا کر دیں گی۔ یہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچو۔
(الانعام ۱۵۴)

یہ حکم قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر آیا ہے۔ موجودہ زمانہ کے بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ صراطِ مستقیم یا السبیل سے مراد خدا کا دین اسلام ہے، اور متفرق راستوں اُسبُل سے مراد زندگی کے وہ راستے اور نظام ہیں جو انسان نے بطور خود وضع کئے ہوں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ السبیل اور اُسبُل دونوں سے مراد اسلام ہی کے طریقے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ السبیل سے مراد اصل دین ہے اور اُسبُل سے مراد فروع دین۔ اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم و دعوت میں سب سے زیادہ زور "السبیل" پر دیا جانا چاہئے نہ کہ "اُسبُل" پر۔ راستوں میں ایک راستہ وہ ہوتا ہے جو سیدھا اور چمڑا ہو۔ ایسا راستہ السبیل یا صراطِ مستقیم ہے۔ اور دوسرے راستے وہ ہیں جو منگھ جوتے ہیں اور اصل شاہراہ کے دائیں اور بائیں سے نکلنے ہیں۔ ان دوسرے راستوں کو اُسبُل کہا جاتا ہے۔ اسی طرح خدا کے دین کی ایک اصل اور اساس ہے۔ اور اس کے علاوہ اس کے کچھ فروع ہیں۔ اول الذکر کی حیثیت دین میں شاہراہ (صراطِ مستقیم) کی ہے، اور ثانی الذکر کی حیثیت اطراف کے راستوں (اُسبُل) کی۔

جو آدمی شاہراہ پر پلے وہ اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔ اور جو آدمی متفرق راستوں پر دوڑے وہ درمیان ہی میں بھٹک جائے گا، وہ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح دین کا جو اصلی اور اساسی حصہ ہے وہ گویا دین کی شاہراہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اسی کو سب سے زیادہ اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔ اپنے قول و عمل میں وہ سب سے زیادہ اسی کا اہتمام کرے۔ اس کے بعد جو فروع دین ہیں وہ گویا اس کی اُسبُل ہیں۔ اہل دین کو اس سے منہ کیا گیا کہ وہ ان فروع پر زیادہ توجہ دینے لگیں۔ وہ اصل دین کے بجائے فروع دین کو اپنے لئے زور و تاکید کا موضوع بنا لیں۔

ابن علی نے اتباعِ سُبُل کی تشریح اَشْدُّ وَذِي الْفُرُوعِ (افترطی ۱۱۳۷/۷) کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی اصولی چیزوں کے بجائے فرعی چیزوں کی طرف چل پڑنا۔ یہ نہایت صحیح تفسیر ہے۔ آجکل کی زبان میں اس کو تفسیرِ تاکیید (shift of emphasis) کہا جاسکتا ہے۔

تفسیرِ تاکیید (shift of emphasis) کیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سن لو، آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ ٹکڑا درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے، اور اس ٹکڑے میں خرابی آجائے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ سن لو کہ گوشت کا یہ ٹکڑا انسان کا دل ہے (الْأَوَانُ فِي الْجَسَدِ مُضْفَةٌ إِذَا صَلَّحَتْ صَلَّحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْعُلْبُ)۔

یہ حدیث واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ نظام (system) کے بگاڑ کا اصل سبب فرد (individual) کا بگاڑ ہے۔ اب اگر نظام میں بگاڑ پیدا ہو اور اس کے بعد لوگ ایسا کریں کہ وہ نظام کی اصلاح کے نام پر نظام سے منکرانے لگیں تو یہ اتباعِ سُبُل کی مثال ہوگی۔ اور اگر نظام کے بگاڑ کی اصلاح کے لئے فرد کی درستگی پر زور دیا جائے تو یہ وہ مطلوب چیز ہوگی جس کو قرآن میں صراطِ مستقیم کا اتباع کہا گیا ہے۔

اہل ایمان کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ اصولی چیزوں کو غیر اہم حیثیت دے دیں اور ان چیزوں پر زیادہ زور دینے لگیں جن پر حقیقتاً زیادہ زور نہیں دینا چاہئے۔ ایسا کرنے سے دین کا فوکس بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے درمیان ایسی سرگرمیاں جنم لیتی ہیں جو بظاہر غیر اسلامی نہیں، مگر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ لوگوں کو حقیقی مطلوب الٰہی سے دور کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

یہ برائی اکثر ایک "اور" کے ذریعہ آتی ہے۔ یعنی ایک عطف (conjunction) کے ذریعہ اصل کے ساتھ فرع کو جوڑ لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مسلم جماعت اٹھی۔ اس نے "اور" کی تدبیر سے انقلاب کو ایمان کے ساتھ شامل کر دیا۔ اس نے "ایمان اور انقلاب" کا نعرہ دیا۔ اس جملہ میں "اور" بظاہر ایک سادہ سا عطف کا معاملہ ہے۔ مگر اس عطف نے پورے دین کا ڈھانچہ بدل دیا۔ اس نے سیاسی

انقلاب کو وہ اہمیت دے دی جو فرد انسانی میں نفسیاتی انقلاب کی ہوتی ہے۔ حالانکہ دونوں کی حیثیت دین میں یکساں نہیں۔ اس عطف کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے دین کا نقشہ بجز ذکر رہ گیا۔

دین میں ایمان کی حیثیت مطلوب اصلی کی ہے۔ اور سیاسی انقلاب کی حیثیت مطلوب اضافی کی۔ مگر اس عطف نے دونوں کو برابر کا درجہ دے دیا۔ بلکہ بگڑے ہوئے ذوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست نے عطا ہر دوسری چیز پر فوقیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد سیاسی انقلاب کے لئے وہ دھوم برپا کی جانے لگی جس کا خدا نے اہل ایمان کو مکلف نہیں کیا تھا۔ اور جب موسس ہوا کہ شرعی حدود کے اندر حریف لیڈروں کا مقابلہ مشکل ہے تو اس کے بعد ایسے طریقے اختیار کئے گئے کہ خدا کا دین ایک کمپیل بن کر رہ گیا۔

فعرے اور جھنڈے اور جلوس اور مظاہرہ کی سیاست کو پہلے گند اقرار دے کر اس کو قابل ترک بتایا گیا تھا مگر بعد کو پوری طرح اس کو اختیار کر لیا گیا۔ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ اسلامی حکومت معاشرہ کی تدریجی اصلاح کے ذریعہ بنتی ہے اور اب اچانک سیاسی انقلاب کا نظریہ اپنایا گیا۔ پہلے انکشن میں امیدواری کے طریقہ کو ناجائز بتایا گیا تھا مگر اب اس کو عین جائز قرار دے لیا گیا۔ پہلے عورت کی مکرانی کو غیر شرعی بتایا گیا تھا اور اب عورت کی مکرانی کے حق میں شریعت سے فتویٰ حاصل کر لیا گیا۔ وغیرہ۔

اس قسم کی تمام خرابیاں جو اس تحریک کے اندر پیدا ہوئیں، ان کا اصل سبب وہی انحراف تھا جس کو قرآن میں اتباع سبیل کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح اتباع سبیل کی ایک مثال وہ لوگ ہیں جو اسلامی دعوت کو "ایمان اور احترام اکابر کی دعوت" کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اسلام میں صحابہ کرام، علماء عظام، اکابر ملت، سب کا احترام ضروری ہے۔ ان میں سے کسی پر تنقید نہیں کی جاسکتی۔ ان کا صرف اتباع کیا جاسکتا ہے۔

ان حضرات کی غلطی یہ ہے کہ جہاں حق اسٹاپ تھا، وہاں انھوں نے کاما لگا دیا۔ اصحاب رسول جہاں شہہ تنقید سے بالاتر ہیں، ان کا مطلق احترام ضروری ہے۔ مگر رسول اور اصحاب رسول کے بعد اس معاملہ میں حق اسٹاپ لگا ہوا ہے۔ ان کے بعد کاما لگا کر کسی بھی گروہ کو اس صف میں شامل

کرنا درست نہیں۔ اس معاملہ میں صحیح شرعی مسلک وہی ہے جو امام ابوحنیفہ سے منقول ہے۔ یعنی صحابہ کے بعد جو لوگ ہیں وہ بھی آدمی اور ہم بھی آدمی (ہم رجال و نحن رجال)۔

"ایمان اور احترام اکابر" کے الفاظ میں اسلامی دعوت کی تعمیر اتباعِ سبیل کی سب سے زیادہ خطرناک صورت ہے۔ اس انحراف سے سادہ طور پر صرف ذہن کا نوکس نہیں بدلتا، بلکہ وہ آدمی کو شرک کے قریب پہنچا دیتا ہے۔

اسلام میں حُبِ شدید صرف اللہ کے لئے ہے، مگر یہ ذہن آدمی کی حُبِ شدید کا رخ مزعومہ اکابر کی طرف کر دیتا ہے۔ اسلام میں غیر مشروط اتباع کا حق صرف اللہ کے رسول کے لئے ہے، مگر یہ ذہن آدمی کو اپنے اکابر کا غیر مشروط متبع بنا دیتا ہے۔ اسلام میں صرف اللہ اور رسول کا کلام حبت کی حیثیت رکھتا ہے، مگر اس ذہن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے اکابر کے طفولیات اور اقوال کو آخری حبت کا درجہ دے دیتا ہے۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق، اللہ نے صرف اپنے رسول کو معصوم عن الخطا کا درجہ دیا ہے، مگر اس ذہن کے لوگ اپنے خود ساختہ اکابر کو معصوم عن الخطا افراد کی فہرست میں شامل کر دیتے ہیں۔ وغیرہ

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جو اصلاحی تحریکیں اٹھیں، وہ زیادہ تر "اتباعِ سبیل" کی اسی غلطی کا شکار رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحریکوں کی غیر معمولی دھوم کے باوجود، ان سے حقیقی دینی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ غور کیجئے تو اتباعِ سبیل کی ان تمام مثالوں میں "عطف" کی مذکورہ تدریجی کھڑکی نظر آئے گی۔

کسی نے کہا کہ مسلمانوں کو دو چیزوں کی ضرورت ہے — "قرآن اور سائنس"۔ بظاہر یہ ایک بے ضرر ترکیب ہے۔ مگر اس کا عطف درست نہیں۔ اس عطف نے سائنس کو قرآن کے مساوی قرار دے دیا۔ حالانکہ سائنس خادم قرآن ہے نہ کہ مساوی قرآن۔ کسی نے "ایمان اور عسکریت" کا انھودیا۔ یہ تسویہ بھی درست نہ تھا۔ کیوں کہ عسکریت ایمان کا مساوی حصہ نہیں ہے۔ وہ بلوقت ضرورت و فساد کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ ایمان اصلی ہے اور عسکریت صرف ضمنی۔ ان چیزوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کا رخ ایسی سمت میں موڑ دیا جو پکے دین کی طرف جانے والا نہ تھا۔

"عطف" کے ذریعہ اتباعِ سبیل کی خرابی پیش آنے کی بے شمار صورتیں ہیں۔ مثلاً اگر آپ

ایک اسلامی ترمیم اٹھائیں اور اس کو "ایمان و یقین کی دعوت" کا نام دیں۔ تو یہ بھی اتباع سبیل ہی کی ایک صورت ہوگی۔ کیوں کہ اسلامی دعوت کی یہ تعبیر اسلام کی ثابت شدہ تعبیر کے مطابق نہیں۔ اگر آپ قرآن کو یہ ہاننے کے لئے پڑھیں کہ اس کا نکتہ دعوت کیا ہے تو سارے قرآن میں کہیں بھی آپ یہ نہ پائیں گے کہ قرآن اسلام کی دعوت کو "ایمان اور یقین کی دعوت" کے الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ اس کے بہائے قرآن میں اس سلسلہ میں جو الفاظ ملتے ہیں، ان کے مطابق اسلامی دعوت کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ اس کو "ایمان اور تقویٰ کی دعوت" یا "ایمان اور عمل صالح کی دعوت" کہا جائے۔

اسلامی دعوت کی تعبیر کے لئے اگر قرآنی لفظ کا استعمال کیا جائے تو اس سے صحیح ذہن بنتا ہے اور اگر قرآنی تعبیر کے علاوہ کوئی دوسری تعبیر اختیار کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ذہن کا فوکس بدل جائے گا۔ اس کے بعد صحیح اور مطلوب ذہن کی تشکیل ممکن نہیں۔

اسلام کی دعوت کو "ایمان و یقین کی دعوت" کے اسلوب پر چھلانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کا ذہن پوری طرح قرآن و سنت کے انداز پر نہیں بنے گا۔ بلکہ زیادہ تر ایک اور ڈھنگ پر بننے لگا جس کا یہ اسلوب تقاضا کرتا ہے۔

ایسے لوگوں کے اندر یقین (صحیح تر لفظ میں خوش فہمی) کا مزاج تو آئے گا، مگر حقیقی معنوں میں خوفِ خدا کا مزاج ان کے اندر نہیں آئے گا۔ ذکر اور عبادت جیسے کچھ ظاہری اعمال تو ان میں پیدا ہوں گے مگر وسیع تر معنوں میں عمل صالح ان کی زندگیوں کے اندر پیدا نہیں ہوگا۔ اپنے اکابر کی عظمت سے تو وہ ضرور سرشار ہوں گے مگر خداوند ذوالجلال کی عظمت سے سرشاری ان کے یہاں پائی نہیں جائے گی۔ وہ تلاوت قرآن یا حفظ قرآن کے مشائخ تو نظر آئیں گے مگر تدبر قرآن یا مطالعہ قرآن سے انہیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ کسی نئی اعمال کی اہمیت ان کی سمجھ میں آنے لگی مگر کیفیاتی اعمال کی اہمیت کو وہ دیکھ سکیں گے۔ وہ سکون و اطمینان والے دین کو جانیں گے مگر وہ اس دین سے واقف نہیں ہوں گے جو آدمی کو اندیشہ اور اضطراب کے طوفان میں مبتلا کر دیتا ہے۔

قرآن میں پیغمبر کی زبان سے ارشاد ہوا ہے کہ بے شک میرا رب ایک سیدھے راستے پر ہے (إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ) (ہود ۵۶) دوسری جگہ ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ یہ راستہ سیدھا مجھ

تک پہنچاتا ہے (لہذا صراطِ عائشہ مستقیم ، الجہر ۳۱) اسی طرح فرمایا کہ اللہ تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے اور بعض راستے کج ہیں (وعلی اللہ قَضَا السَّيِّئِلِ وَمِنْهَا جَائِشْرٌ ، انزل ۹) سیدھی شاہراہ اپنے مسافر کو بے روک ٹوک منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ لیکن اگر آدمی اطراف کی چمکند ٹنڈیوں پر چل پڑے تو وہ اِدھر اِدھر بھٹک جائے گا ، وہ مطلوبہ منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی تشبیہ سے مذکورہ آیتوں میں دین کے معاملہ کو سمجھایا گیا ہے۔

دین کی اصل تعلیمات نہایت واضح ہیں۔ وہ سیدھی شاہراہ کی مانند ہیں۔ جو آدمی ان تعلیمات کو ان کی اصل صورت میں پکڑ لے وہ ان پر چلتے ہوئے خدا تک پہنچ جائے گا۔ اور جو شخص فسوی مسائل اور خود ساختہ تعبیرات کو لے کر دوڑنے لگے ، وہ راستہ ہی میں بھٹک کر رہ جائے گا۔ وہ کبھی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

خدا کے دین میں کسی بھی قسم کی تبدیلی آدمی کو مغرب کر دیتی ہے ، وہ صحیح رخ کے بجائے غلط رخ پر چل پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ دین میں معمولی قسم کا فرق کرنا بھی آخر کار سمیٹاؤ تک پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے۔

مثلاً قرآن کے مطابق اگر آپ لوگوں کو اقامت دین کی طرف بلائیں تو اس سے عمل کا صحیح رخ بنے گا۔ لیکن اگر آپ اپنی خود ساختہ تشریح سے اقامت دین کو تنفیذ دین کے ہم معنی قرار دینے لگیں تو آپ کا سارا عمل غلط رخ پر پڑ جائے گا۔ حدیث کے مطابق ، اگر آپ محاسبہ نفس پر زور دیں تو اس سے صحیح دینی مزاج زندہ ہوگا ، لیکن اگر آپ محاسبہ نفس کے بجائے محاسبہ کائنات کا نعرہ لگانا شروع کر دیں تو ایسا نعرہ پورے دین میں غلغلے کا باعث بن جائے گا۔

اسی طرح محبت رسول کے لئے عشق رسول کا لفظ بولنا ، مسجد اقصیٰ کو بتانے کے لئے قبلۃ اول کی زبان استعمال کرنا ، جہاد دین کے ساتھ جہاد حریت کا اضافہ کرنا ، مرنے والوں کے نام کے ساتھ "شہید" کا لفظ شامل کرنا ، اطاعت رسول کے بجائے حرمت رسول پر تفریکرنا ، اتحادی کے ساتھ غیرت ملی کی پکار بلند کرنا ، اور اس طرح کی دوسری تمام تبدیلیاں بلاشبہ بدعت اور اتباع سبل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ آدمی کو بے راہ کرنے والی ہیں ، وہ ہدایت کے راستہ پر لے جانے والی نہیں۔

اسی طرح شہادت کلمہ کو تلفظ کلمہ کے ہم معنی بتانا، اطاعت الہی کو حکومت الہیہ بنا کر پیش کرنا، عبادت میں شتووع پر زور دینے کے بجائے فضائل اور مسائل پر زور دینا، ایمان اور تقویٰ کے پیغام کو ایمان اور یقین کا پیغام بنانا، غیر مسلموں کو دعوت کے بجائے جہاد کا موضوع قرار دینا، مسلمانوں کی داخلی خرابیوں کے نام پر خارجی احتجاج کے ہنگامے برپا کرنا، وغیرہ۔ یہ سب کی سب دین کی شاہراہ سے ہٹ کر متفرق راستوں میں دوڑنے کی صورتیں ہیں۔ ایسی ہر سرگرمی صرف ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے، وہ ہدایت اور صلاح کی طرف لے جانے والی نہیں۔

خدا کے دین کو اس کی خالص صورت میں لیا جائے تو وہ آدمی کو خدا تک پہنچاتا ہے۔ اور اگر خدا کے دین میں تبدیلی کر کے اس کو اختیار کیا جائے، تو یہ تبدیلی خواہ بظاہر کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، وہ آدمی کو صحیح راستے سے بھٹکا کر خدا سے دور کرنے کا سبب بن جائے گی۔

حدیث میں یہ انتباہ دیا گیا ہے کہ پچھلی امتوں میں بعد کے زمانہ میں بگاڑ آیا، اسی طرح امت مسلمہ پر بھی بعد کے زمانہ میں بگاڑ آئے گا۔ تاہم یہ بگاڑ کبھی اس معنی میں نہیں آتا کہ امت کے افراد دین کو بالکل چھوڑ دیں۔ وہ ہمیشہ اُس صورت میں آتا ہے جس کو قرآن میں اتہام صراط کے بجائے اتہام شبل کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی لوگوں کے نزدیک اصول دین کا غیر اہم بن جانا، اور ان کے درمیان فروغ دین کا اہمیت اختیار کر لینا۔

امت کے زوال اور بگاڑ کے زمانہ میں ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ فروغ دین پر زور بڑھ جاتا ہے اور کلیات دین کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں کرنے کا کام یہ ہے کہ دین کی کلیات کو زندہ کیا جائے۔ سارا زور لوگوں کے اندر اساسی باتیں بیدار کرنے پر دیا جانے لگے۔

دین کی اساس کو زندہ کیا جائے تو اس کی فروغ اپنے آپ زندہ ہو جائیگی۔ لیکن اگر فروغ کو زندہ کرنے پر سارا زور دیا جائے لگے تو لوگوں میں کچھ ظاہری چیزیں تو پیدا ہو سکتی ہیں، جو حقیقی دین کا اس طرح زندہ ہونا ممکن نہیں۔

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

عبدالحکیم انصاری ایم اے سرائیہ (مصلح اعظم گڑھ) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنے وطن قصبہ سرائیہ کے بارہ میں بتایا کہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے پہلے کی بات ہے۔ وہاں ہمارے مملکتی مسجد میں لیون کا ایک درخت تھا۔ وہ خوب پھلتا تھا۔ جمع کو جب ہم لوگ فجر کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتے تو ہم دیکھتے کہ درخت کے نیچے کی زمین کچے کچے لیموؤں سے بٹی ہوئی ہے۔

موزن کے ذریعہ کام تھا کہ وہ تمام لیونوں کو چن کر مسجد کی ایک کھلی الماری میں رکھ دیتا۔ محلہ کے جس آدمی کو لیون کی ضرورت ہوتی وہ ایک پیسہ مسجد کی الماری میں رکھ کر ایک لیون اپنے لیے لے لیتا۔ یا درخت سے لیون توڑ کر فی لیون ایک پیسہ کے حساب سے اس کی قیمت الماری میں ڈال دیتا۔ یہ جمع شدہ پیسہ مسجد کی ضرورتوں میں کام آتا تھا۔

عبدالحکیم صاحب نے بتایا کہ مسجد کا یہ نظام میرے بچپن سے جاری تھا۔ کبھی اس میں فرق نہیں آیا مگر آزادی کے انقلاب کے بعد دنیا بدل گئی۔ لیون تو اب ختم ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ مسجد کے ذمہ داروں نے پھیتے کا درخت لگا دیا۔ حسن اتفاق سے پھیتے بھی خوب پھل دینے لگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ پھیتے کا ایک پھل بھی پڑے پڑے نہیں پختا تھا۔ محلہ کے لوگ ایک ایک کر کے سارا پھل توڑ لے جاتے۔ کسی کے دل میں شاید اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ یہ مسجد کی چیز ہے اور اس کی قیمت اس کو مسجد میں جمع کرنا چاہیے۔ پھیتے توڑنے والے ایک لڑکے کو ایک بار دیکھ لیا گیا۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ تم مسجد کا پھل کیوں اس طرح توڑتے ہو۔ اس کا جواب یہ تھا: سارے لوگ توڑتے ہیں کیا صرف ہم توڑتے ہیں جو آپ ہم سے سوال کر رہے ہیں (المجمیۃ وکیل، دہلی، ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

یہ ایک علامتی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ پچاس سال پہلے مسلمانوں کی اخلاقی حالت کی تھی اور اب مسلمانوں کی اخلاقی حالت کیا ہو گئی۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ۱۹۴۷ء کو حد فاصل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے دور میں ہر جگہ کے مسلمانوں کا اخلاقی حال وہی تھا جو مذکورہ مثال میں نظر آتا ہے، اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہر جگہ کے مسلمانوں کا اخلاقی حال دوبارہ وہی ہو گیا ہے جو مذکورہ مثال میں بعد کے دور کے لیے بتایا گیا ہے۔

دو دوروں میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب بالکل سادہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے دور میں مسلم آبادیوں میں وہ نظام کم و بیش موجود تھا جو اس معاملہ میں سماجی چیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام۔ یہ نظام کسی سماج میں گویا سماج کا اخلاقی چیک ہے۔ جہاں یہ نظام قائم ہو، وہاں کے لوگوں میں اجتماعی اخلاقیات موجود رہیں گی۔ اور جہاں یہ نظام ختم ہو جائے وہاں اجتماعی اخلاقیات کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کا ایک مستقل اصول ہے۔ یعنی باہمی زندگی میں ایک دوسرے کو معرفت کی تلقین کرنا اور لوگوں کو منکرات سے روکنا۔ اس کا مقصد وہی چیز ہے جس کو ہم نے اخلاقی چیک کہا ہے۔ اس نظام کو ہر حال میں مسلم سماج کے اندر قائم رہنا چاہیے۔ کسی مسلم سماج کا اس سے خالی ہونا پورے سماج کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا دیتا ہے۔

یہاں ”نظام“ سے مراد کوئی رسمی یا قانونی ڈھانچہ نہیں ہے۔ اس سے مراد تقریباً وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں سماجی روایت کہا جاتا ہے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مزاج معاشرہ کے افراد میں مستقل روایت کے طور پر شامل ہو جائے۔ سماج کا اجتماعی ضمیر اس حد تک بیدار ہو کہ وہ ماحول کی اخلاقی برائی کے معاملہ میں غیر جانبدار نہ رہ سکے۔ وہ بے چین ہو کر اس کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

یہ ایک لازمی فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی اہمیت خدا کے دین میں اتنی زیادہ ہے کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس حکم پر عمل نہیں کیا تو وہ اللہ کے نزدیک لعنت کے مستحق ہو گئے (المائدہ ۸۹) اسام ابو داؤد نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم لوگوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا تو یقیناً اللہ تم پر اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح اس نے یہود کے اوپر لعنت کی

وَلْيَلْعَنَنْتُمْ كَمَا لَعَنْتُمْ) المائدہ ۸۷، القرآن ۲۵۲/۶

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا ہے۔ یہ داخلی اصلاح کا ایک عمل ہے۔ موجودہ زمانہ میں کچھ لوگ اس کو احتساب عالم کے ہم معنی قرار دے کر تقریر و خطابت کی دھوم مچائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک لغو بات ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد احتساب معاشرہ ہے نہ کہ احتساب عالم۔ مزید یہ کہ اس کا تعلق حکومت سے بھی نہیں۔ یہ ہر مسلم معاشرہ میں اسی طرح جاری رہنے والا عمل ہے جس طرح اذان

اور نماز کا عمل ہر مسلم معاشرہ میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

امرا بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مطلب یہ ہے کہ مسلم معاشرہ کے افراد اپنے آس پاس کے مسلمانوں کی حالت سے بے تعلق بن کر نہ رہیں۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے مقتصد بنے رہیں۔ جب بھی ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر کوئی زیادتی کرے۔ جب بھی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جان، مال، آبرو کو کوئی نقصان پہنچائے تو فوراً دوسرے مسلمان حرکت میں آجائیں۔ وہ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کے حامی بن جائیں اور ہر قیمت پر معروف کو قائم کرنے اور منکر کو مٹانے کی کوشش کریں۔

اس معاملہ میں پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مسلم معاشرہ کے لوگ اپنے افراد کا سختی سے محاسبہ کریں۔ وہ عملی دباؤ کے ذریعہ ظالمانہ حالت کو ختم کریں اور حق دار کو اس کا حق دلوائیں۔ اگر بالفرض اس قسم کی عملی کارروائی کا موقع نہ ہو تو مسلمانوں کے اوپر فرض کے درجہ میں یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی زبان سے غلط کارکنوں کی کھلی مذمت کریں۔ وہ تحریر و تقریر کے تمام ممکن ذرائع کو استعمال کر کے اس کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار کریں۔

جس مسلم معاشرہ کے افراد اپنی داخلی خرابیوں کے معاملہ میں ایسا نہ کریں وہ بلاشبہ مجرم ہیں۔ قرآن و حدیث کی صراحتوں کے مطابق، وہ خدا کی رحمت سے محروم کر دیے جائیں گے، خواہ دین کے نام پر بظاہر ان کے یہاں کتنی ہی دھوم مچی ہوئی ہو۔ خدا کو وہ دین مطلوب ہے جو امرا بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ہو نہ کہ وہ دین جو اس کے بغیر ہو۔

ہجرت سے پہلے مدینہ کے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے اوپر آپ نے انہیں میں سے کچھ ننگراں افراد مقرر کیے جن کو نقیب یا کنیل کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ مدینہ کے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی نگرانی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ مدینہ میں مسلمانوں کی حیثیت صرف ایک "اقلیت" کی تھی، جب کہ مدینہ میں ابھی "اسلامی حکومت" قائم نہیں ہوئی تھی (البدایہ والنہایہ ۲/۶۲-۶۱)۔ یہ امرا بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پہلا نظام تھا جو اسلام کی تاریخ میں باقاعدہ طور پر قائم کیا گیا۔ اس کے بعد مسلمان جہاں بھی آباد ہوئے اور دنیا کے جس حصہ میں بھی انہوں نے اپنی بستیاں بنائیں ہر جگہ یہ نظام بھی ضرور قائم رہا۔ کہیں باقاعدہ صورت میں کسی شخص کو مقرر کیا گیا اور اس کو حق دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے معاملات کی دینی اور اخلاقی نگرانی کرے۔ جہاں اس قسم کا تقرر نہیں کیا گیا وہاں بھی رسمی

کوئی بزرگوں کے وسیلہ کو سب سے زیادہ اہم بنا کر پیش کر رہا ہے۔ کوئی سیاسی اسلام کا جھنڈا اٹھانے ہوئے ہے۔ کوئی فضائلِ اسلام کا چرچا کرنے میں مشغول ہے۔ کوئی مسائلِ اسلام کا دفتر کھولے ہوئے ہے۔ کسی کا اسلام تاریخی فخر ہے۔ کوئی احتسابِ کائنات کا نعروں کا گارڈ ہے۔ کوئی ملی تشخص کی حفاظت کے نام پر لوگوں کو جمع کر کے تقریر کر رہا ہے۔ کوئی دوسروں کے ساتھ مناظرہ بازی میں مشغول ہے، وغیرہ۔

مگر تحریکوں اور جماعتوں اور اداروں کے اس طوفان میں کوئی بھی نہیں جو ملت کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دینی فریضہ ادا کرے۔ یا لوگوں کے اندر اس کی روح بیدار کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہر ایک کی نظر صرف اپنے مفاد پر ہے۔ دوسرے مسلمانوں کے بارے میں ہر ایک غیر جانب دار بنا ہوا ہے۔

آج ہر مقام پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی زیادتی کا شکار ہو رہا ہے۔ ہر جگہ ایک مسلمان کی جان اور مال اور آبرو دوسرے مسلمان کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔ مگر کوئی قابلِ ذکر مسلمان یا کوئی قابلِ ذکر مسلم گروہ مظلوم مسلمان کی مدد پر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ نظمی مذمت کے درجہ میں بھی کوئی اس کے لیے کھڑا ہونے والا نہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے خود ساختہ اسلام میں گمن ہو کر قرآن کی اس آیت کی تصویر بنا ہوا ہے: انھوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی پر وہ تازاں ہے (المومنون ۵۳)

۱۹۴۷ء سے پہلے کے دور میں مسلم معاشروں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو ماحول تھا وہ ماضی کے تسلسل کا نتیجہ تھا۔ وہ دور اول سے ایک اسلامی رواج کے طور پر چلا آ رہا تھا۔ مگر اس طرح کے رواج ہمیشہ مردِ زمانہ سے کمزور ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ آخر کار ختم ہو جاتے ہیں۔ ”۱۹۴۷ء“ گویا انحطاط کے اس لمبے عمل کی تکمیل تھی۔ ”آزادی“ کا انقلاب ”پابندی“ کی ہر روایت کو بہا لے گیا۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں عام ملکی سماج کی بھی تمام بندش والی روایتیں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اسی طرح مسلم سماج سے بھی مذکورہ اسلامی روایات کا خاتمہ ہو گیا۔

اب ضرورت تھی کہ اس روح کو از سر نو زندہ کیا جائے۔ مسجد اور مدرسے اور جماعتیں اور ادارے سب کے سب زور و شور کے ساتھ اس کے لیے تحریک اٹھائیں۔ جس طرح زلزلہ زدہ سبھی کو از سر نو بنانے کے لیے ہر طرف تعمیری سرگرمیاں جاگ اٹھتی ہیں، اسی طرح مسلم سماج میں از سر نو

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم کرنے کے لیے تمام اہل دین متحرک ہو جاتے۔ یہاں تک کہ دوبارہ گزری ہوئی روایت معاشرہ میں قائم ہو جائے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔

اس مدت میں مسلم رہنماؤں نے اسلام کے نام پر بہت سی دھواں دھار تحریکیں اٹھائی ہیں۔ مثال کے طور پر خلافت تحریک، جہاد حریت کی تحریک، تقسیم ملک کی تحریک، شاہ بانو (مسلم پرسنل لار) تحریک، بابر میسج تحریک، وغیرہ۔ مگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقصد کے تحت کبھی کوئی حقیقی تحریک نہیں اٹھائی گئی۔ اگر بروقت اسی نوعیت کی طاقت ور تحریک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بھی اٹھائی جاتی تو اس کے بعد یقیناً ایسا ہوتا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ روایت دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ مسلم معاشرہ میں قائم ہو جاتی۔ دوبارہ ہمارے معاشرہ میں وہی اخلاقی دور لورٹ آتا جو ۱۹۴۷ء سے پہلے ”سرائیم“ کے قصبہ میں موجود تھا۔ مگر آج وہ کہیں موجود نہیں۔

تقسیم کے بعد جب ہندو اکثریت نے مسلمانوں کے اوپر ”زیادتیاں“ کیں تو ان زیادتیوں کے خلاف مسلمانوں میں طوفان خیز ہنگامے جاری ہو گئے۔ تمام مسٹر قائد اور تمام مولوی قائد باہر نکل آئے۔ ہر طرف سرگرمیوں کا سیلاب اٹھ پڑا۔ دوسری طرف ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر جو زیادتیاں کر رہا ہے وہ مذکورہ ہندو زیادتیوں سے ہزاروں گنا زیادہ ہے، مگر ان مسلم زیادتیوں کے خلاف آج تک کوئی ایک بھی باقاعدہ تحریک نہیں اٹھی، کسی بھی قابل ذکر مسلمان کی نیند اس کی وجہ سے حرام نہیں ہوئی۔ اس صورت حال کے باقی رہتے ہوئے مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔ ان کا کوئی بھی معاملہ درست ہونے والا نہیں۔

ملت مسلمہ کے احیاء کے لیے ہمارا کوئی بھی منصوبہ صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ اس کے ساتھ مسلم معاشرہ میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا نظام قائم کیا جائے اور اس کو موثر انداز میں چلایا جائے۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ مسلم رہنما اور مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ اس دینی شعبہ کو بھی اسی طاقت کے ساتھ رائج کرے جس طاقت کے ساتھ وہ دوسرے مسلم مسائل کے لیے کام کر رہا ہے۔

۱۔ مسلمانوں کے درمیان جب تک معرفت کی تلقین کرنے اور منکر سے روکنے کا ماحول قائم نہ ہو مسلمانوں کی آپس کی رنجشیں ختم نہ ہوں گی، اور آپس کی رنجشوں کو ختم کیے بغیر ان کے درمیان حقیقی اتحاد

قائم نہیں ہو سکتا۔ اور جب ملت کسی منصوبہ کے لیے متحدہ کوشش کرنے کی پوزیشن ہی میں نہ ہو تو اس میں وہ کامیابی کس طرح حاصل کر سکتی ہے۔

بار بار کا تجربہ ہے کہ ملت کے افراد ایک مٹی کام کے لیے اٹھے مگر افراد ملت کے عدم اتحاد کی وجہ سے اس کام کے لیے موثر جدوجہد نہ کی جاسکی۔ اگر کبھی رظا ہر وقتی اتحاد قائم ہوا تو باہمی رنجشوں کی وجہ سے بہت جلد وہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گیا۔ باہمی رنجشیں اتحاد کی قائل ہیں، اور امر بالمعروف، نہی عن المنکر باہمی رنجشوں کا قاتل۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نہایت گہرا تعلق اتحاد کے سلسلے سے ہے۔ اتحاد کسی قوم کی طاقت ہے۔ اور اتحاد کسی قوم میں صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ اس کے درمیان باہمی اصلاح کا وہ نظام قائم ہو جس کا شرعی نام الامر بالمعروف والنہی عن المنکر ہے۔

ہر انسانی گروہ میں ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اپنے شخصی عزائم کے تحت سرکشی کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک بھائی کے اوپر زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر قوم کے دوسرے افراد فوراً مظلوم بھائی کی مدد کے لیے پہنچیں۔ وہ زیادتی کرنے والے شخص کی مذمت کریں۔ اس کو اس کے ظالمانہ عمل سے روکیں۔ تو ماحول اس سے بچ جاتا ہے کہ اُس کے اندر باہمی نفرتیں جنم لیں جو اتحاد کی قائل ہیں۔ اس کے برعکس ماحول میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کی فضا پیدا ہوتی ہے جو گویا قومی اتحاد کی موافق زمین ہے۔

۲۔ ہندستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ فرقہ دارانہ فساد ہے۔ یہ فسادات ملت کی ترقی کے ہر منصوبہ کو ناکام بناتے ہوئے ہیں۔ اور ان فسادات کے ذر گنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم نہیں۔

یہ فسادات کیوں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ تقریباً ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اکثریتی فرقہ کے کچھ لوگ ایک مظاہرہ کرتے ہیں۔ مثلاً وہ جلوس نکالتے ہیں اور اس میں نامناسب نعرے لگاتے ہیں۔ اس قسم کے جلوس اور نعروں کا واحد حل اعراض ہے۔ جہاں بھی اعراض کی گئی وہاں کبھی کوئی فساد نہیں ہوا۔ پورے ملک میں ایسی کوئی ایک مثال موجود نہیں کہ مسلمانوں نے فی الواقع اعراض کیا ہو، اس کے باوجود فساد ہو جائے۔

مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے کچھ جاہل اور نادان لوگ غیر ضروری طور پر جلوس والوں سے الجھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں طرف حمیت جاہلیہ کا ماحول قائم ہو جاتا ہے جو بالآخر تباہ کن فساد تک جا پہنچتا ہے۔ اس ہلک صورت حال کو ختم کرنے کی واحد کارگر تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اپنی قوم کے ان غلط کاروں کا ہاتھ پکڑیں۔ مگر تقسیم کے بعد چھوٹے بڑے پچاس ہزار فسادات ہو چکے ہیں، اور ایک بار بھی مسلم زمرہ داروں نے ایسا نہیں کیا کہ وہ اپنے ان ناعاقبت اندیش نوجوانوں پر نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو بھاگل پور میں ہندوؤں کا جلوس نکلا۔ جلوس مسلم حملہ سے گزرنے والی سڑک پر پہنچا تو مسلم نوجوانوں نے اس کو روک دیا۔ کلکے گھنٹوں مقامی مسلم رہنماؤں کے پاس دوڑتا ہوا کہ آپ اپنے نوجوانوں سے کہئے کہ وہ جلوس کو نہ روکیں۔ وہ جلوس کو سڑک سے گزرنے دیں۔ ہم اس کے زمرہ دار ہیں کہ یہاں کسی بھی قسم کا کوئی تشدد نہیں ہونے پائے گا۔ مگر مقامی مسلم رہنماؤں نے اپنے نوجوانوں کو ہمیں روکا، یہاں تک کہ انہوں نے یہ آخری نادانی کی کہ جلوس کے اوپر ہم مارے۔ اس کے بعد وہی کچھ ہونا تھا جو بعد کو پیش آیا۔

یہی کسی ایک یا دوسری صورت میں تمام فرقہ وارانہ فسادات کی کہانی ہے۔ ان فسادات کی سزا اگرچہ مسلم عوام کو بھگتنی پڑتی ہے۔ مگر مسلم عوام یا خواص براہ راست طور پر ان میں ملوث نہیں ہوتے۔ ان فسادات کو بھڑکانے کے اصل زمرہ دار وہ پرجوش مسلم نوجوان ہیں جو ناعاقبت اندیشانہ طور پر ان میں کود پڑتے ہیں اور عدم اعتراض کا طریقہ اختیار کر کے آگ کو بھڑکانے کا باعث بنتے ہیں۔

یہاں مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ان نوجوانوں کا ہاتھ پکڑیں۔ وہ متفقہ طور پر ان کی مذمت کریں تاکہ ان کی حوصلہ شکنی ہو۔ مگر ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔ ان فرقہ وارانہ فسادات پر حدیث رسول کے یہ الفاظ مکمل طور پر صادق آتے ہیں :

إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوْا الظَّالِمَ
 فَلَئِمَ يَأْتُوا عَلَىٰ مِثْلِهِ
 أَوْشَكَ أَنْ يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ بِعِقَابٍ
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : لوگ
 جب ظالم کو (ظلم کرتے ہوئے) دیکھیں، پھر وہ
 اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ ان کو

(مباحثہ اصول فی امامیث الرسول، صفحہ ۳۱-۳۲) عمومی عذاب میں مبتلا کر دے۔

مسلم آبادیوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ماحول نہ ہونے ہی کی وجہ سے بار بار فساد کی صورت پیش آرہی ہے۔ جب تک یہ فسادات باقی ہیں، مٹی تعمیر کا کوئی گہرا کام نہیں کیا جاسکتا۔ مٹی تعمیر کے منصوبہ پر عمل کرنے کے لیے پُر امن حالات کی ضرورت ہے اور فسادات مسلسل طور پر پُر امن فضا کو درہم و برہم کیے ہوئے ہیں۔

قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ اگر تم ہدایت پر قائم رہو تو کوئی نقصان پہنچانے والا تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتا (المائدہ ۱۰۵) اگر تم خوفِ خدا پر رہو گے تو تمہارے لیے کس اور خوف کا خطرہ نہیں (المائدہ ۲) یہاں ہدایت سے مراد یہی ہے کہ مسلمان اپنی زندگی کو حکمِ خداوندی کے مطابق منظم کریں۔

۲۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم نہ رہنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دعوتِ الی اللہ کا کام تقریباً معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ دعوتِ الی اللہ مسلمانوں کی لازمی ذمہ داری ہے مگر دعوتِ الی اللہ جاری ہونے کی پہلی اہم ترین شرط یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں (داعی اور مدعو) کے درمیان کشیدگی اور نفرت کی فضا نہ پائی جا رہی ہو۔

مگر مسلمانوں کے کچھ جاہل عناصر غیر مسلموں سے کسی ایک یا دوسری بات پر نزاع قائم کرتے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں اور ان کے مدعو غیر مسلموں کے درمیان مستقل طور پر نفرت اور تلخی کی فضا قائم رہتی ہے۔ اس طرح کی فضا کے باقی رہتے ہوئے دعوتِ الی اللہ کام کبھی انجام نہیں پاسکتا۔

مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ اپنے گروہ کے ان نادان لوگوں کا ہاتھ پکڑیں جو اپنی غلط روش سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان دعوتِ الی اللہ کی فضا کو بگاڑ رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اپنے ان افراد کو نہیں روکا تو یقینی ہے کہ اس کے بعد پوری قوم عتابِ خداوندی کی زد میں آجائے گی۔ اس فریضہ کو ترک کرنے کے بعد کوئی بھی دوسرا عمل اس کو خدا کی پکڑ سے بچانے والا نہیں۔

دور جدید کی تحریکیں

موجودہ زمانہ میں مختلف مسلم ملکوں میں بہت سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں جو اپنے دعوے کے مطابق تجدیدی تحریکیں تھیں۔ مزید یہ کہ ان تحریکوں کو بہت بڑی مقدار میں ساتھ دینے والے افراد بھی ملے اور مادی وسائل بھی، حتیٰ کہ اس سے بھی زیادہ جتنا قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو ملے تھے۔ اس کے باوجود یہ تحریکیں عملی طور پر سراسر بے نتیجہ رہیں۔ وہ اس منزل پر پہنچنے میں ناکام رہیں جس کو انھوں نے اپنا نشانہ بنایا تھا۔

ان تحریکوں کے معتقدین نے بطور خود اگرچہ بہت بڑے بڑے الفاظ پلٹے ہیں جو وہ اپنی تحریک یا اپنی شخصیتوں کے بارہ میں بول سکیں۔ مگر یہ محض الفاظ ہیں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مثلاً سید ابوالاعلیٰ مودودی کے معتقدین موجودہ عہد کو "سید مودودی کا عہد" کہتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت لفظی بازیگری سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ میں نے ان حضرات سے کئی بار پوچھا کہ جس چیز کو آپ سید مودودی کا عہد کہتے ہیں وہ کہاں ہے تاکہ میں بھی وہاں جا کر اسے دیکھوں۔ کیا وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اپنے مکان میں ہے۔ کیا وہ اس شہر میں یا اس ملک میں ہے جہاں وہ رہتے تھے۔ کیا وہ اس جماعت میں ہے جس کو انھوں نے قائم کیا اور چلایا۔ اس کا جواب ان حضرات کے پاس کچھ نہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے اس محبوب تھیل (سید مودودی کا عہد) کو بدستور لکھے اور چھاپے چلے جا رہے ہیں۔ یہ مردہ قوم کی مخصوص علامت ہے کہ جس چیز کو وہ حقیقت میں نہ پائے اس کو وہ الفاظ میں پا کر کامیابی کا جشن مناتی ہے۔

موجودہ زمانہ کی تجدیدی تحریکوں کی ناکامی کی وجہ کیا تھی، اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں تجدیدی تحریکیں تھیں ہی نہیں۔ تجدید دین، ابدیت کی بنیاد پر اٹھنے کا نام ہے، جب کہ ان مسلم مفکرین کے پاس آخری سرمایہ صرف یہ تھا کہ وہ وقتی مسائل سے متاثر ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تحریکیں دراصل رد عمل کی تحریکیں تھیں جن کو خوش خیال مفکرین نے بطور خود تجدیدی تحریک کا نام دے دیا۔

یہاں ہم اس سلسلہ میں صرف ایک مثال دیں گے۔ اسی مثال پر دوسرے مسلم مفکرین کو

قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ مثال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

مارچ ۱۹۳۷ء میں جب میں دہلی گیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سیاسی حالات کے تغیر سے مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس قدر بھی طاقت خدا نے مجھے دی ہے اس کو اسی انقلاب کے مقابلہ میں صرف کر دوں۔ چنانچہ میں نے دہلی سے حیدرآباد پہنچتے ہی اس نئی مہم کی ابتدا ترجمان القرآن کے مضامین (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش) سے کر دی۔ آج کل میرے خیالات میں ایک پھیل رہا ہے جس نے مجھے پرسکون فکر کے قابل نہیں رکھا۔ دہلی سے ایک آگ اپنے سینہ میں لایا ہوں اور ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔ جو طوفان ہمارے سر پر آگیا ہے کیا وہ ہمیں اتنی فرصت دینے کے لیے تیار ہے کہ ہم اس طرح المیدان سے بیٹھے ہوئے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو از سر نو تیار کریں ایک طرف ایک منظم طاقت ہے جو نیشنلزم اور ڈیموکریسی کے مجموعہ کو پروانچلانا نومی کے زبردست وسائل سے ہندستان جدید کی تعمیر اس نقشہ پر شروع کر چکی ہے جس میں مسلمان قوم کے لیے بحیثیت مسلمان ہونے کے کوئی جگہ نہیں۔ دوسری طرف مسلمان ایک ریوڑ کی طرح ہندستان کے طول و عرض میں بھٹک رہے ہیں۔ (مخلصاً) حکمت قرآن (لاہور) ستمبر اکتوبر ۱۹۸۴ء

یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات واضح طور پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی حقیقتاً "واقعات انسانی" سے متاثر ہو کر اٹھے نہ کہ "واقعات خداوندی" سے متاثر ہو کر۔ اور اسی کا نام رد عمل کی نفسیات کے تحت اٹھنا ہے۔ یہی معاملہ موجودہ زمانہ میں تمام مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم تحریکیں اٹھیں ان کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ ان کی پہلی قسم وہ ہے جو انیسویں صدی کے نصف ثانی میں ظاہر ہوئی۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو بیسویں صدی کے نصف اول میں پیدا ہوئی اور پھیلی۔

موجودہ زمانہ میں مغربی قومیں جدید قوتوں سے مسلح ہو کر ابھریں اور انہوں نے پوری دنیا کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر مغلوب کر لیا۔ اس کی زد سب سے زیادہ مسلمانوں پر

پڑی۔ کیوں کہ مسلمان ہی اس وقت سب سے بڑی عالمی قوت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس عمل کی انتہا انیسویں صدی میں ہوئی۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ ہر مسلم ملک میں ایسے لوگ ابھرے جو ماضی کی عظمت کو دوبارہ واپس لانے کا پیغام دیتے تھے۔

سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷-۱۸۳۸) اور محمد علی جوہر (۱۹۳۱-۱۸۷۸) کو اس دور کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں کی زندگی کے حالات پڑھیے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جس نے انہیں ابھارا اور عمل کے میدان میں کھڑا کیا وہ مغربی قوموں کا اسلامی ممالک پر غلبہ تھا۔ ان قوموں نے نہ صرف مسلم ملکوں کو سیاسی طور پر مغلوب کیا تھا بلکہ اسلامی آثار اور اسلامی امتیازات کو مٹانے کی ایک مسلسل مہم جاری کر دی تھی، اس صورت حال نے سید جمال الدین افغانی اور محمد علی جوہر جیسے لوگوں کو تڑپایا اور وہ مغربی قوموں سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ باعتبار محرک وہ جوانی ذہن کے تحت ابھرے تھے نہ کہ مثبت ذہن کے تحت۔

دوسرے مرحلہ کی تحریکیں وہ ہیں جن کی نمائندگی سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹-۱۹۰۳) اور سید قطب شہید (۱۹۶۶-۱۹۰۶) جیسے لوگوں نے کی۔ اس دوسرے مرحلہ کے افراد کے حالات زندگی کو پڑھیے تو دوبارہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی سیاسی اور تہذیبی المیہ سے متاثر ہو کر ابھرے جس سے متاثر ہو کر پہلے مرحلہ کے لوگ ابھرے تھے۔ دونوں ہی یقینی طور پر رد عمل کی پیداوار تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے مرحلہ کے افراد نے اپنے رد عمل کو سادہ طور پر صرف رد عمل کے انداز میں پیش کیا اور دوسرے مرحلہ کے افراد نے اپنے رد عمل کے ساتھ وہ معاملہ کیا جس کو انگریزی میں "فیلو سوفائز" کہنا کہتے ہیں۔ یعنی انہوں نے اپنے رد عمل کو فکر اور فلسفہ بنا کر پیش کیا۔ انہوں نے اس کو ایک مستقل تعبیر کی حیثیت دے دی۔ پہلے مرحلہ کے لوگوں کا عمل اگر سیاسی دفاع تھا تو دوسرے مرحلہ کے افراد کا عمل سیاسی تعبیر۔

رد عمل کی نفسیات کے تحت اٹھنے والے آدمی کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ پیش نظر مسئلہ کو دیکھتا ہے نہ کہ اصل حقیقت و واقعہ کو۔ اس کی نظر وقتی صورت حال پر ہوتی ہے نہ کہ ابدی صورت حال پر۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا۔ ان کی رد عمل کی نفسیات نے ان سے مثبت طرز فکر کو چھین لیا۔ ان کی پوری سوچ منفی سوچ بن گئی۔ جس کا نتیجہ یہ

ہوگا ان کی تفکیر بھی صراطِ مستقیم سے ہٹ گئی اور ان کی عملی منصوبہ بندی بھی۔ یہاں ہم اس معاملہ کے چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

۱۔ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

الا ان فی الجسد مضعفة اذا صلحت صلح
الجسد کلہ واذا خدت خد الجسد
کلہ الا رهی القلب۔ (متفق علیہ)

آگاہ، جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ
درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے۔ وہ بگڑ
جانے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ، اور وہ
قلب ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اصلاحی عمل کا مقام آغاز کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام آغاز انسان کا دل ہے۔ قلب (ریا ذہن) کی اصلاح سے اعمال کی اصلاح ہوتی ہے۔ جب بھی لوگوں کے اندر عمل کی کمی نظر آئے تو اس قولِ رسول کے مطابق ہمیں پیشگی طور پر یہ یقین کرنا چاہیے کہ اس کا سبب انسان کے قلب میں ہوگا۔ عمل کا بگاڑ قلب کے بگاڑ کا نتیجہ ہے اور عمل کی اصلاح قلب کی اصلاح کا نتیجہ۔

یہ نکتہ مخصوص نفیات کی بنا پر ہمارے رہنماؤں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ اس راز کو سمجھنے میں ناکام رہے جو قرآن و حدیث میں اور رسول اللہ کی سیرت میں واضح طور پر موجود تھا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اپنے تجدیدی کام کا آغاز تجدیدِ نظام سے کیا۔ حالانکہ تجدیدی کام کا صحیح آغاز یہ تھا کہ اس کو تجدیدِ روح سے شروع کیا جاتا۔

دورِ زوال میں ہمیشہ قوموں سے جو چیز غائب ہوتی ہے وہ اسلامی روح ہے۔ اس لیے اسلامی روح کو از سر نو زندہ کرنا ہی تجدیدِ دین کا پہلا کام ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے ذہن پر چوں کہ سیاسی نظام کے ٹوٹنے کا غم سما یا ہوا تھا اس لیے اپنی نفیات کے تقاضے کے تحت انہوں نے یہ سمجھا کہ اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کو دوبارہ بحال کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ساری کوششیں تجدیدِ نظام کے محاذ پر وقف کر دیں۔ مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک ٹوٹے ہوئے گھر کو دوبارہ بنانے کے لیے یہ کیا جائے کہ اس کو بنیادوں اور دیواروں کے بغیر چھت کی طون سے کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ

ایسی چست کبھی کھڑی نہیں ہوتی اور نہ ایسا مکان کبھی وجود میں آتا۔ چنانچہ بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان رہنماؤں کا تجدید نظام کا منصوبہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ مسلم رہنما اپنے رد عمل کی نفسیات کی بنا پر یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ "نظام اسلام" ہمیشہ روح اسلام کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں نظام اسلام کی بربادی اسی لیے ہوئی کہ مسلمانوں میں روح اسلام کمزور ہو گئی تھی۔ یہ رہنما اگر رد عمل کی نفسیات کا شکار نہ ہوتے تو ان کے لیے اس حقیقت کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ اور اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے تو وہ اپنے کام کا آغاز تجدید روح سے کرتے نہ کہ تجدید نظام سے، جس کا موجودہ اسباب کی دنیا میں کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں تھا اور نہ اس کا کوئی نتیجہ نکلا۔

۲۔ قرآن میں مسلمانوں کو مطالب کرتے ہوئے ارشاد دہا ہے کہ اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لائے گا جو تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔ مدافع تنویر لیاستبدل قومًا غیرکم ثم لا ینکونوا امثالکم، اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ مسلمانوں پر جب زوال طاری ہو تو ان کو دوبارہ زندہ اور فعال بنانے کی ایک ضروری تدبیر یہ ہے کہ ان کے اندر نئی قومیں داخل کی جائیں۔ گویا ان کے لیے وہ چیز فراہم کی جائے جس کو آج کل کی زبان میں نیا خون (New blood) کہا جاتا ہے۔ یہ قدرت کا ایک عالم گیر قانون ہے کہ ہر چیز پر تنزل طاری ہوتا ہے۔ ہر چیز ایک مدت گزرنے کے بعد اپنی ابتدائی قوت کھو دیتی ہے۔ یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ قوموں پر بھی آخر کار زوال آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا معاملہ بھی یہی تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان حقیقتاً ایک زوال یافتہ قوم تھے۔ وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ تنہا اپنی قوت سے اسلام کے حامل بن سکیں۔ ایسی حالت میں کرنے کا کام یہ تھا کہ مسلمانوں کی داخل اصلاح کرتے ہوئے یکساں قوت کے ساتھ غیر مسلم اقوام میں اسلام کی دعوت پہنچائی جائے تاکہ ان کے اندر سے اسلام کی حمایت کے لیے نیا خون مل سکے۔

مگر یہاں دوبارہ مسلم رہنماؤں کی رد عمل کی نفسیات حامل ہو گئیں۔ وہ غیر مسلم اقوام کو نظام قرار دے کر ان کے خلاف شدید نفرت میں مبتلا تھے۔ دعوتی عمل کی لازمی شرط مدعو کے حق میں محبت ہے مگر مسلمانوں کی رد عمل کی نفسیات نے ان کے لیے مدعو کو نفرت اور حقارت کا

موضوع بنا دیا سنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ساری دل چھپیاں صرف مسلمانوں کی اصلاح کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے دور زوال کو پہنچ کر بالکل بے جان ہو چکے تھے مگر مسلم رہنماؤں کی خوش فہمی نے انہیں برعکس طور پر یہ دکھایا کہ :

ہنیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ دیرال سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زر خیز ہے ساقی
مسلمانوں کے بارہ میں اس اندازہ کی غلطی اس واقعہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ پچھلے سو برس کے اندر بے شمار اعلیٰ و اکابر (بشمول اقبال) اس مٹی کو نم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے اس کو صرف "ذرا سا نم" نہیں کیا بلکہ اس کو جل متحل کر دیا۔ مگر مسلمانوں کے اندر سے وہ جاندار گروہ نہ ابھر سکا جو جدید تاریخ میں اسلام کو اس کا واقعی مقام دلانے والا بن سکے۔ حتیٰ کہ خود اقبال کو آخر میں یہ کہنا پڑا :

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صرف صدف
دور جدید کے مسلم رہنما اگر رد عمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوتے تو یقیناً وہ اس راز کو سمجھ لیتے کہ موجودہ زمانہ میں تجدید دین اور احیاء اسلام کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو غیر مسلم اقوام تک پہنچایا جائے تاکہ ان کی صفوں سے ایسے افراد حاصل ہوں جو نو مسلمان جوش کے ساتھ اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔ مگر غیر مسلم اقوام میں دعوتی کام کرنے کے لیے ان کے حق میں محبت اور خیر خواہی کا جذبہ درکار تھا اور ہمارے رہنما رد عمل کی نفسیات کے نتیجہ میں پہلے ہی اس کو کھو چکے تھے۔ پھر وہ غیر مسلم اقوام کے درمیان خدا کے دین رحمت کے داعی بن کر اٹھتے تو کیسے اٹھتے۔

۳۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے، سب ان کی قوموں کی زبان میں بھیجے (وَمَا آرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ تُوْبِهِ) اس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ دعوتی کام کی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ مدعو کی اپنی زبان اور اس کے قابل فہم اسلوب میں ہو۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جس طرح دوسری چیزوں میں انقلاب آیا ہے اسی طرح زبان و ادب میں بھی زبردست انقلاب آیا ہے۔ سائنس کے زیر اثر موجودہ زمانہ میں بالکل ایک نیا انداز بیان وجود میں آیا ہے۔ آج کا انسان اسی بات

کو اہمیت دیتا ہے جو جدید سائنسی اسلوب میں ڈھال کر اس کے سامنے پیش کی جائے۔ اور جو چیز سائنسی اسلوب میں ڈھلی ہوئی نہ ہو وہ جدید انسان کو اپیل نہیں کرتی، وہ اس کے دل و دماغ میں اپنی جگہ نہیں بناتی۔

اس صورت حال کا تقاضا تھا کہ موجودہ زمانہ میں جدید اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے۔ جو وقت کے علمی اور ادبی اسلوب کے مطابق ہو۔ اس کی اہمیت غیر مسلم قوموں کے لیے بھی تھی اور خود مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بھی۔ مگر یہاں دوبارہ مسلمانوں کی رد عمل کی نفسیات رکاوٹ بن گئی۔ جدید علمی انداز یا نیا ادبی اسلوب پیدا کرنے والی قومیں عین وہی تھیں جن سے ہمارے مسلم رہنما نفرت میں مبتلا تھے۔ اور جن کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ان کی اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توجہ اور دل جمعی کے ساتھ جدید اسلوب کو سمجھنے کی کوشش نہ کر سکے۔ نتیجتاً وہ جدید اسلوب میں اسلامی لٹریچر پیش کرنے میں بھی ناکام رہے۔

دور جدید میں اسلام کے احیاء اور تجدید کے کام کی یہ ایک بنیادی ضرورت تھی۔ مگر کتابوں کے ان گنت انبار کے باوجود یہ ضرورت ابھی تک غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ لوگوں کے اندر اس کا شعور تک موجود نہیں۔ میری ملاقات ایک مشہور حلقہ کے ایک صاحب سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمان ابھی تک یہ نہ کر سکے کہ وہ وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی لٹریچر تیار کریں۔ انہوں نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ فلاں عظیم شخصیت نے یہ کام انجام دے دیا ہے۔ ان کی کتابیں وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کر رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ مذکورہ شخصیت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ان سے چند سطر میں صرف یہ لکھوا کر بھیج دیجئے کہ 'وقت کا فکری مستویٰ کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے۔ مگر آج تک ان کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔'

میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے دور میں مسلمانوں کا دینی طبقہ کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لاسکا جو جدید سائنسنگ اسلوب اور وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔ شخصیتوں سے عقیدت رکھنے والے کسی خوش فہم دماغ میں ایسی کتابوں کا وجود ہو سکتا

ہے، مگر حقیقی دنیا میں ایسے لڑیچر کا وجود نہیں۔ اور اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں موجود ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پست پر روانہ فرمائیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ میں بتاؤں گا کہ اس کی حقیقت جدید اسلوب اور سائنٹفک طرز تحریر کے اعتبار سے کیسا ہے، بشرطیکہ یہ کتاب کسی ذمہ دار شخص کی طرف سے ان کی اپنی تحریر کے ساتھ بھیجی گئی ہو۔

۱۹۸۰ میں میری ملاقات امریکہ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص مسٹر اسٹیو اسکلا (Steve Sklar) سے ہوئی۔ وہ فلوریڈا کے ایک عیسائی خاندان میں ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے ان کو تقابلی مطالعہ کا شوق ہوا، اور انہوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب سے متعلق کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ میں نے ان مسلم مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھے ہیں جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بڑے مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ کتابیں میرے نزدیک بالکل کوٹرا (Rubbish) ہیں۔ مغربی ملکوں میں ان کے ذریعہ سے اسلام کے تعارف کا کام نہیں کیا جاسکتا۔

انہوں نے کہا کہ یہ انگریزی ترجمے زبان کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ ان کی زبان جہاں دار زبان نہیں۔ تاہم اس سے قطع نظر مضمون کے اعتبار سے بھی ان کتابوں میں ایسی کمیاں ہیں کہ وہ مغربی انسان پر کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے چند باتیں بتائیں انہوں نے کہا کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا مغرب کے خلاف شدید نفرت میں مبتلا ہے۔ وہ مغرب اور مغربی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ان کی کتابیں غیر سائنٹفک ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہندو مفکرین کی کتابوں میں اپنے مخاطب کے لیے محبت کا جذبہ ملتا ہے مگر موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین کی کتابوں میں کم از کم مغربی مخاطب کے لیے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں۔

چنانچہ ان کتابوں کی ایک کمی یہ ہے کہ ان میں غلط قسم کی تعمیم (Generalisation) پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ مغربی سوسائٹی سے کوئی منفرد اور استثنائی واقعہ لیں گے اور اس کو اس طرح بیان کریں گے گویا کہ یہی مغربی سوسائٹی کی عام حالت ہے۔ مثلاً ایک مسلم مصنف نے اپنی کتاب

میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص ایک مغربی خاتون کے گھر پر اس سے ملنے کے لیے گیا۔ اس نے گھنٹی بجائی، اس وقت مغربی خاتون غسل خانہ میں نہا رہی تھی۔ وہ گھنٹی کی آواز سن کر بالکل ننگی باہر نکل آئی۔ اس قسم کا واقعہ کوئی استثنائی واقعہ ہو سکتا ہے مگر یہ مغربی سوسائٹی کی عام حالت نہیں۔ ان مصنفین کا حال یہ ہے کہ وہ مغربی سوسائٹی کا کوئی برا واقعہ لیں گے اور اس کو مغربی سوسائٹی کی عام حالت بتائیں گے۔ دوسری طرف یہی لوگ اسلام کے بارہ میں یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کا ایک نہایت اچھا واقعہ منتخب کرتے ہیں اور اس کو اسلامی سوسائٹی کی عام حالت بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تقابلی علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

اسی طرح ان کتابوں میں ایک عام کمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں آئیڈیل کا تقابل پر کیٹس سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً اسلام کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے وہ خطبہ حجۃ الوداع کے الفاظ نقل کریں گے اور مغرب کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے ساؤتھ افریقہ کی مثال دیں گے۔ حالانکہ یہ تعادل سراسر غلط ہے۔ ان کو چاہیے کہ آئیڈیل کا تقابل آئیڈیل سے اور پر کیٹس کا تقابل پر کیٹس سے کریں۔ مثلاً پیغمبر کے حجۃ الوداع کی تقریر کا تقابل انہیں اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر سے کرنا چاہیے نہ کہ کسی ملک کی عملی صورت حال سے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سٹراٹیجو اسکالر کی مذکورہ نشاندہی بالکل درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید قومیں ہمارے مسلم رہنماؤں کے لیے نفرت اور حقارت کا موضوع بن گئیں۔ یہ ذہن اتنا عام ہوا کہ مسلمانوں کی غیر سیاسی شخصیتیں بھی اس نفسیات سے محفوظ نہیں رہیں۔ اس کی ایک عبرت ناک مثال وہ ہے جس کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۸۵-۱۹۰۸) نے نقل کیا ہے۔

مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری نے سیرت نبوی پر اپنی کتاب "اصح السیر" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ طبقات ابن سعد کو ایک عیسائی نے ایڈٹ کیا اور چھاپا ہے اور اس نے ضرور کتاب کے اصل مخطوط میں رد و بدل کیا ہوگا۔ اس لیے میرے نزدیک وہ معتبر اور قابل استناد نہیں ہے۔ اصح السیر میں یہ بات پڑھ کر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی طرف رجوع کیا جن کی نظر مخطوطات پر بڑی وسیع اور عمیق ہے۔ مولانا اعظمی نے جواب

میں تحریر فرمایا کہ طبقات ابن سعد کا ایڈیشن جس منظوم پر مبنی ہے، اس کو میں نے دیکھا اور مطبوعہ ایڈیشن اور منظوم دونوں کا حرفاً مقابلہ کیا ہے اور کہیں ایک حرف کا فرق بھی نہیں پایا ہے (ماہنامہ برہان، دہلی جون ۱۹۸۲)

اس نئی نئی کی بنا پر مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ جدید اسلوب یا جدید معیار ادب کو سمجھیں جن کو پیدا کرنے والی خود یہی قومیں تھیں۔ جدید قوموں سے نفرت مسلمانوں کے لیے اس میں مانع ہو گئی کہ وہ جدید اسلوب کو سمجھیں اور اس میں مہارت پیدا کر کے اس قوم میں اسلامی لٹریچر فراہم کریں۔

خلاصہ

ادب پر جو باتیں عرض کی گئیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان حریت اور رقیب کا رشتہ ختم کیا جائے اور ان کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کیا جائے۔ جس دن ایسا ہو گا کہ مسلمان اپنے آپ کو داعی اور دوسری قوموں کو مدعو سمجھنے لگیں، اسی دن مسلمانوں کے اندر وہ تمام اعلیٰ صفات پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی جو موجودہ زمانہ میں اسلام کے احیاء کی جادو جہد کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ داعی اور مدعو کا رشتہ پر جوش تقریری الفاظ بول دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ موجودہ دنیا میں سب سے بڑی قربانی ہے۔ اس کے لیے ہمیں دوسری قوموں سے اپنی تمام شکایتوں کو ایک طرف طور پر ختم کر دینا ہو گا۔ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ دوسری قوموں سے محبت کی جائے خواہ وہ ہماری دشمن بنی ہوئی ہوں۔ دوسری قوموں کے لیے نیک دعائیں کی جائیں، خواہ وہ ہمارے خلاف سازش کر رہی ہوں۔ دوسری قوموں کو خیر خواہی کا موضوع بنایا جائے خواہ ہمارے نزدیک وہ ہماری بدخواہی میں مشغول ہوں۔

کامیابی کی شرط

آدمی خارجی دنیا کی جو معلومات حاصل کرتا ہے اس کا ۸۰ فی صد حصہ اس کو آنکھ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ خدا جب سورج کے ذریعہ دنیا میں روشنی پھیلاتا ہے تو گو زیادہ اس بات کا امکان کھولتا ہے کہ آدمی اپنی آنکھ سے دنیا کی چیزوں کو دیکھے اور اپنے معلومات کے ذخیرہ میں اضافہ کرے۔ مگر اس امکان سے فائدہ اٹھانا ایک شرط کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ شرط یہ کہ آدمی اپنی آنکھ کو کھولے۔ اگر آدمی اپنی آنکھیں بند کرے تو سورج کی کامل روشنی کے باوجود وہ کچھ بھی نہ دیکھے گا۔ اس کی معلومات میں ایک فی صد اضافہ بھی نہ ہوگا۔

اسی طرح خدا جب ہوا کو چلاتا ہے تو گو زیادہ اس بات کا امکان کھولتا ہے کہ آدمی اس سے آکسیجن لے اور اپنے لیے زندگی کا سامان کرے۔ مگر آکسیجن کو پانے کی یہ شرط ہے کہ آدمی اس کو فطرت کے معتمد راستے سے اپنے اندر داخل ہونے دے۔ جو آدمی اس شرط کو پورا نہ کرے اس کے لیے آکسیجن سے لدی ہوئی ہواؤں کا چلنا اور نہ چلنا برابر ہوگا۔ وہ ان سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا۔

فطرت کا یہی اصول انسانی زندگی کا اصول بھی ہے۔ انسانی زندگی میں کامیاب ہونے کا اصول بھی وہی ہے جو فطرت کی دنیا میں خدا نے قائم کر رکھا ہے۔

کامیابی کیا ہے۔ کامیابی مواقع کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے کچھ مواقع کھلتے ہیں۔ اگر وہ ان مواقع کو استعمال کرے تو یقینی طور پر وہ کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اگر وہ ان مواقع کو استعمال کرنے میں غفلت کر جائے تو اسی کے نتیجہ کا دوسرا نام ناکامی ہے۔ یہی اس دنیا کے لیے خدا کا ابدی اصول ہے۔

تاہم ہر موقع اپنے ساتھ کچھ شرطیں جوئے ہوتا ہے۔ اس شرط کو ملحوظ رکھ کر ہی آپ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر آپ متعلقہ شرط کو ملحوظ رکھنے میں ناکام رہیں تو آپ اس موقع کا فائدہ اٹھانے میں بھی ناکام رہیں گے۔ یہ دنیا خود اپنے اصولوں پر قائم ہے۔ دنیا کہیں ہماری خواہشوں کی پابندی نہیں کرے گی۔ بلکہ ہمیں اپنے آپ کو دنیا کے قائم شدہ اصولوں کا پابند بنانا پڑے گا۔ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی

کا واحد راز ہے۔ اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں جس سے یہاں کامیابی حاصل کی جاسکے۔

ایک مثال لیجئے۔ موجودہ زمانہ میں ایک بہت بڑا امکان کھلا ہے جو اس سے پہلے کبھی دنیا میں اس وسعت کے ساتھ موجود نہ تھا۔ یہ ہے آزادی رائے کا حق۔ موجودہ دور معلوم تاریخ کا پہلا دور ہے جب کہ عالمی سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی پسند کا عقیدہ رکھے۔ اور اگر وہ اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے تو دوسروں میں اس کی تبلیغ کرے۔ عقیدہ اور اظہار رائے کی یہ آزادی موجودہ زمانہ میں کامل طور پر ہر شخص کو حاصل ہے۔ اس میں کیونٹ ملکوں کے سوا کسی ملک کا کوئی استثناء نہیں۔

تاہم یہ آزادی پر امن ذرائع (Peaceful means) کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی آپ جو کچھ کریں سمجھانے بھاننے کے انداز میں کریں۔ زور زبردستی کے انداز میں نہ کریں۔ اگر آپ اس شرط پر قائم ہوں تو آج کی دنیا میں اپنے عقیدہ اور نظریہ کی تبلیغ سے آپ کو کوئی روکنے والا نہیں۔

پر امن ذرائع کی شرط کوئی غیر متعلق شرط نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شرط خود مذکورہ اصول آزادی ہی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ کیوں کہ یہ آزادی کسی ایک شخص کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ہے۔ اور جب ہر شخص کو یکساں آزادی دی جائے تو پر امن ذرائع کی شرط لازمی طور پر مطلوب ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ کسی شخص کا غیر پر امن ذریعہ اختیار کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے شخص کی آزادی چھین رہا ہے۔ اس طرح غیر پر امن ذرائع کا طریقہ آزادی کا اٹھا ہوا جاتا ہے۔ وہ اس کی نفی بن جاتا ہے وہ ایک کے حق میں آزادی اور دوسرے کے حق میں پابندی بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے۔

اس جدید انقلاب نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے حق میں ایسے امکانات کھول دیئے ہیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی پائے نہیں جاتے تھے۔ تاہم اس امکان کو حاصل کرنے کی ہمیں ایک لازمی قیست دینی پڑے گی۔ وہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو کامل طور پر پر امن ذرائع کے دائرہ میں محدود رکھیں۔ اگر ہم اس لازمی شرط کو پورا کرنے میں ناکام رہیں تو یقیناً طور پر ہم موجودہ مواقع کو استعمال کرنے میں بھی ناکام رہیں گے۔ اگر ہم مذکورہ شرط کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے اس امکان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو ہم اللہ کے یہاں مجرم ٹھہریں گے خواہ بطور خود ہم نے دوسروں کو مجرم ٹھہرا رکھا ہو۔

غیر خونخوار انقلاب

خونخوار انقلاب دراصل انقلاب کی نفی ہے۔ حقیقی انقلاب وہ ہے جو غیر خونخوار انقلاب ہو۔ اسلام اس کی واحد اعلیٰ مثال ہے۔ انسان انقلاب چاہتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ چاہتا ہے کہ یہ انقلاب غیر خونخوار طور پر آئے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی بھی شخص غیر خونخوار انقلاب لانے پر تیار نہ ہو سکا۔ تمام معلوم انقلابات قتل اور خون کے جنگل کو پار کر کے ہی ظہور میں آئے ہیں۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کا لایا ہوا انقلاب تمام معلوم تاریخ کا واحد انقلاب ہے جو حقیقی معنوں میں غیر خونخوار انقلاب (bloodless revolution) ہے۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کو اگر تاریخ سے محذوف کر دیا جائے تو نہ صرف غیر خونخوار انقلاب کی یہ بات انسان بن کر رہ جاتی ہے بلکہ اس کے بعد کوئی ایسی عملی مثال باقی نہیں رہتی جس کی روشنی میں کوئی انسان بعد کے زمانوں میں غیر خونخوار انقلاب کی بات سوچ سکے۔

فرانس میں جس دیکھ بھری انقلاب آیا۔ اس میں عوام اور شاہی نظام کے درمیان جو مقابلے ہوئے ان میں مرنے والوں کی تعداد ۱۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ بیسویں صدی میں روس میں اشتراکی انقلاب آیا۔ اس میں جو لوگ مرے اور مارے گئے ان کی حقیقی تعداد نامعلوم ہے۔ تاہم اندازہ ہے کہ ان کی تعداد کسی حال میں ایک کروڑ سے کم نہیں۔ امریکی انقلاب (۱۷۸۳-۱۷۷۵) میں نسبتاً کم آدمی مرے۔ تاہم اس میں بھی متواترین کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ عالمی جنگوں کا معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ چنانچہ پہلی عالمی جنگ میں مختلف ملکوں کے ۷۰ لاکھ آدمی مارے گئے۔ اور دوسری عالمی جنگ میں چھ کروڑ سے زیادہ آدمی ہلاک ہوئے۔

محمد مصطفیٰ ﷺ دینا سے گئے تو ایک پورے ملک میں زبردست فکری اور اخلاقی انقلاب آچکا تھا۔ بوقت وفات ۱۲ لاکھ مربع میل کے رقبہ پر آپ کی حکومت قائم تھی۔ مگر اس پورے عمل میں صرف ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے۔ جن میں مسلم مقتول ۲۵۹ تھے اور غیر مسلم مقتول ۷۵۹۔ یہ تعداد واقعہ کی نسبت سے اتنی کم ہے کہ وہ تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب کو بلاشبہ پورے معنوں میں غیر خونخوار انقلاب کہا جاسکتا ہے۔

ہر قائد غیر خونخوار انقلاب لانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مگر کوئی قائد غیر خونخوار انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں غیر خونخوار انقلاب لانے کے لئے خود اپنے آپ کو خون کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی وہ قیمت ہے جس کو دینے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں۔ خونخوار انقلاب نکرنا

کی زمین پر آتے ہیں، اور غیر غوثی انقلاب صبر کی زمین پر۔ اور صبر سے زیادہ مشکل کوئی کام اس دنیا میں ایک انسان کے لئے نہیں۔

صبر کی حقیقت جھٹکنے کو اپنے آپ پر لینا ہے، دوسروں پر انڈیلنے کے بجائے اپنے آپ پر سہنا ہے حقیقت یہ ہے کہ لڑائی کے بغیر بھی حیات ہوتی ہے۔ مگر لڑائی کے بغیر جیتنے کے لئے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے، لوگ اپنے آپ سے لڑ نہیں پاتے، اس لئے وہ لڑائی کے بغیر لڑائی جیتنے والے بھی نہیں بنتے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم غیر غوثی انقلاب لانے میں کس طرح کامیاب ہوئے۔ اس کا اندازہ آپ کے حالات زندگی کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ کہ میں ۱۳ سال تک آپ کے مخالفوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہتھم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ انھوں نے الفاظ کی چوٹ بھی دی اور پتھر اور نیزے کی چوٹ بھی۔ مگر اس طرح کے بے شمار واقعات پیش آنے کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بھی جوبلی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اور دیکھیے کہ کوئی لڑائی کی۔ آپ مخالفوں کے ہر وار کو ایک طرف طور پر ہتھتے رہے۔ ان کی طرف سے ہتھم کے استعمال کے باوجود کبھی ہتھم نہیں ہوئے۔

اس کے بعد آپ نے یہ کیا کہ کہ کو چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ مدینہ چلے گئے۔ آپ نے نہ اس کے خلاف فریاد کی کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اپنے وطن اور اپنی جائیداد کو چھوڑنا پڑ رہا ہے اور نہ اس کی پروا کی کہ اس طرح وطن چھوڑ کر جانے کی بنا پر لوگ آپ پر بزدلی اور فرار کا الزام لگائیں گے۔

مدینہ چلے جانے کے بعد کہہ کے لوگوں نے آپ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس وقت بھی آپ کی پالیسی یہ رہی کہ حتمی الامکان جنگ سے اجتناب کیا جائے۔ مثال کے طور پر احزاب کے موقع پر آپ نے خندق کھود کر اپنے اور دشمنوں کے درمیان آڑ قائم کر دی۔ آپ نے صرف دفاع میں جنگ کی اور وہ بھی اس وقت جب کہ مدعیوں کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رہ گئی ہو۔ ایسی باقاعدہ جنگیں صرف تین ہیں جن میں آپ خود شریک رہے ہوں (بدر، احد اور خنین)، آپ کے زمانہ میں موتہ کی جنگ بھی ہوئی۔ مگر اس میں آپ خود شریک نہ تھے۔

آپ کو صبر میں جو غلبہ حاصل ہوا وہ جنگ کے ذریعہ نہیں ہوا، بلکہ اس "صلح" کے ذریعہ ہوا جس کو قرآن میں فتح مبین (الفتح) کہا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ کا واقعہ غیر غوثی انقلاب لانے کے لئے اپنے آپ کو خون کرنے سے کم نہ تھا۔ آپ نے اپنی ذات کا خون کرنا گوارا کیا۔ تاکہ باہر کی دنیا میں خون نہ بہایا جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو غلبہ حاصل ہوا وہ جنگ کے ذریعہ نہیں، ہوا بلکہ دعوت کے ذریعہ ہوا۔ اسی دعوت کے بند دروازوں کو کھولنے کے لئے آپ نے یہ ایک کردار دشمن سے اس کی اپنی شرانگہی بنیاد پر صلح کر لی۔ صلح حدیبیہ تھی جس کو قرآن میں کلمی فتح (ان اففتحنا لک فتحا مبینا) کہا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ اس بات کا ایک ہمہ جہتی ثبوت ہے کہ جنگ کے مقابلہ میں امن کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی ایک طرف صلح کے ذریعہ اسی عظیم حقیقت کا عملی مظاہرہ فرمایا، تاہم یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اس قسم کے ایک واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے صبر کی ضرورت ہے، اور اس دنیا میں بلاشبہ صبر سے زیادہ مشکل قربانی اور کوئی نہیں۔

ایک وضاحت

جب یہ کہا جائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بے تشدد طریقہ تھا اور آپ امن کی طاقت سے انقلاب لے آئے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی تشدد کا کوئی طریقہ وقتی یا استثنائی طور پر بھی اختیار نہیں کیا۔

اس قسم کے دوسرے بیانات کی طرح اس بیان کا مقصد بھی صرف آپ کے اصولی طریق کار کو بتانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے طے کردہ معیار کے مطابق، بطور خود ہمیشہ اس اصول کو اپنے سامنے رکھا کہ آپ کو امن کی طاقتوں کے ذریعہ اپنے مطلوبہ انقلاب تک پہنچنا ہے۔ اپنے منصوبہ کی حد تک آپ نے ہمیشہ امن کے طریقوں ہی کو اولین ترجیح دی۔ اور آپ کی کامیابی بنیادی طور پر امن کی طاقتوں ہی کے استعمال کا نتیجہ تھی۔

کیونکہ تشدد کے پیش نظر بھی ایک انقلاب تھا۔ مگر کمیونزم نے بنیادی طور پر تشدد کو اپنا طریقہ قرار دیا۔ اس لیے اس نے دوسری ممکن تدبیروں کو نظر انداز کر کے تشدد کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہا۔ مثال کے طور پر کمیونسٹ لیڈر جوزف اسٹالن نے اپنے نظریہ کے مطابق، سوویت یونین کی زرعی زمینوں کو ریاستی فارم یا اجتماعی فارم (collective farm) بنا لیا۔ یہ ۲۵-۱۹۳۰ کا واقعہ ہے، اس مقصد کے لیے وہ زمینوں کی سرکاری خریداری اور تدریجی نفاذ کا طریقہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ مگر اس نے صلح طاقت کا ذریعہ استعمال کیا۔ اس نے جبر و تشدد کے ذریعہ کسانوں سے زمینیں چھین لیں۔ اور جب انہوں نے مزاحمت کی تو کئی ٹین کسانوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ، اس کے برعکس، امن کے اصولوں پر مبنی تھا۔ تاہم اس دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں ہے۔ یہاں ہمیشہ "فریق ثانی" کا مسئلہ موجود رہتا ہے۔ فریق ثانی اگر کسی حال میں اپنی ضد کو نہ چھوڑے۔ وہ آخری حد تک ظلم پر قائم رہے تو امن پسندی کی تمام تر کوششوں کے باوجود بعض اوقات دفاعی کارروائی ایک ناگزیر برائی بن جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فریق ثانی کے ہر وار کو یک طور پر سہا۔ آپ نے نفرت کے جواب میں محبت کی۔ سب دشتم کے جواب میں دعائیں دیں۔ ایذا رسانی کے جواب میں مہربانیاں۔ مسلسل اشتعال انگیزی کے باوجود آپ مشتعل نہیں ہوئے۔ تشدد دانہ کار روایوں کو اعراض کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی۔

اس قسم کی امن پسندانہ کوششوں کے باوجود کبھی ایسا ہوا کہ فریق ثانی کی بڑھی ہوئی ضد اور جارحیت کی بنا پر کوئی بھی پر امن تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ اور آخر کار دفاعی طور پر ٹکراؤ کی نوبت آگئی۔ تاہم دفاعی کارروائی میں بھی آپ نے پوری طرح اس کا اہتمام کیا کہ کم سے کم تشدد کے ذریعہ مقصد حاصل ہو سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۶۳ سالہ عمر نبوت میں اس قسم کا بعض ٹکراؤ جو پیش آیا اس کی حیثیت استثنائے کی تھی نہ کی عموم کی۔ اور یہ ایک مسئلہ اصول ہے کہ استثنائے کو ہمیشہ عموم کے تحت شمار کیا جاتا ہے نہ کہ عموم کو استثنائے کے تحت شمار کیا جائے۔

اصلاح اعمال

قرآن میں اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ تم لوگ درست بات (قول سدید) کہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمائے گا اور تم کو کامیابی عطا کرے گا (الاحزاب ۷۰، ۷۱)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ درست بات بولنے سے اعمال اور معاملات کی اصلاح کیوں کر ہو جائے گی۔ جواب یہ ہے کہ قول سے سوچ، منی ہے اور سوچ سے عمل بنتا ہے۔ آدمی جب درست اور ٹھیک مطابق واقعہ بات کہے گا تو اس کی سوچ بالکل صحیح رہے گی۔ اور جب سوچ صحیح ہوگی تو اس سے جو عمل ظاہر ہوگا وہ بھی یقیناً صحیح ہوگا۔ اس کے برعکس جب قول درست نہ ہو تو سوچ اور عمل دونوں غلط ہوتے چلے جائیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اصحاب کو کسی گروہ کی طرف بھیجتے تھے تو ان سے کہتے تھے کہ تم لوگوں کو بشارت دینا، نفرت نہ دلانا۔ تم آسانی کی بات کہنا، سختی کی بات نہ کہنا (بشروا ولا تنفروا ویستروا ولا تحسروا) مشکاة المصابیح ۲/۱۰۹۹۔

اگر آپ بشارت اور ایسے والے الفاظ بولیں تو سننے والوں کے اندر امید اور حوصلہ کا ذہن بنے گا۔ اس کے بعد وہ امکانات کے میدان میں عمل کی تدبیر نکالیں گے اور اس میں محنت کر کے کامیابی حاصل کریں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ لوگوں کے سامنے نفرت اور عسرت کے الفاظ بولیں تو اس سے سننے والوں کے اندر ناامیدی اور دل شکستگی کا مزاج پیدا ہوگا۔ وہ یہ صلاحیت کھودیں گے کہ اپنی قوتوں کو عمل میں لا کر اپنے مستقبل کی بہتر تعمیر کر سکیں۔

اس کی مثال ایسے پچھلے صدی میں مسلم قوموں پر برطانیہ کا تسلط قائم ہو گیا تھا۔ اب اس کی جگہ پر سارے عالم اسلام میں امریکہ غالب حیثیت حاصل کیے ہوئے ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے تمام مسلمان برطانیہ کو اسلام کا دشمن نمبر ایک کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ برطانیہ سازش کر کے مسلم دنیا پر قابض ہو گیا ہے۔ اب تمام دنیا کے مسلمان امریکہ کو اسلام کا دشمن نمبر ایک کہہ رہے ہیں۔ دوبارہ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ نے سازش کے ذریعہ عالم اسلام پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ یہ صورت واقعہ کے اظہار کے لیے غلط لفظ بولنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں قوموں کی حالت میں تبدیلی اللہ کے قانون کے تحت ہوتی ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ کسی قوم کی داخلی حالت (مابا نفس) میں جب تغیر واقع ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی خارجی حالت (ماباقوم) میں بھی تغیر واقع ہو جاتا ہے (الانفال ۵۳، الرعد ۱۱)۔ اس قرآنی بیان کے مطابق، مغربی قوموں کے بارہ میں مسلمانوں کا مذکورہ بیان قول سدید کے خلاف قرار پاتا ہے۔ اس کے مطابق، صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی استعداد میں کمی اور مغربی قوموں کی استعداد میں اضافہ نے یہ صورت حال پیدا کی ہے۔ اس لیے اس معاملہ میں قول سدید یہ ہو گا کہ یہ کہا جائے کہ مغربی قومیں ترقی کے اعتبار سے نمبر ایک پر پہنچ گئی ہیں اور مسلمان ترقی کے اعتبار سے نمبر ۲ پر چلے گئے ہیں۔ دونوں گروہوں کے درمیان اسی فرق نے یہ حالت پیدا کی ہے کہ ایک غالب ہو گیا ہے اور دوسرا مغلوب۔

اس معاملہ میں مسلمان اگر قول سدید بولتے۔ یعنی وہ یہ کہتے کہ موجودہ زمانہ میں مغربی ممالک اپنی قومی صلاحیت میں آگے بڑھ گئے ہیں، اور ہم اپنی قومی صلاحیت میں ان کے مقابلہ میں پیچھے چلے گئے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں کے اندر خود تعمیری کی سوچ ابھرتی۔ ان کے اندر اپنے پیچھے پن کا احساس جاگتا۔ اس کے بعد تمام مسلمان اپنی کیوں کو دور کرنے میں لگ جاتے۔ اس طرح ان کی اصلاح اعمال ہوتی، وہ اپنی صلاحیت میں اضافہ کرتے۔ اور آہستہ کار اپنی کمزوری کو دہراہہ حاصل کر لیتے۔ اس کے برعکس جب انہوں نے مغربی قوموں کے معاملہ کو سازش اور ظلم کا معاملہ بتایا تو ان کی پوری سوچ منفی سوچ بن گئی۔ ان کے اندر صرف دوسروں کے خلاف نفرت اور جھنجھلاہٹ کے جذبات ابھرے۔ وہ اپنی مصیبت کا ذمہ دار دوسروں کو سمجھ کر ان کے خلاف فریاد کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور معلوم ہے کہ فریاد و ماتم سے کسی کا معاملہ کبھی درست نہیں ہوتا۔

چیلنج نہ کہ تعصب

یہی معاملہ ہندستان جیسے ملکوں کا ہے۔ یہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو ان کے مقابلہ میں اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کو طرح طرح کے مسائل درپیش ہیں۔ سماجی اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں ان کو اکثریتی فرقہ کی طرف سے ناخوش گوار تجربات پیش آ رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب زمین پر بسایا تو اس

سے کہا کہ تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو گے (ابتداءً ۳۶) اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں مختلف افراد اور مختلف گروہوں کے درمیان مقابلہ اور مسابقت جاری ہوگا۔ ہر ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہے گا۔ اس کے نتیجے میں باہمی مکر اور ہونگا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات دشمنی کی نوبت آجائے گی۔

اس سترائی بیان کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو ہندستان جیسے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آرہا ہے وہ چیلنج کا معاملہ ہے۔ عدلانے اس دنیا کو چیلنج کا مقام بنایا ہے۔ یہ چیلنج کسی نہ کسی صورت میں ہر ایک کو پیش آتا ہے۔ اگر اس کو چیلنج کہا جائے تو یہ اس معاملہ میں قولِ سدید ہوگا۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے اس کو تعصب اور زیادتی کے الفاظ میں بیان کیا جو بلاشبہ قولِ غیر سدید کے ہم معنی تھا۔

اگر اس صورت حال کو چیلنج کہا جائے تو اس سے مقابلہ کا ذہن پیدا ہوگا۔ لوگ سوچیں گے کہ ہم کو ہمت اور حوصلہ کے ساتھ اس کا سامنا کرنا چاہیے۔ یہ ذہن لوگوں کی صلاحیتوں کو جگا کر انہیں اس قابل بنائے گا کہ وہ پیش آمدہ چیلنج سے نمٹ سکیں۔ مگر جب اس معاملہ کو تعصب اور زیادتی کے الفاظ میں بیان کیا گیا تو اس سے منفی نفسیات پیدا ہوئی۔ لوگوں کو صرف یہ نظر آیا کہ وہ اس کے خلاف شریکیت اور احتجاج کرنے میں مشغول ہو جائیں۔ چیلنج سمجھنے سے معاملات درست ہوتے ہیں اور تعصب سمجھنے سے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔

قتل، شہادت

ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر جگہ جگہ مسلمانوں کا مکر اور دوسروں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ اس کے نتیجے میں جو تصادم ہوتا ہے اس میں مسلمان بڑی تعداد میں مارے جاتے ہیں۔ جب کہیں ایسا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے کہتے ہیں کہ "اتنے مسلمان شہید ہو گئے" جب کہ قرآن میں اس طرح کے مواقع کے لیے قتل کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً: وَلَا تَقْتُلُوا الْعَمَىٰ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (اموات - البقرہ ۱۷۳) وغیرہ۔

اس معاملہ میں قتل کا لفظ قولِ سدید ہے اور شہید کا لفظ قولِ غیر سدید۔ قتل کا لفظ محسوسہ رپورٹنگ کا لفظ ہے۔ جب کہ شہید کا لفظ انجباء کا لفظ ہے اور انجباء کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دور اول میں اس طرح کے مواقع پر ہمیشہ قتل یا اس کا ہم معنی لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اس طرح کے معاملات میں ہماری حیثیت صرف رپورٹر کی ہوتی ہے۔ جج کی نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمارے لیے درست بات یہی ہے کہ ہم بیان واقعہ والا لفظ استعمال کریں نہ کہ انجمن واقعہ والا لفظ۔

اس نغلی فرق کا اثر اعمال پر کس طرح پڑتا ہے۔ جب آپ کہیں کہ منلاں جگہ مکراؤ ہوا اور اس میں اتنے مسلمان شہید ہو گئے تو آپ نے اس واقعہ کو مقدس اور مطلوب حیثیت دیدی۔ اب لوگوں کا ذہن اس پر اس سماج سے نہیں سوچ سکتا کہ بجائے خود یہ مکراؤ کرنا صحیح تھا یا غلط۔ اس کے بعد مسلمانوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ بے فائدہ طور پر مسلسل مکراؤ کرتے رہیں گے اور کبھی ایسا نہ کریں گے کہ اس پر نظر ثانی کریں اور اپنے رویہ کو بدل کر ہلاکت سے بچ جائیں۔

اس کے برعکس جب آپ یہ کہیں کہ منلاں جگہ مکراؤ ہوا اور اس میں اتنے مسلمان مارے گئے تو آپ اس واقعہ کو ایک ایسا واقعہ قرار دیدیتے ہیں جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اب آپ کا ذہن اس پر نظر ثانی کرے گا۔ آپ اس کے نفع نقصان کا میزانیہ لگائیں گے۔ اور جب دیکھیں گے کہ موجودہ حالات میں مکراؤ کا کوئی فائدہ نہیں تو آپ فوراً اپنا ذہن تبدیل کر لیں گے اور آئندہ مکراؤ سے اعراض کرتے ہوئے ہلاکت سے بچ جائیں گے۔

اس طرح کے معاملہ میں "شہادت" کا لفظ بے فائدہ ہلاکت کو جاری رکھنے کا سبب بنتا ہے۔ اور "قتل" کا لفظ بے فائدہ ہلاکت کو ختم کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

پریس کا دور

قدیم زمانہ میں بھی ایسے افراد پیدا ہوئے جو غیر سید الفاظ میں کلام کریں۔ مگر قدیم زمانہ میں ایسے افراد کا اثر بہت محدود رہتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت وہ وسیع ذرائع ابلاغ موجود نہ تھے جو آج ہر کھنچے اور بولنے والے کو فوراً حاصل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں غیر سید الفاظ بولنے سے وہ نرابی پیدا نہ ہو سکی جس کا مشاہدہ آج ہر طرف کیا جا رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں چھپائی اور پریس اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت تھی۔ پریس کو مسلمانوں کی ذہن سازی یا قرآن کے الفاظ میں تزکیہ (آل عمران ۱۶۴) کے لیے نہایت موثر طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ مگر عین اس وقت جب کہ پریس کا دور آیا مسلمانوں کا صاحبِ قلم طبیعت عمومی طور پر منفی ذہنیت

کا شکار ہو گیا۔ غالب قوموں کے حشرات رد عمل کی نفسیات نے اس کو مکمل طور پر احتیاجی بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم پریس تقریباً سب کا سب قول غیر سدید کا نمونہ بن گیا۔ پریس کے دور میں مسلمانوں نے جو اخبارات و رسائل جاری کیے ان میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کو حقیقی طور پر قول سدید کی مثال مترار دیا جاسکے۔

موجودہ مسلمانوں کا عام طور پر یہ حال ہے کہ وہ مغربی قوموں کے بارے میں صرف سازش اور جارحیت کی اصطلاح میں سوچنا جانتے ہیں، وہ اس کو استہداد کے فرق کے مسلک کی حیثیت سے نہیں دیکھ پاتے۔ اسی طرح وہ ہندو اور اس قسم کی دوسری قوموں کو صرف متعصب اور ظالم کے خانہ میں ڈالنے ہوئے ہیں۔ وہ اس معاملہ کو اس نظر سے نہیں دیکھ پاتے کہ یہ ایک چیلنج ہے جو خود نظام فطرت کے تحت ہمارے لیے پیش آیا ہے۔ وہ اپنی قوم کے مرنے والوں کو ہمال میں شہید کا درجہ دیتے ہیں اور دوسری قوم کے مرنے والوں کے لیے ہمیشہ ان کے پاس جہنم رسید کا لفظ ہوتا ہے۔

یہ منفی مزاج اتنے بڑے پیمانہ پر پھیلنے کا واحد سبب پریس ہے۔ مسلمانوں کے ارباب قلم نے پریس کو مجرمانہ حد تک ذہن کو بگاڑنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے جو آج ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔

جسزنی تاریخ

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما دوسری قوموں کے غلبہ کو اگر ان کی استہدادی فوقیت کا معاملہ سمجھتے تو وہ مسلمانوں کو اعداد قوت (الانفال ۶۰) کی تلقین کرتے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے کہ تم اپنی کمیوں کو جانو اور اس کی تلافی کر کے اپنے آپ کو عہد جدید کے معیار کے مطابق بنانے کی کوشش کرو۔ مگر موجودہ دور کے مسلم رہنماؤں نے دوسری قوموں کے غلبہ کے معاملہ کو سادہ طور پر صرف جارحیت کا معاملہ سمجھا۔ اس لیے وہ اٹھ کر مسلمانوں کو لڑائی بھڑائی پر اکسانے لگے۔

ان رہنماؤں کو نظر آیا کہ لڑائی اور مکر اور جباری رکھنے کے لیے سب سے زیادہ کارآمد طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو دور اول کے اہل اسلام کے فاتحانہ کائنات سے سنائے جائیں۔ ان کو جنگ و قتال کی مسرکہ آرائیاں یاد دلائی جائیں۔ چنانچہ تقریر و تحریر اور نظم و نثر کے تمام طریقے اس مقصد کے لیے وقف کر دیئے گئے۔ پورا مسلم سائبر فوٹو مات اسلامی کے تذکروں سے گونج اٹھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی تاریخ کے فاتحانہ واقعات تو مبالغہ آمیز انداز میں لوگوں کے سامنے آ گئے۔ مگر اسلام کی تاریخ کا دوسرا پہلو جو مبر اور تواضع جیسی صفات سے تعلق رکھتا ہے، وہ بالکل لوگوں کے سامنے آسکا۔ لوگوں نے تاریخ اسلامی کے نصف ثانی کو ہانا مگر وہ تاریخ اسلامی کے نصف اول سے بے خبر رہے۔

واقعہ حدیبیہ

کھنے اور بولنے کا مذکورہ انداز اتنا بڑھا کہ دور اول کے جن واقعات میں فاتحانہ شان نہیں تھی۔ ان کو بھی فتح و غلبہ کا واقعہ بنا کر پیش کیا گیا۔ انہیں میں سے ایک مثال صلح حدیبیہ (۶۲ھ) کی ہے۔ حدیبیہ کی صلح ایک ایسا واقعہ تھا جو غیر فاتحانہ حالت سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر لفظی بازی گری کے ذریعہ اس کو بھی ایک فاتحانہ واقعہ بنا دیا گیا۔ مثال کے طور پر ایک صاحب نے کہا:

”حدیبیہ کا سفر ایک اقدامی انداز کا واقعہ تھا۔ حدیبیہ کا معاہدہ اس بات کی علامت بن گیا کہ آخر کار قریش نے مسلمانوں کی سیاسی اور دستوری حیثیت کو تسلیم کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کو فتح میں قرار دیا۔ اس واقعہ سے ثابت ہو گیا کہ عرب کی سب سے بڑی طاقت یعنی قریش نے مسلمانوں کے سامنے گھٹے ٹیک دیئے ہیں۔“

حدیبیہ کی یہ تصویر تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یہ صرف شاعرانہ مضمون بندی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زندگی میں ہر طرح کے واقعات جمع کر دیئے تھے، شکست کے بھی اور فتح کے بھی، غلبہ کے بھی اور مغلوبیت کے بھی۔ تاکہ اہل اسلام خواہ جس حال میں ہوں ان کو اپنے پیغمبر سے رہنمائی ملتی رہے۔ مگر مذکورہ قسم کے شاعرانہ تصدیقوں نے مسلمانوں کو زندگی کے بہت سے معاملات میں پیغمبر کی رہنمائی سے محروم کر دیا۔

مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگے کہ ان کے لیے اسلام میں حالتِ غلبہ کی رہنمائی تو موجود ہے مگر حالتِ مغلوبیت کی رہنمائی اسلام میں موجود نہیں۔ ”صلح حدیبیہ“ اس بات کی مثال تھی کہ مسلمان جب مغلوبیت کی حالت سے دوچار ہوں تو اس وقت وہ کہاں سے اپنے عمل کا آغاز کریں۔ مگر حدیبیہ کے واقعہ کو گھٹے ٹیکنے کا واقعہ بتا کر انہیں اس سے محروم کر دیا گیا کہ موجودہ حالات میں وہ اس سے اپنے عمل کا نقطہ آغاز پاسکیں۔

قرآن میں صلح حدیبیہ کے لیے فتح تبیین (فتح ۱) کا لفظ آیا ہے۔ اس لفظ کو لے کر کہہ دیا گیا کہ کون کہتا ہے کہ صلح حدیبیہ کا فزوں سے دب کر کی گئی۔ قرآن کے بیان کے مطابق وہ فتح تبیین تھی۔ اس میں خود کا فزوں نے مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے تھے۔ نہ کہ مسلمانوں نے کا فزوں کی شہرتوں کو مان لیا تھا۔

اس تقریر میں قرآن کے لفظ کو اس کے اصل مفہوم کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں اس صلح کے لیے فتح تبیین کا لفظ ہے، مگر اس کو فتح تبیین اس کے آخری انجہام کے اعتبار سے کہا گیا ہے نہ کہ اس کی ابتدائی تاریخ کے اعتبار سے۔ جس دن صلح حدیبیہ کا عہد نامہ لکھا گیا اس دن وہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے فریقِ علف کے غلبہ کے ہم معنی تھا، مگر بعد کو اپنے آخری نتیجہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کے فتح و غلبہ کے ہم معنی بن گیا۔ یہی آخری نتیجہ ہے جس کو قرآن میں علام انبویہ نے پیشگی بشارت کے طور پر نبیاں فرمایا۔

حسین کا کردار

پریس کا دور مسلم ملکوں میں انیسویں صدی میں آیا۔ اس زمانہ میں مسلمان غیر معتدل نفسیات کا شکار ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان کا پریس بھی اس سے متاثر ہوا۔ مسلم پریس میں کچھ چیزیں تو خوب چھپنے لگیں اور کچھ دوسری چیزیں اس میں بالکل نہیں چھپیں۔ ظاہر ہے کہ جو چیز ہر وقت میڈیا میں نمایاں کی جا رہی ہو وہ سب کو نظر آئے گی اور جو چیز میڈیا میں نمایاں نہ ہو رہی ہو وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ چنانچہ عملاً مسلم دنیا میں ایسا ہی ہوا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حسن اور حسین تاریخ اسلامی کے دو متین کردار ہیں۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ امام حسین کے کردار سے تو ہر مسلمان مبالغہ کی حد تک واقف ہے، خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا لکھا۔ اس کے برعکس امام حسن کا معاملہ یہ ہے کہ جاہل تو درکنار، موجودہ زمانہ کے عالم بھی ان کے تاریخی کردار سے واقف نہیں۔ فروری ۱۹۷۸ کے ایسا سال میں راقم الحروف نے جب حسن اور حسین کے تقابلی کردار پر ایک مضمون شائع کیا، اس وقت پہلی بار لوگوں کو معلوم ہوا کہ امام حسن کا بھی کوئی قابل ذکر تاریخی کردار ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان جس نفسیات میں مبتلا تھے، اس کے لحاظ سے ان کو حسین کا ماڈل اپنے لیے مفید مطلب نظر آیا، اور حسن کا ماڈل انھیں مفید مطلب دکھائی نہیں دیا۔ چنانچہ امام

حسین پر تو دور پریس میں بے شمار کتابیں اور مضامین اور اشعار چھاپے گئے۔ ان کے تذکرہ پر مستقل جلدیں اور کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ جب کہ دور پریس میں امام حسن کے کردار پر غالباً کوئی ایک بھی قابل ذکر کتاب شائع نہیں ہوئی اور نہ 'یاد حسن' پر کبھی کوئی جلد لکھی گئی۔

تاریخ کے صفحات میں تو حسن اور حسین دونوں موجود تھے۔ مگر موجودہ مسلم میڈیا میں صرف حسین نمایاں ہوئے۔ حسن اس سے بالکل حذف ہو گئے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل صرف حسین کے ماڈل سے واقف ہوئی۔ حسن کا ماڈل اس کے زندہ حافظہ میں باقی نہیں رہا۔

یہی معاملہ اسلامی تاریخ کے دوسرے واقعات کا ہے۔ پریس کے دور میں اسلام کی تاریخ کے صرف ان واقعات کو نمایاں کیا گیا جن میں فوج اور کشور کشائی کی شان پائی جا رہی تھی۔ حاکمانہ حالت کے تذکروں سے تمام مجلسیں اور کانفرنسیں گونج اٹھیں۔ ان کو نمایاں کرنے کے لیے نظم و نثر کا سیلاب بہا دیا گیا۔

مگر متواضع حالت کے لیے اسلام میں کیا نمونہ ہے، اس پر میرے علم کے مطابق، کوئی بھی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جو قابل ذکر ہو یا کوئی حقیقی قیمت رکھتی ہو۔ اس بنا پر قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ اسلام کے ایک کردار کو تو لوگوں نے خوب جانا۔ مگر اسلام کے دوسرے کردار سے وہ بالکل بے خبر ہے۔

بے خبری

اگست ۱۹۸۹ میں مجھے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک مغربی ملک کی یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا: اسلام مغرب میں (Islam in the West) تقریر کے بعد سوال و جواب کے دوران ایک ہندستانی مسلمان نے سوال کیا کہ ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں غیر مسلم اکثریت کا غلبہ ہے اور مسلمان یہاں ایک اقلیتی فرسٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر ایسے ملک میں مسلمانوں کا طریق کار کیا ہونا چاہیے۔

مسلمان پروفیسر نے ایک لمحہ سوچا۔ اس کے بعد کہا کہ یہ ایک مشکل سوال ہے اور اس پر اس نے سرفرو ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اسلام میں حالت قوت (position of strength) کا ماڈل تو موجود ہے۔ مگر اسلام میں حالت فروتنی (position of modesty) کا ماڈل موجود نہیں۔ یہ بات پیغمبر اسلام کی سیرت کے اعتبار سے سراسر خلاف واقعہ ہے۔ کیوں کہ آپ کی سیرت

میں بلاشبہ دونوں حالتوں کا نمونہ موجود ہے۔ البتہ موجودہ مسلمانوں کی اپنی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے یہ بیان سراسر درست ہے۔ کیوں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ موجودہ مسلمان اُس اسلام سے واقف نہیں جس میں حالتِ فروتنی کا نمونہ موجود ہے۔ وہ صرف اس اسلام کو جانتے ہیں جس میں فتح و غلبہ کی حالت کا نمونہ پایا جاتا ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی اسی ذہنی کیفیت کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا اور اب تک مسلمانوں کو اپنے عمل کے لیے فقط آغازِ نازل سکا۔ موجودہ مسلمان عملاً حالتِ فروتنی میں ہیں۔ مگر انہیں معلوم نہیں کہ حالتِ فروتنی سے کیوں کر وہ اسٹارٹ لیں۔ وہ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر حالتِ قوت سے اسٹارٹ لینا جانتے ہیں، مگر موجودہ حالات میں قوت کے معتام سے اسٹارٹ لینا ان کے لیے ممکن نہیں۔

حالتِ فروتنی (پوزیشن آف ماڈسٹی) کے مطابق طریق کار اختیار کرنے کا مطلب حالتِ فروتنی پر باقی رہنا نہیں ہے بلکہ حالتِ فروتنی سے استمداد کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جہاں فی الواقع ہے وہاں سے وہ اپنی جدوجہد حیات کا آغاز کرے۔

اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ جہاں ہے بس وہیں وہ پڑا ہے۔ ہر ایک عمل کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مگر مفید عمل کے لیے صحیح نقطہ آغاز لازمی طور پر ضروری ہے۔ صحیح نقطہ آغاز سے سفر شروع کرنے والا ایک نہ ایک دن اپنی اگلی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ اور جو شخص غلط نقطہ آغاز سے اپنا سفر شروع کرے وہ کبھی بھی کسی حقیقی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہ ایک ابدی فیصلہ ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔

مذکورہ نفسیات کی بنا پر مسلمانوں کا حال اس ریٹائرڈ فوجی جیسا ہو گیا ہے جو صرف بندوق کی گولی کے ذریعہ مسائل کو حل کرنا چاہتا ہو۔ مگر ریٹائر ہونے کے بعد جب اس کی بندوق اس کے پاس نہ رہے تو اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اپنے مسئلہ کو کس طرح حل کرے۔ پڑوسی کا مسئلہ تدریج کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے مگر فوجی اس قسم کی تدبیر سے آشنا نہیں۔ وہ بندوق کی گولی کے ذریعہ مسئلہ حل کرنے سے واقف ہے۔ مگر اب اس کے لیے اس تدبیر کو استعمال کرنے کا موقع نہیں۔

اس صورت حال کی ایک تعابلی مثال یہ ہے کہ انگریز ایک تازہ دم قوم کی حیثیت سے ہندستان

میں داخل ہوئے اور اٹھارویں صدی کے آئینک انھوں نے اپنی برتر طاقت کے ذریعہ برصغیر ہند کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ تمام ظاہری حالات کے مطابق، حیدرآباد کا نظام اور میسور کا ٹیپو دونوں "پوزیشن آف ماڈسٹی" کے درجہ میں پہنچا دیے گئے۔

اس وقت نظام نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی واقعی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے انگریزوں سے صلح کر لی۔ ٹیپو نے اس کے برعکس روشیں اختیار کی۔ انھوں نے اپنی واقعی حیثیت کو ماننے سے انکار کیا۔ ناقابل عبور نابرابری کے باوجود وہ انگریزوں سے لڑا۔ گویا حیدرآباد کے نظام نے پوزیشن آف ماڈسٹی سے اپنے لیے آفاذ کار کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظام اور اس کی ریاست باقی رہی۔ اور ٹیپو اور ان کی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

نظام حیدرآباد کے اس فیصلہ سے مسلمانوں کو بے شمار فائدے حاصل ہوئے۔ وہ اس حیثیت میں باقی رہے کہ وہ ہزاروں مسلمانوں اور مدرسوں اور اسلامی اداروں کو دو سو سال تک مالی تعاون دے سکیں۔ پورے ملک کا بہترین مسلم ذہن حیدرآباد میں جمع ہو گیا جس نے بڑے بڑے کام کیے۔ نظام نے یونیورسٹی اور کالج اور اسکول قائم کیے جس میں لاکھوں مسلمانوں نے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۴۷ء کے انقلاب کے بعد اسی تعلیم کی بدولت حیدرآباد کے مسلمان ملک کے اندر اور ملک کے باہر از سر نو باعزت زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

اس کے برعکس ٹیپو کے جنگی اقدام نے مسلمانوں کو اس قسم کا کوئی فائدہ نہیں دیا۔ البتہ سطحی قسم کے شاعروں اور ادیبوں کو کچھ الفاظ مل گئے جن پر مضمون بنی کر کے وہ مسلمانوں کو خیالی شراب پلاتے رہیں۔

فرق کیلئے

مغربی قومیں جب اسلام پر غالب آئیں تو ہمارے ابتدائی رہنماؤں سے ایک اجتہادی غلطی ہوئی۔ انھوں نے مغربی قوموں کے غلبہ کو سادہ طور پر ایک قوم کے اوپر دوسری قوم کی جارحیت کا مسئلہ سمجھا۔ حالانکہ یہ ایک قوم کے اوپر دوسری قوم کے تفوق کا مسئلہ تھا۔ مغربی قومیں علوم کے تمام شعبوں میں مسلمانوں سے فائق ہو گئی تھیں۔ اس فوقیت کی بنا پر ان کو یہ موقع ملا کہ وہ مسلم قوموں کے اوپر غالب آجائیں

جو علم کی دور میں زمانہ سے پچھڑ گئے تھے۔

مغرب نے ادب کو نئی سا مٹھک زبان دی اور اس کو شاعری کے محدود میدان سے نکال کر نثر کے لامحدود میدان میں پہنچا دیا۔ وہ ادب کو سخن آفرینی کے دور سے نکال کر حقیقت بیانی کے دور میں لے آئے۔ مغرب نے طبیعیات اور فلکیات میں نئے نئے حقائق دریافت کیے، اس طرح انہوں نے علوم کائنات کو قیاسی نظریات کے دور سے نکال کر مشاہداتی نظریات کے دور میں پہنچا دیا۔ انہوں نے انسان کو ذہنی بندشوں کے دور سے نکال کر آزادانہ تحقیق کے دور میں پہنچایا۔

مغرب نے اسٹیم دریافت کیا اور اس کے ذریعہ وہ انسانی تاریخ کو دستکاری کے دور سے نکال کر مشینی دور میں لے آئے۔ انہوں نے جدید قسم کی بندوق اور رائل نقل بنائی۔ اس طرح انہوں نے جنگ کو دستی ہتھیاروں کے دور سے نکال کر دور مار ہتھیاروں کے دور میں داخل کر دیا۔ انہوں نے ریل، ٹیلی گرام، دفانی جہاز جیسی چیزیں ایجاد کیں اور مواصلات (کیونیکیشن) کو حیوانی ترسیل کے دور سے نکال کر مشینی ترسیل کے دور میں پہنچا دیا۔ وغیرہ۔

اس قسم کی دریافتوں نے مغربی قوموں کو نیا حوصلہ دیا۔ جب کہ مسلم قومیں اپنے جمود اور تنزل کی بنا پر نئے حوصلہ سے خالی ہو چکی تھیں۔ مملومات کے افسانے مغربی قوموں کو اس پوزیشن پر پہنچا دیا کہ وہ زیادہ بہتر منصوبہ بندی کر سکیں۔ نئی نئی قوتوں نے مغرب کو اس قابل بنایا کہ وہ زیادہ موثر انداز میں دوسروں کے اوپر اقدام کر سکیں۔ جب کہ مسلم قومیں نئی چیزوں سے محرومی کی بنا پر نئے اقدامات کو سمجھنے کی حیثیت میں بھی نہ تھیں۔

ان حالات میں مغرب کے غلبہ کا مسئلہ حقیقتاً عداوت کا مسئلہ نہ تھا بلکہ فوقیت کا مسئلہ تھا۔ اس اعتبار سے ہمارے رہنماؤں کو اپنی ساری توجہ از سر نو تیاری میں لگا دینا چاہیے تھا۔ مگر انہوں نے اجتہادی فطرت کی بنا پر ساری توجہ مگر اڈ کے محاذ پر لگا دی جس کو انہوں نے جہاد بتایا۔

ہمارے رہنماؤں کے لیے وقت آگیا تھا کہ وہ پوزیشن آف ماڈسٹی (حالتِ فسروٹی) سے اسٹارٹ لیں مگر انہوں نے پوزیشن آف اسٹرنٹھ (حالتِ طاقت) سے اسٹارٹ کیا۔ یہ ہلاکت خیز حد تک غلط اندازہ تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ بھی ہلاکت کے سوا کسی اور شکل میں برآمد نہ ہو سکا۔

مبر و اعراض

السرائر میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی جا رہی ہے کہ وہ ہندو مسلم نزاعات میں مبر و اعراض کی پالیسی اختیار کریں۔ مگر اکثر مسلمان اس نصیحت کو سن کر برہم ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کو بزدلی اور پستی کا سبق دیا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس جو مسلم رہنما مسلمانوں کے سامنے جہاد اور ٹکراؤ کی بات کرتے ہیں، ان کی باتیں مسلمانوں کو خوب پسند آتی ہیں۔ وہ ان مسلم رہنماؤں کے گرد جوق و جھوق اکٹھا ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے اس مختلف رد عمل کا سبب ان کی مذکورہ نفسیات ہے۔ وہ اپنے موجودہ مزاج کی بنا پر اپنے لیے صرف حالت غلبہ سے واقف ہیں۔ وہ اپنے حق میں حالت فروتنی سے واقف نہیں۔ اس مزاج کی بنا پر ہجوم اور استدام کی بات انہیں اپنی حیثیت کے برابر دکھائی دیتی ہے اور مبر و اعراض کی بات انہیں اپنی حیثیت سے کم تر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی جوش و خروش والی باتوں میں ان کے لیے اپیل ہے، مگر السرائر کی سفیدہ باتوں میں ان کے لیے اپیل نہیں۔ وہ جوش و خروش جہاد کے تحت بار بار اقدام کرتے ہیں جو یک طرفہ ہلاکت پر ختم ہوتا ہے۔ مبر و تحمل والے طریقے میں ان کی کامیابی یقینی ہے مگر مبر و تحمل والا طریقہ اختیار کرنے پر وہ راضی نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی میرت اور دوسرے پیغمبروں کے احوال اس معاملہ میں نہایت واضح طور پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ جو شخص بھی کھلے ذہن کے تحت ان کا مطالعہ کرے گا وہ اس معاملہ میں کسی دوسری رائے پر نہیں پہنچ سکتا۔

بنی اسرائیل کی مثال

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح ہے۔ وہ مصر میں یہودیوں کے درمیان پیدا ہوئے۔ یہ یہودی اس وقت کے گویا مسلمان تھے۔ ان کی تعداد مصر میں غالباً ایک ملین سے زیادہ تھی۔ اس زمانہ میں مصر کا مشرک بادشاہ فرعون یہودیوں کے اوپر بہت ظلم کرتا تھا۔ قرآن کے مطابق، یہود نے حضرت موسیٰ سے شکایت کی کہ فرعون ہمارے اوپر ظلم و زیادتی کر رہا ہے۔ ہم اس ظلم کو ختم کرنے کے لیے کیا کریں۔ حضرت موسیٰ نے کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور مبر کرو (الاعراف ۱۲۸) دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہود کو یہ ہدایت دی کہ تم لوگ مصر

میں کچھ گھر مقرر کرو اور اپنے ان گھروں کو قبیلہ بنا لو اور نسا از قائم کرو (یونس ۸۷)

یہود نے اپنی بستیوں میں عبادت خانے بنا رکھے تھے جہاں وہ عبادت کرتے تھے۔ لیکن فرعون نے یا لو ان عبادت خانوں کو ڈھا دیا یا ان میں جا کر عبادت کرنے سے روک دیا۔ اس وقت یہود سے کہا گیا کہ تم اپنے گھروں میں خاموشی سے نسا ز پڑھ لیا کرو تاکہ تم اس میں رہو (المراد صلواتی بیوتکم سرالتأمنا۔ وذلک حین اذافهم فرعون فنامروا بالصبر واتخاذ المساجد فی البیوت والوقوف علی الصلاة والسماء الی ان ینجز اللہ وعدہ) امبا مع لاکلام العترة ۸ / ۷۲ - ۷۱

اس واقعہ پر غور کیجئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کی نگاہ صرف ظالم کے ظلم پر تھی۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگاہ ظالم کے ظلم کے باوجود امکا نی مواقع پر تھی۔ یہود سمجھتے تھے کہ ان کا مسئلہ اس وقت ختم ہو گا جب کہ منرعون ختم ہو۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ نے وحی الہی کی روشنی میں یہ دیکھا کہ فرعون کی موجودگی میں بھی ایک دائرہ کار ہے جہاں ہم کو اپنے دین کی اقامت کا موقع حاصل ہے۔

اس کے مطابق حضرت موسیٰ نے یہود کو نصیحت کی کہ تم فرعون کی روش پر صبر کرتے ہوئے اپنے گھروں کو عبادت خانہ بنا لو۔ فرعون کی طرف سے نظریں ہٹا کر اللہ کی طرف اپنی ساری توجہ لگا دو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسائل پر محنت کرنے کے بجائے مواقع پر محنت کرو۔ غیر حاصل شدہ میدان کار کے لیے زیادہ کرو، بلکہ حاصل شدہ میدان کار کو استعمال کرنے میں لگ جاؤ۔

کی دور، مدنی دور

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ آپ کی زندگی کا ایک ابتدائی دور ہے جس کو کی دور کہا جاتا ہے۔ آپ کی زندگی کا دوسرا دور وہ ہے جس کو مدنی دور کہا جاتا ہے۔ کی دور میں یہ صورت حال تھی کہ ایک طرف دارالسنودہ پر قریش کا مکمل قبضہ تھا۔ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ حج کی عبادت کو انہوں نے غلط طور پر عسی کیلت ڈر کے مطابق جاری کر دیا تھا۔ سود اور شراب عسی حرام چیزیں سماج میں عام طور رائج تھیں، وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں سراسر اسلام کے خلاف تھیں۔ مگر ابتدائی تقریباً ۱۳ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان

چیسوں میں کوئی دخل نہیں دیا۔ اس قسم کی نام ناخوش گوار چیزوں میں کامل مبر کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف عقیدہ کی پر امن دعوت تک محدود رکھا۔ ابتدائی کئی سال تک آپ اور دوسرے اہل ایمان چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ وہ بیت اللہ کے بجائے اپنے گھروں میں نماز ادا کرتے تھے۔

مکہ کی مذکورہ برائیوں میں مداخلت کرنا براہ راست قریش کی قیادت اور ان کے مفادات سے ٹکرانے کے ہم معنی تھا۔ اس کے حالات کئی دور میں موجود نہ تھے۔ البتہ عقیدہ کی پر امن تبلیغ اور خاموش عبادت کے میدان میں آپ کے لیے کام کا موقع موجود تھا۔ چنانچہ آپ نے قریش سے عملی ٹکراؤ والے میدان کو چھوڑ کر اسی ممکن دائرہ کار میں اپنے آپ کو اور دوسرے اہل ایمان کو مصروف کر دیا۔

مدنی دور میں صورت حال بدل گئی۔ اب قریش نے جارحیت کر کے براہ راست جنگ و قتال کا محاذ کھول دیا۔ یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے دعوتی کام کے مواقع شدت سے مجروح ہو گئے۔ اس وقت چند ناگزیر ٹکراؤ کے بعد آپ نے وہ تدبیر اختیار فرمائی جس کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

صلح حدیبیہ یا حدیبیہ پرنسپل کا مطلب یہ ہے کہ فریق ثانی کی ضد (حجت جاہلیہ) سے ایک طرفہ طور پر اعراض کرتے ہوئے اپنے لیے مواقع کار حاصل کرنا۔ کئی دور میں جو فرصت عمل خاموش تقسیم کے ذریعہ حاصل ہوتی تھی، اس تقسیم کو دوبارہ معاہدہ حدیبیہ کے ذریعہ فریق ثانی کی باقاعدہ رضامندی کے ذریعہ ممکن بنا یا گیا۔

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ فریق ثانی کچھ چیزوں کو اپنے لیے قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ کچھ چیزوں کے لیے وہ مجبور لیتا ہے کہ وہ اس کے سیاسی مفاد کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔ حدیبیہ پرنسپل یہ ہے کہ ایسی چیزوں سے اپنی توجہ کو اس حد تک ہٹایا جائے کہ فریق ثانی یہ سمجھنے لگے کہ اس کے سیاسی مفادات محفوظ ہیں اور اس کے قومی وقار کو ٹھیس نہیں پہنچ رہی ہے۔ فریق ثانی کو یہ اطمینان دلا کر اپنے لیے دعوتی مواقع حاصل کرنے کا دوسرا نام حدیبیہ پرنسپل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اصول کو اختیار کر کے مدنی دور میں دوبارہ اپنے لیے دعوت کے مواقع حاصل کیے۔

حدیبیہ پرنسپل، حدیبیہ جیسے حالات میں از سر نو آغاز کار کو پانے کی تدبیر ہے۔ یہ تدبیر اتنی کارگر ہے کہ اس کو اگر صحیح طور پر اختیار کیا جائے تو وہ فتح مبین کے سوا کہیں اور پہنچانے والی نہیں۔

میں نے شرقِ اوسط کے ایک عربی جریدہ میں ایک عرب عالم کا مضمون پڑھا۔ اس مضمون کا عنوان تھا: الجہادُ هو اكلُ الوحيد (جہاد ہی واحدِ حل ہے) مضمون میں بتایا گیا تھا کہ مسلم دنیا اس وقت جن سنگین مسائل سے دوچار ہے اس کا حل صرف یہ ہے کہ امت سرکھٹ ہو کر جہاد اور مقابلہ کے لیے کھڑی ہو جائے۔ میں نے اس مضمون کو پڑھا تو میں نے کہا کہ مسلمانوں کے موجودہ حالات کے اعتبار سے یہ صحیح نہیں کہ ان کو الجہاد جو اکلُ الوحيد کا نعرہ دیا جائے۔ اس وقت صحیح بات یہ ہے کہ امت کو الامتِ ادا ہو اکلُ الوحيد (تیار ہی واحدِ حل ہے) کا پیغام دیا جائے۔ جہاد بلاشبہ اسلام کا ایک رکن ہے۔ مگر جہادِ تیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ تیاری سے پہلے۔

مذکورہ عربی مضمون اس سلسلہ میں کوئی منفرد مثال نہیں۔ آج کل مختلف الفاظ میں عام طور پر یہی بات کہی جاتی ہے۔ ہر کھینے اور بولنے والا امت کو جہاد و قتال کے میدان میں کھڑا ہونے کے لیے ابھار رہا ہے۔ اس قسم کی باتیں بظاہر اس مفروضہ پر کہی جاتی ہیں کہ امت نے ابھی جہاد کے میدان میں قدم نہیں رکھا ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اس کو جہاد کے میدان میں اتارا جائے۔

مگر یہ بات درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے تقریباً تین سو سال سے ملتِ اسلام کا بیشتر حصہ جہاد ہی میں مبتلا ہے۔ جو بات ہے وہ یہ کہ جہاد کا نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے، نہ کہ جہاد نہیں ہو رہا ہے۔ مؤذنین جہاد نے فقدانِ نتیجہ جہاد کو فقدانِ جہاد کے ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جہاد تو بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ لاکھوں لوگوں کی شہادت کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں۔ مگر صدیوں کے جہاد کے باوجود اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے اب اصل مسئلہ جہاد کو روک کر دوسری تدبیر اختیار کرنے کا ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں جہاد کو روک کر دوسری تدبیر اختیار فرمائی۔

جہاد کا یہ ذہن ہندوستان میں بھی پوری طرح پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے شہر میں دسمبر ۱۹۹۱ میں ایک "عظیم الشان مسلم کانفرنس" ہوئی۔ اس کانفرنس کا عنوان تھا: اقدامِ امتِ کانفرنس۔ اس کانفرنس کے کچھ ذمہ دار حضرات مجھ سے ملے۔ میں نے کہا کہ آپ کو اگر کانفرنس کو نام ہے تو "تیار ہی امتِ کانفرنس" کیجئے۔ اقدامِ امتِ کانفرنس کا اس وقت کوئی موقع نہیں۔ کیوں کہ امت اس وقت ہر اعتبار سے تیاری کے مرحلہ میں ہے۔ اور جو گروہ تیاری کے مرحلہ میں ہو اس کا اقدام کی باتیں کرنا سراسر بے معنی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی گسان بیج ڈالنے کے موسم میں فصل کاٹنے کی تقریب منانے لگے۔

فرصت عمل

زندگی میں اصل اہمیت فرصت عمل کی ہے۔ فرصت عمل کو استعمال کرنے ہی کا نام عمل ہے۔ فرصت عمل یا مواقع عمل کو استعمال کر کے ہی کوئی فرد یا کوئی مجموعہ افراد ترقی کی منزل تک پہنچتا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کا نہیں۔

تاہم اس دنیا کے لیے خدا کا فتاویٰ یہ ہے کہ یہاں میسر کے ساتھ عسر بھی ہمیشہ موجود رہے۔ چنانچہ یہاں فرصت عمل کے ساتھ موانع عمل بھی ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں فرصت عمل کو استعمال کرنے کے لیے صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ یعنی جو چیز بروقت قابل حصول نہیں ہے اس سے محرومی کو برداشت کرتے ہوئے قابل حصول پر قناعت کرنا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہمت من مصروف ہو جانا۔ اس صبر کے بغیر آدمی یہاں پانے والی چیز کو بھی نہیں پاسکتا۔ ناممکن پر وقتی صبر کرنے کے بعد ہی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ممکن کو حاصل کرنے میں اپنی ساری طاقت لگا سکے۔ اس دنیا میں کچھ چیزوں کو صبر کے خانہ میں ڈالنا ہے اور کچھ چیزوں کو عمل کے خانہ میں۔ اسی کا نام حکمتِ کار ہے۔ اگر آپ ایسا کریں کہ جس چیز کو صبر کے خانہ میں ڈالنا ہے اس کو عمل کے خانہ میں ڈال دیں تو آپ کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اس فرصت عمل کو پانے کی دو صورتیں ہیں۔ اور دونوں کی نہایت اعلیٰ مثالیں اسلام کی دور اول کی تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ پہلی صورت کی واضح مثال کی دور میں ہے اور دوسری صورت کی واضح مثال مدنی دور میں۔

باب سوم

مسائل ملت

مسلمانوں کے موجودہ مسائل کا قرآنی حل — یہ وہ موضوع ہے جس پر مجھے ان صفحات میں اظہارِ خیال کرنا ہے۔ یہ سوال بظاہر ایک سادہ سا سوال معلوم ہوتا ہے۔ مگر نظری اعتبار سے سادہ ہونے کے باوجود، عملی اعتبار سے وہ سادہ سوال نہیں۔ قرآن میں اگرچہ اس کا واضح جواب موجود ہے، مگر اس جواب کو پانا اور اس کو اختیار کرنا بلا شبہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔

”آج کون سی تاریخ ہے“ اس سوال کا جواب معلوم کرنا ہو تو ہر شخص اس کو نہایت آسانی کے ساتھ جان لے گا۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ آج سینپٹر کا دن ہے اور فروری کا مہینہ، تو اپنی دیوار کا کلنڈر دیکھ کر آپ نہایت آسانی کے ساتھ جان لیں گے کہ آج کیا تاریخ ہے۔ آپ کلنڈر میں فروری کا صفحہ کھولیں گے اور پھر سینپٹر کے خانہ میں دیکھیں گے تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ آج فروری ۱۹۹۰ کی دس تاریخ ہے

مگر قرآن سے اس طرح کنکریکل انداز میں مذکورہ سوال کا جواب معلوم کرنا ممکن نہیں۔ آپ کے پاس پورا قرآن موجود ہو۔ آپ عربی زبان جانتے ہوں، حتیٰ کہ آپ کسی مدرسہ میں شیخ التفسیر کے جلد سے پرفائز ہوں تب بھی یہ پیچیدگی بدستور باقی رہے گی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلنڈر سے تاریخ نکالنے کا معاملہ صرف ایک فنی معاملہ ہے۔ مگر مسلمانوں کے مسائل کا قرآنی حل جاننے کا معاملہ، اسی کے ساتھ امتحان کا معاملہ بھی ہے۔ اس کا امتحان کا معاملہ ہونا اس کو انتہائی آسان ہونے کے باوجود، انتہائی مشکل بنا دیتا ہے۔

سنت امتحان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے موجودہ دنیا میں اس لئے رکھا ہے کہ اس کا امتحان لے (المائدہ ۲) موجودہ دنیا کی تمام چیزیں اسی مقصد حیات کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہر ہدایت کے ساتھ ہمیشہ ایک شبہ کا عنصر (element to doubt) موجود رہتا ہے۔ تاکہ آدمی کا امتحان لیا جائے کہ وہ خدا کی وحی کو مقل سے شبہ کا پردہ پھاڑتا ہے یا نہیں۔ اس دنیا میں ہدایت صرف اس شخص کو ملتی ہے جو شبہ

کے پردہ کو چھاڑ کر سچائی کو اس کی بے حجاب صورت میں دیکھ سکے۔ جو شخص اس امتحان میں پورا نہ
 اترے اس کو موجودہ دنیا میں کبھی ہدایت نہیں ملے گی۔

اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت پر غور کیجئے:

وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم فرشتہ اتاریں تو پھر معاملہ کا فیصلہ
 ہو جائے۔ اس کے بعد انھیں کوئی ہمت نہ ملے۔ اور اگر ہم کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے تب بھی اس کو آدمی
 ہی کی صورت میں بھیجتے۔ اور لوگوں کو اسے شہدہ میں ڈال دیتے جس شبہ میں وہ اب ہمت لاہور ہے
 ہیں (الاضواء ۹)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی ہدایت کبھی اس طرح برہنہ صورت میں نہیں آتی کہ آدمی کے لئے اس
 میں کچھ بولنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ فرشتہ اگر اپنی اصل صورت میں خدا کا پیغام لے کر ظاہر ہو جائے
 تو کون ہو گا جو اس کے نمائندہ خدا ہونے پر شبہ کرے۔ اس لئے خدا اپنے پیغام کی پیغام رسانی کا
 کام انسانوں میں سے کسی انسان کے ذریعہ کرتا ہے تاکہ پیغام کی سچائی کے باوجود اس میں شبہ کا ایک
 پہلو باقی رہے۔

یہی اس دنیا کے لئے خدا کا مقصد ہے۔ یہاں جب بھی ہدایت ظاہر ہوتی ہے، اس میں
 شبہ کا ایک پہلو بھی ضرور شامل رہتا ہے۔ یہی آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہاں شبہ کے پردے
 کو چھاڑنا پڑتا ہے۔ جو آدمی شبہ کے پردے کو چھاڑ دے، وہ ہدایت کو اس کی برہنہ صورت میں
 دیکھ لے گا اور جو آدمی شبہ کے اس پردے کو چھاڑنے میں ناکام رہے، وہ ہدایت کو پانے میں بھی
 ناکام رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر بصیرت کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ یہ بصیرت گویا ایک قسم کی
 خدائی کسوٹی ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی بصیرت کو بے آئینہ روپ میں استعمال کریں، وہ اس
 امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس بصیرت کو بے آئینہ روپ میں استعمال نہ کر سکیں وہ
 ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مسائل کے قرآنی حل کو پہچاننے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ کیوں کہ جب بھی قرآن کے
 حوالے سے اس کا بتایا ہوا اصل پیش کیا جاتا ہے، تو خواہ وہ کتنا ہی مدلل اور ثبوتی ہو، اس میں شبہ

کا ایک پہلو ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ اس شبہ والے پہلو میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ ہدایت کے واضح ہونے کے باوجود وہ اس کو اپنی زندگی میں اختیار نہیں کرتے۔

دور اول کی مثال

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجئے۔ قدیم مکہ میں ایک شخص تھا۔ اس کا نام روایات میں الحارث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف بتایا گیا ہے۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کی دعوت پیش تو اس نے اپنی قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ سے کہا:

انا نعلم ان الذی تقول حق وکنا ان
 اتبعناک نخفنا ان تخرجنا العرب من
 ارض مکة (التفسیر المظہری ۴/۱۴۴)

ہم جانتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ بلاشبہ حق ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے کہ عرب ہم کو مکہ کی سرزمین سے نکال دیں گے۔

شان نزول کی روایات کے مطابق، قرآن کی سورہ نمبر ۲۸ میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ اس ہدایت کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے کہ ہم کو ہماری زمین سے اُچک لیا جائے گا (وَقَالُوا اِنْ تَتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَنَا نَنْصَلِفْ مِنْ اَرْضِنَا . اقصم ۵۷)

قدیم مکہ میں وہاں کے لوگوں کی سرداری اور معاش دونوں کا خاص ذریعہ شرک تھا۔ انھوں نے یہ کیا تھا کہ مکہ کے تمام قبیلوں کا بت کعبہ میں رکھ دیا تھا۔ چنانچہ کعبہ میں ۳۶۰ مختلف بت جمع ہو گئے تھے۔ اس طرح مکہ کے لوگوں کو عرب کے تمام قبیلوں کی سرداری حاصل ہو گئی تھی۔ اسی کے ساتھ ان کو یہ معاشی فائدہ بھی تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اپنے اپنے بتوں پر نذر چڑھانے کے لئے مکہ آتے تھے۔ یہ تمام نذرانے کہ والوں کو ملتے تھے۔ اس طرح شرک مکہ والوں کے لئے بیک وقت قیادت کا ذریعہ بھی تھا اور معاشیات کے حصول کا ذریعہ بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کیا تو ان کی نظرت نے اس کے برحق ہونے کی تصدیق کی۔ مگر ان کا ذہن اس سوال میں اٹک گیا کہ اگر وہ یہ کہیں کہ خدا صرف ایک ہے۔ بقیہ تمام دیوتا فرضی ہیں، تو وہ اچانک تمام مشرک قبائل سے کٹ جائیں گے۔ اس کے بعد ان کی سرداری بھی ان سے چھین جائے گی اور ان کی معاش بھی۔ ہدایت کے واضح ہونے کے باوجود ایک شبہ ان کے لئے قبولیت کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔

ہندستانی مسلمان

ہندستانی مسلمانوں کا حال بھی موجودہ زمانہ میں یہی ہو رہا ہے۔ مختلف مشبہات کی بنا پر وہ قرآن سے رہنمائی لینے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے جب قرآن کی بات رکھی جاتی ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق یہی بات درست ہے۔ مگر فوراً ہی کچھ سوالات سامنے آکر انہیں اس کی طرف سے شبہ میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ اپنے شبہات کی بنا پر قرآن کو اپنانے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

مثلاً جب ان کے سامنے صبر و اعراض کی آیتیں پیش کی جائیں تو وہ اس شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم قومی معاملات میں صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو ہندو ہمارے اوپر دلیر ہو جائے گا۔ جب ان کے سامنے قرآن کا دعوتی اور تعمیری پیغام رکھا جائے تو انہیں یہ شبہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اگر ہم سیاست کی ہم نہ چلائیں تو ہم ملک میں ہونے والے سیاسی عمل سے کٹ جائیں گے۔ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ بند و تہار سے لئے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں اور مدعو سے مطالبہ اور احتجاج کو قرآن میں منع کیا گیا ہے، تو فوراً وہ یہ شبہ پیش کر دیں گے کہ اگر ہم مطالبہ اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ دیں تو اس ملک میں ہم اپنے دستوری حقوق سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ وغیرہ۔

آج کے سوال کے بارہ میں اصل مشکل یہی ہے۔ قرآن بلاشبہ ایک کامل اور مفصل کتاب ہے۔ اس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام سوالات کا واضح جواب موجود ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی سنت النہاس (الافہام ۹) کی بنا پر ان تمام جوابات میں شبہ کا ایک عنصر بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آج کا مسلمان چاہنے کی میزان پر کھڑا ہوا ہے۔ اگر وہ مشبہ کا پردہ پھاڑ کر قرآن کی طرف بڑھے تو وہ یقیناً اپنے مسائل کا قرآنی حل پالے گا۔ اور اگر وہ شبہ کی بات میں اٹک جائے تو کوئی بھی آیت یا کوئی بھی حدیث اس کو رہنمائی دینے کے لئے کافی ثابت نہیں ہوگی۔

اب یہ مسلمانوں کے موجودہ مسائل کے قرآنی حل پر کلام کروں گا۔ اس سلسلے میں میری گفتگو کے تین حصے ہوں گے۔ اور ہر حصہ کی بنیاد قرآن کی ایک واضح آیت پر ہوگی۔

تحفظ کا مسئلہ

ہندستان کے مسلمانوں، خاص طور پر شمالی ہند کے مسلمانوں، کے نزدیک ان کا نبرا ایک

مسئلہ جان و مال کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ وہ سب سے زیادہ اسی مسئلہ پر سوچتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں سب سے زیادہ اسی سوال پر متوجہ رہتی ہیں۔ اس سوال کو ذہن میں رکھ کر اگر ہم قرآن کو پڑھنا شروع کریں تو اس کو پڑھتے ہوئے ہم سورہ السائدہ کی اس آیت (نمبر ۶۷) پر پہنچیں گے جس میں تحفظ کے مسئلہ کا جواب نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں موجود ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ
إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا
بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ
مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْكَافِرِينَ

اے پیغمبر جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہِ گمراہی نہیں دکھاتا۔

اس آیت پر غور کیجئے۔ اس میں عبارت النص کی سطح پر یہ بات نکل رہی ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ جب بھی مسلمانوں کو موسس ہو کہ ان کے لئے غیر اقوام کی طرف سے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے تو انہیں فوراً دعوت الی اللہ کے کام میں مشغول ہو جانا چاہئے اور اس کو اس کے تمام ضروری آداب کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ یہی تحفظ کے مسئلہ کا سب سے زیادہ یقینی حل ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرتی ہے تو عین اس وقت ہی اس کے لئے دشمن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت کو بدل دے۔ یہ فطرت پیدا نشی طور پر اسلام کی طالب ہوتی ہے۔ ہر آدمی اپنی ابتدا الی فطرت کے اعتبار سے دین اسلام پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر دشمن امکانی طور پر ان کا دوست ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا جائے تو وہ اسلام قبول کر لے گا۔ اور جب وہ اسلام قبول کر لے گا تو وہ بھی مسلمانوں کی ملت میں شامل ہو کر ان کا جزء بن جائے گا۔ اور اس کے بعد مسلمانوں کا مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

تاریخ نے بار بار قرآن کے اس اصول کی تصدیق کی ہے۔ دور اول میں عرب کے مشرکین نے ابتداً رسول اللہ کی سخت مخالفت کی مگر آپ ان کی مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے صبر اور حکمت

کے ساتھ انہیں اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف بیس سال کے مختصر عرصہ میں تمام عرب قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جو لوگ بنظاہر آپ کے دشمن تھے، وہ آپ کے دوست اور ساتھی بن گئے۔ اسلام کے سپاہی بن کر انہوں نے اسلام کی عالمی تاریخ بنائی۔

۱۳ ویں صدی عیسوی میں تاتاری قبائل ایک وحشی طوفان بن کر اٹھے اور انہوں نے سمرقند سے لے کر ہندو تک مسلمانوں کے تمام مٹی نشاہت کو مٹا ڈالا۔ ہندو کی عباسی خلافت ان کی فوجی یلغار کی تاب نہ لا کر ختم ہو گئی۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ مسلمانوں کے قومی کنٹری سے اسلام کی دعوتی قوت ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ اسلام کے عقیدہ نے فاتح تاتاریوں کو سنبھلنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سچاس برس میں پوری تاریخ بدل گئی۔ مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح بن گئے۔ بلا کہ انہوں نے مسلم دنیا کی جن مسجدوں کو ڈھایا تھا، اس کے پوتوں نے ان مسجدوں کو دوبارہ بنایا۔ اور ان مسجدوں میں خدا نے واحد کے سامنے جھک کر اپنے ججز کا اعتراف کیا۔

اسلامی تاریخ کا یہی واقعہ ہے جس کا ذکر علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ میں آل انڈیا مسلم لیگ دہلی آباد کے اجلاس میں اپنا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے اس طرح کیا تھا کہ — مسلمانوں کی تاریخ سے مجھے یہ سبق ملتا ہے کہ ان کی تاریخ کے نازک مواقع پر یہ اسلام تھا جس نے مسلمانوں کو بچایا یا نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو:

One lesson I have learnt from the history of Muslims. At critical moments in their history it is Islam that has saved Muslims and not vice versa.

یہی بات اقبال نے عوامی انداز میں اپنے اس شعر میں کہی ہے :

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے پاساں مل گئے کعبہ کو صنم خزانے سے

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو ماضی کے اعتبار سے سمجھا۔ مگر اس کو انہوں نے حال کے اعتبار سے دریافت نہیں کیا۔ انہیں یہ تو دکھائی دیا کہ گزری ہوئی تاریخ میں اسلام کی دعوتی طاقت نے مسلمانوں کو بچایا ہے مگر حال کے اعتبار سے وہ اس طاقت کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۳۰ میں جغرافیائی تقسیم کو ہندستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل بتایا۔ حالانکہ

انہیں مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا چاہئے تھا کہ تم غیر اقوام کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرو۔ اس کے بعد تمہارے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے جس طرح وہ ماضی میں حل ہو گئے۔

کسی قوم کے رہنما اور دانشور ہی وہ لوگ ہیں جو پوری قوم کا ذہن بناتے ہیں۔ ان کی تقریریں اور تقریریں لوگوں کو کسی ایک طرف یا دوسری طرف لے جاتی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مشکل یہ ہے کہ ان کے رہنماؤں اور دانشوروں میں دعوتی ذہن موجود نہیں۔ وہ صرف قومی طرز فکر کو جانتے ہیں۔ اور ہمیشہ قومی طرز فکر کے مطابق لکھتے اور بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ملک کے قومی مسائل تو دیکھ لیا دیتے ہیں۔ مگر انھیں ملک کے دعوتی امکانات نظر نہیں آتے۔

اس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں وہ لوگ آباد ہیں جن کو اچھوت یا پست اقوام کہا جاتا ہے۔ ہندو مذہب اور روایات اس میں مانع ہیں کہ ان کو ملک میں برابر کا سماجی درجہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ مستقل طور پر مایوسی اور ذہنی انتشار میں مبتلا رہتے ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر (۱۹۵۶-۱۸۹۳) ایک اچھوت خاندان میں پیدا ہوئے۔ مگر انھوں نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہاں تک کہ وہ چوٹی کے دانشور بن گئے۔ اپنی ذہنی اور علمی خصوصیات کی بنا پر انھوں نے پوری اچھوت برادری میں واحد نمائندہ لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کو اس بات کی بہت زیادہ فکر تھی کہ وہ اپنی قوم کو اوپر اٹھائیں اور ان کو ملکی سماج میں برابر کی کا درجہ دیں۔ ہندو ازم اور ہندو سماج کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندو دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اپنی قوم کو یہ درجہ نہیں دلا سکتے۔ دوسری طرف اسلام کے مطالعہ نے انھیں بتایا کہ یہ مطلوبہ درجہ ان کو اور ان کی قوم کو نہایت کامیابی کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے اگر وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی پوری برادری کے ساتھ اسلام قبول کر لیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مختلف تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسلام پست طبقات کو وہ سب کچھ دیتا ہے جس کی

انہیں ضرورت ہے۔ اقتصادی اعتبار سے اسلام کے ذرائع لامحدود ہیں۔ سابق اعتبار سے مسلمان پورے انڈیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مسلمان ملک کے ہر صوبے میں موجود ہیں اور وہ پست طبقات کے نو مسلموں کی پوری مدد کر سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے پست طبقات وہ تمام حقوق پائیں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں:

Islam, seems to give the Depressed Classes all they need. Financially, the resources behind Islam are boundless. Socially, the Mohammedans are spread all over India. There are Mohammedans in every province and they can take care of new converts from the Depressed Classes and render them all help. Politically the Depressed Classes will get all the rights which Mohammedans are entitled to.

Politics of Conversion, New Delhi, 1986, p.321

واقعات بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر امبیڈکر اسلام کے بالکل قریب آچکے تھے اور عین ممکن تھا کہ وہ اپنی پوری برادری کے ساتھ اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو جائیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو وہ اعلان کیا جس کو ایو لائڈ بیکر لیشن (Yeola Declaration) کہا جاتا ہے۔ اس اعلان میں انہوں نے ۴۰ ملین ہریجنوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے موجودہ مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہو جائیں (صفحہ ۳۲۲)۔

مگر مسلم لیڈروں میں سے کسی بھی قابل ذکر شخص نے ڈاکٹر امبیڈکر کی طرف توجہ نہ کی۔ حتیٰ کہ کسی نے ان سے ملاقات کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ دوسری طرف عین اسی زمانہ (۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان) مسلمانوں نے ہمیشہ قوم پرست مفاہرہ کیا کہ انہیں ملک کی تقسیم کے سوا کسی اور چیز سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ مسلم رہنماؤں نے ہریجنوں کو اسلام کے سایہ رحمت میں داخل کرنے سے کوئی حقیقی دل چسپی نہ لی۔ انہوں نے اپنی ساری دل چسپی اس بات کے لئے دکھائی کہ ملک سیاسی اعتبار سے دو حصوں (ہندو انڈیا، مسلم انڈیا) میں بانٹ دیا جائے۔

مسلمانوں کی یہ قومی پالیسی ڈاکٹر امبیڈکر کی امیدوں کے سراسر خلاف تھی۔ انہوں نے قدرتی طور پر یہ سمجھا کہ بٹوارہ کے بعد وہ اور ان قوم ہندو انڈیا میں باقی رہے گی۔ کیونکہ ہریجن زیادہ تر اسی علاقہ میں آباد تھے۔ تقسیم کے بعد مسلمان اس حیثیت میں نہ ہوں گے کہ وہ ان کی کوئی مدد کر سکیں۔ دوسری طرف وہ تبدیلی مذہب کے نتیجہ میں مستقل طور پر ہندو غنڈہ ناک کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔

چنانچہ انہوں نے اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مسلم رہنماؤں میں اگر دعوتی ذہن ہوتا تو وہ سمجھتے کہ بہت طبقات کو اسلام میں داخل کر کے اگر وہ ان کا درجہ اونچا کریں تو یہ خود ان کے لئے بھی حد درجہ مفید ہوگا۔ اس کے بعد ان کی آبادی ملک میں مجموعی طور پر تقریباً ۵۰ فی صد ہو جائے گی۔ اور اگر آئندہ تبلیغی عمل کو جاری رکھا جائے تو قریبی مستقبل میں وہ پچاس فی صد سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی کہ وہ "پاکستان" کی صورت میں اپنے لئے سیاسی پناہ کا ایک گوشہ تلاش کریں۔ مگر مسلم رہنماؤں کے غیر قرآنی ذہن کا یہ نقصان ہوا کہ انہیں قومی خطرات دکھائی دئے مگر انہیں دعوتی امکان نظر نہ آیا۔

دعوت الی اللہ سے عصمت من الناس کا فائدہ حاصل ہونا اتنا یقینی ہے کہ وہ کسی براہ راست کوشش کے بغیر اپنے آپ حاصل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ مسلمان اپنی کسی نادانی سے اس کے عمل میں رکاوٹ ڈالنے کا سبب نہ بنیں۔

اس کا زندہ ثبوت ۱۹ ویں صدی اور پھر ۲۰ ویں صدی کے آغاز کی تاریخ ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام نہایت تیزی کے ساتھ ہندوستان میں پھیل رہا تھا۔ ہر روز بلامبالغہ ہزاروں آدمی اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ اگر اس عمل کو بدستور جاری رہنے دیا جاتا تو کسی اقبال یا جناح کی ضرورت نہ تھی جو ہزارہ کی صورت میں مسلمانوں کے مسئلہ کا حل تجویز کرے۔ مگر پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۳ء) کے بعد مسلمانوں میں جو قومی تحریکیں اٹھیں، جس کا آخری عروج آل انڈیا مسلم لیگ تھی، اس نے سارا نقشہ بگاڑ دیا۔ ان تحریکوں نے انتہائی غیر دانش مندانہ طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کو بے باقوں کو ابھارا۔ انہوں نے اپنی دھواں دھار کارروائی کے ذریعہ دونوں قوموں میں نفرت کی ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دی۔ مسلم لیگ کے یہی نفرت انگیز سیاست ہے جس نے اسلام کی اشاعت کے اس سیلاب کو روک دیا جو محض سلطنت کے زوال کے بعد انیسویں صدی میں اس ملک میں جاری ہوا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو مستقبل کی تعمیر کے لئے دو میں سے ایک کام کرنا تھا۔ یا تو وہ بچے داعی بن کر دوسری قوموں کو اپنا مذہب بناتے اور صبر اور حرکت کے ساتھ انہیں اسلام کی دعوت دیتے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے تو دوسرا کام ان کے کرنے کا یہ تھا کہ وہ اسلام کی فطری اشاعت کے عمل میں

کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کریں۔ وہ اس معاملہ میں خاموش ہو جائیں اور اسلام کو اپنی ذاتی طاقت سے آگے بڑھنے کا موقع دیں۔

مسلمان ان دونوں میں سے جو بھی طریقہ اختیار کرتے اس کا نتیجہ جلد یا بدیر ایک ہی نکلتا۔ مگر وہ نہ اسلام کے براہ راست داعی بن سکے اور نہ بالواسطہ معاون۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صدی کی پرشور اور ہنگامہ خیز سیاست کے باوجود ان کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔

موجودہ مسلمان

آج بھی ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہی ہے۔ اس موقع کو استعمال کرنے کا میدان اب بھی ان کے لئے کھلا ہوا ہے۔ آج بھی اگر ان کے اندر داعیانہ ذہن پیدا ہو جائے تو آج بھی وہ اس میدان میں متحرک ہو کر اس کے تمام فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ سورہ المائدہ (۶۷) میں خدا کی جو سنت بتائی گئی ہے، وہ ایک ابدی سنت ہے۔ وہ جس طرح ماضی کے لئے تھی، اسی طرح وہ آج کے لئے بھی ہے، اور وہ قیامت تک اسی طرح باقی رہے گی۔

انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ آج بھی جو انسان پیدا ہو رہے ہیں وہ یقیناً فطرت اللہ پر پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا انسان بھی اپنی پیدائشی فطرت کے تحت اس کا منتظر ہے کہ کوئی آئے اور اس کی فطرت کے دروازے کو کھٹکھٹائے، تاکہ وہ اپنے خالق کے سکھانے ہوئے سبق کے مطابق اس کا جواب دے سکے۔

تاہم اس دعوتی امکان کو حاصل کرنے کے لئے ایک شرط لازمی طور پر ضروری ہے، اور وہ صبر و اعراض ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں داعی بننے کے لئے یہ کرنا ہو گا کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ اپنے تمام نزاعات کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔ یہ ختم کرنا مضمومی طور پر نہ ہو، بلکہ دل کی گہرائی کے ساتھ ہو۔ اب تک وہ دوسری قوم کو اپنا حریف بنانے ہوئے تھے۔ اب انہیں دوسری قوم کو اپنا دعوتی محبوب بنانا ہو گا۔ انہیں اس حد تک ان کا خیر خواہ بننا ہو گا کہ ان کے دل سے دوسری قوم کے لوگوں کے لئے دعائیں بھیجے جائیں۔

جس دن مسلمان ایسا کریں گے، اسی دن اس ملک میں دعوتی عمل کا آغاز ہو جائے گا، اور اسی کے ساتھ وہ نتیجہ بھی ظاہر ہونا شروع ہو جائے گا جو دعوت الی اللہ کے ساتھ اللہ نے ابدی طور پر مقدر کر دیا ہے۔

عسر کے ساتھ لسیر

قرآن میں ایک نہایت اہم اصول یہ بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا بھی ایک طرفہ طور پر کسی کے لئے فیبر موافق نہیں ہو سکتی۔ خدا کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں ہمیشہ مشکل کے ساتھ آسانی بھی موجود رہے گی۔ کوئی شخص یا قوم جب بھی کسی عروزی سے دوچار ہو تو یقینی طور پر وہیں اس کے لئے امکانات اور مواقع کا نیا دروازہ بھی کھلا ہوا ہوگا۔ یہ اصول قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (الدُّرُجَاتُ ١١)

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اس دنیا میں نہ صرف یہ ہے کہ ہر مشکل کا ایک کامیاب حل ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ بلکہ مزید اطمینان بخش بات یہ ہے کہ مشکل کے مقابلہ میں حل کی مقدار دوگنا ہوتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے کہ لَنْ يَغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرًا (ایک مشکل دو آسانی پر غلب نہیں آسکتی)

ہندوستان کے مسلم رہنما اور دانشور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مسلسل یہ اعلان کر رہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے مشکلات ہیں۔ یہاں ان کے خلاف تعصب اور ظلم کیا جاتا ہے۔ ہر نکلنے اور بولنے والا روزانہ یہی بات دہرا رہا ہے۔

مگر اس قسم کے بیانات خدا کی کتاب کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ مسلمان خدا کی کتاب کے بیانات پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر انھیں خدا کی کتاب پر یقین ہوتا تو وہ مشکل پیش آنے کی صورت میں آسانی کو تلاش کرتے۔ اس کے بعد وہ جان لیتے کہ جہاں مشکل پائی جا رہی تھی، وہیں آسانی (اس کا حل) بھی دگنا مقدار میں موجود تھا۔ اس کے بعد ان کے لئے مسلمان کرنے کی چیز مسئلہ کا حل ہوتا نہ کہ صرف مسائل اور مشکلات۔

ہندو مسئلہ

ہندوستان کے مسلمانوں کا عام ذہن یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو ان کے حق میں متعصب اور ظالم ہے۔ ہندوؤں کے تعصب اور عناد نے ان کے لئے ناقابل حل مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ اس ملک میں ان کے لئے باعزت زندگی گزارنے کے تمام دروازے بند ہیں۔

گر یہ رائے جن ہندوؤں کے تجربات کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے وہ زیادہ تر عام قسم کے ہندو ہیں۔ وہ ہندو جو جلسہ اور جلوس کی بھیڑ میں اضافہ کرتے ہیں۔ جو سڑکوں پر جمع ہو کر نعرہ لگاتے ہیں۔ جو ناسد کے مومن پر لڑتے اور جلاتے ہیں۔ یہ سب ہندو عوام ہوتے ہیں نہ کہ ہندو خواص۔ مسلمانوں کو ہندو عوام یا ہندو فرقہ پرستوں کی طرف سے جو تجربہ ہو رہا ہے، اس کو وہ پوری ہندو قوم پر چسپاں کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہندو سب کے سب ان کے مخالف ہیں۔

گر یہ رائے خطرناک حد تک خلاف واقع ہے۔ ہندوؤں کا مذہبی طبقہ اور ہندو عوام دونوں میں بلاشبہ ایک ایسا گروہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ عناد رکھتا ہے۔ مگر ہندوؤں کا خواص طبقہ جس نے جدید طرز پر تعلیم حاصل کی ہے، اس کی بہت بڑی اکثریت فرقہ دارانہ عناد اور شومشہ کی سیاست میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتی۔ مزید یہ کہ یہی ہندو خواص ہیں جو اپنی تعلیم کی بنا پر ملک کے تمام کلیدی عہدوں پر قابض ہیں۔ وہی ملک کا پورا سیاسی اور اقتصادی نظام چلا رہے ہیں۔ اخبارات اور تمام اشتاعتی ادارے انہیں کے تحت چل رہے ہیں۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک حوالہ دوں گا۔ ٹائٹس آف انڈیا (۹ فروری ۱۹۹۰) میں ایک مفصل آرٹیکل چھپا ہے۔ اس کے نکتے والے مشر چندن مترا ہیں، اور اس کا عنوان ہے:

Militant Hinduism is self-limiting

مضمون بنگالہ آباد کے لاکھ میلا (جنوری ۱۹۹۰) میں موجود تھے جہاں دشنو ہندو پریشد نے اپنا "عظیم الشان" جلسہ کیا تھا۔ وہ دشنو ہندو پریشد اور دوسری فرقہ پرست ہندو جماعتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اگرچہ "رام جنم جیوتی" کا جذباتی اشلو لے کر عوامی ہندوؤں کی ایک بھیڑا پنے گرد جمع کر لی ہے اور نومبر ۱۹۸۹ء کے اگلشن میں وقتی کامیابی بھی حاصل کی ہے، مگر مذہب کے نام پر اٹھنے والی ان ہندو جماعتوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے طبقہ خواص کو اب تک اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔

وہ لکھتے ہیں کہ تاہم لہجے پی کا مسئلہ یہ ہے کہ دسیوں سال کی سنت کوشش کے باوجود وہ اس میں ناکام رہی ہے کہ سیکولر شہری ہندوؤں سے اپنے حق میں فکری جواز حاصل کر سکے جو کہ عوام کی رائے کو کمزور کرتے ہیں۔ اور یہ بیدار قیاس ہے کہ مستقبل قریب میں وہ اپنی اس کوشش

The BJP's problem, however, is that despite decades of strenuous effort, it has failed to acquire intellectual legitimacy from the secularised, urban Hindus who dominate public opinion. And it is unlikely to succeed in this endeavour in the foreseeable future.

مذہبی طبقہ اگرچے مذہب پر ہوتو وہ انصاف پر کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ مگر جب مذہبی طبقہ میں بگاڑ آجائے تو اس کے پاس تعصب کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی جس پر وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔ ہندوؤں کا موجودہ مذہبی طبقہ حقیقتاً ایک بگڑا ہوا مذہبی طبقہ ہے، اس لئے اس کا مذہب تمام تر تعصب پر مبنی ہے۔ وہ مذہبی سچائی پر نہیں بلکہ مسلم عناد کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔

ہندو عوام کا معاملہ بھی ایک اور اعتبار سے یہی ہے۔ ہندو عوام کی اکثریت جاہل اور غریب ہے۔ وہ ایک بے شعور انسانوں کی بھیڑ ہے۔ ایسے لوگوں کو کوئی بھی شوٹ کی بات کہہ کر بھڑکایا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک ترقی ملی مثال یہ ہے کہ ہندو عوام پچھلی نصف صدی سے زیادہ تر کانگریس کو ووٹ دیتے آ رہے تھے۔ مگر ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ہونے والے الیکشن میں فرقہ پرست ہندو جماعتوں نے اپنے عوام کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ راجیو گاندھی ایک سیکولر آدمی ہے۔ وہ خود پارسی کالڑا کا ہے، اور ایک عیسائی عورت سے شادی کئے ہوئے ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اجمودھی میں مقدس رام مندر کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر شمالی ہند کے ہندو بھڑک گئے اور انھوں نے مخالفانہ ووٹ دے کر راجیو گاندھی کی پارٹی کو شمالی ہند میں ہرا دیا۔

ان اسباب سے مسلمانوں کے لئے عقل مندی کی بات یہ ہے کہ وہ اختلافی معاملات کو ہندو خواص کی سطح پر لا کر حل کریں۔ وہ اس کو ہندو عوام (مذہبی طبقہ اور عوامی طبقہ) تک نہ جانے دیں۔ موجودہ ہندو قوم میں دو مختلف طبقے کا ہونا قرآن کے اس اصول کے عین مطابق ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عسکر کے ساتھ یسیر موجود رہتا ہے۔ ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ اگر مسلمانوں کے لئے عسکر کے درجہ میں ہے، تو انھیں ہندوؤں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مسلمانوں کے لئے یسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہبی طبقہ کے اندر اگر مسلمانوں کے خلاف تعصب و عناد ہے، تو تعلیم یافتہ طبقہ اپنی روشن خیالی کی بنا پر مسلمانوں کے معاملہ میں انصاف کا اور حقیقت پسندی کا فیصلہ کرتا ہے۔

مزید یہ کہ قانون الہی کے مطابق، یہاں بھی عسر کے مقابلہ میں یُسْر کی طاقت زیادہ ہے۔ ہندوؤں کے فرقہ پرست طبقہ کے پاس صرف جذباتی نعرے ہیں۔ دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا حال یہ ہے کہ وہی ہر قسم کے علمی، انتظامی، اقتصادی اور صحافتی اداروں پر قابض ہے۔ اعلیٰ سطح کے تقریباً تمام فیصلے اسی کے دفتروں سے کئے جاتے ہیں۔

دو مسجدوں کا قصہ

یہاں میں ایک تقابلی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس سے اس اصول کی صداقت خالص عملی اور واقعاتی سطح پر ثابت ہوتی ہے۔ یہ اجمودھیا اور دہلی کی مسجد کی مثال ہے۔

بابری مسجد (اجمودھیا) کا مسئلہ اپنی موجودہ شکل میں ۱۹۸۶ میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے مسلم رہنماؤں کی رہنمائی میں کیا کیا۔ وہ اس مسئلہ کو سڑک پر لے آئے۔ جلسہ اور جلوس، ریٹی اور مارچ، بائیکاٹ اور لاؤڈ اسپیکر کے شور کے ذریعہ انہوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ یہ طریقہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہندو عوام اور ہندو مذہبی طبقہ کی سطح پر مسئلہ کو حل کرنا تھا۔ چنانچہ وہ سراسر ناکام رہا۔

سڑک کی سیاست نے جو ابی طور پر ہندوؤں میں اسی قسم کی شدید تر سیاست پیدا کی۔ ہندوؤں کے مذہبی طبقہ کو یہ موقع ملا کہ وہ جذباتی اپیلیں کر کے ہندو عوام کو بھڑکادیں۔ انہوں نے ہندو عوام سے کہا کہ ۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کو مان کر ہم نے مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلی شکست کھائی تھی، اب اجمودھیا میں رام جنم بھومی کی تعمیر کے سوال پر ہم مسلمانوں سے دوسری شکست (second defeat) کبھی قبول نہیں کریں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند کے ہندو عوام بھڑک اٹھے۔ جگہ جگہ خون ریز فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ عوامی ضد اور جوش نے مسئلہ کو پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ جو چیز پہلے محدود مقامی مسئلہ کی حیثیت رکھتی تھی وہ پورے ملک کے لئے قومی وقار کا مسئلہ بن گئی۔ مسلمانوں کو بابری مسجد تو حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ بہت سی چیزیں جو اس سے پہلے انہیں حاصل تھیں وہ بھی انہوں نے اپنے غلط طریقہ کار کے نتیجہ میں کھودیں۔ (اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لئے راقم الحروف کا مضمون ”حکیمانہ تدبیر“ ملاحظہ فرمائیں)

اب اس کے برعکس ایک مثال لیجئے۔ نئی دہلی کے ایک قیمتی علاقہ میں ایک قدیم مسجد تھی۔ جس کے ساتھ وسیع زمین شامل تھی۔ اس زمین کا رقبہ مجموعی طور پر اٹھارہ ایکڑ ہوتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس زمین پر دہلی کی حکومت کے تین عمالوں (آرکیولوجی، ڈی ڈی اے اور کارپوریشن) نے قبضہ کر لیا۔ وہاں انہوں نے اپنا دفتر قائم کر دیا۔ ان کا مقصد اس کو جدید قسم کے چمک اسپاٹ میں تبدیل کرنا تھا۔ اس نقشہ کے مطابق کام بھی شروع ہو گیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے وہاں کئی لاکھ روپیہ خرچ کر دیا۔ اس کے بعد ایک مولوی صاحب کو یہ خیال آیا کہ اس قدیم مسجد پر قبضہ کیا جائے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے مسلمانوں کا جلسہ کیا۔ ذرا خبروں میں بیانات چھپوائے، نپوش بازی کی ہم چلائی، مدرسوں پر "ہماری مسجد ہم کو واپس کرو" کے نعرے لگائے۔ اس قسم کے کسی بھی مظاہراتی کام کو چھوڑ کر انہوں نے یہ کیا کہ نہایت خاموشی سے اس علاقہ کے ہندو خواص سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ان سے نجی ملاقاتوں میں کہا کہ یہ ایک مسجد (عبادت خانہ) ہے اور عبادت خانہ ہر حال میں مقدس ہوتا ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو۔ اس لئے آپ لوگ اس کو واکزار کرنے میں ہماری مدد کریں۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو جو سکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا وہ ان کا ساتھ دینے کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اس نے مذکورہ تینوں عمالوں سے ہاتھ دھو کر لیا۔ ہر قسم کے دستاویزات جمع کئے۔ اس سلسلہ کے تمام خطوط اور ڈرافٹ جو انگریزی میں ہوتے تھے وہ خود تیار کرتا اور مولوی صاحب کے ساتھ متعلقہ دفاتر میں جاتا۔

یہ خاموش دفتر جنگ تین سال تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ مذکورہ ہندو سکریٹری اور کچھ دوسرے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کی مدد سے مذکورہ تینوں عمالوں کے اس پر راضی ہونے لگے کہ وہ مسجد کو واکزار کر دیں۔ مولوی صاحب کو ہاتھ دھو کر یہ اجازت مل گئی کہ وہ مسجد کو آباد کر سکتے ہیں اور ملحقہ ۱۸ ایکڑ زمین پر ۸ فٹ اونچی باؤنڈری تعمیر کر سکتے ہیں۔ آج یہاں نہ صرف مسجد اور مدرسہ قائم ہے بلکہ تمام تمدنی سہولتیں مثلاً بجلی، ٹیلیفون اور سیوریج لائن بھی وہاں آچکی ہیں۔ اب یہ جگہ ایک پر رونق اسلامی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

اجودھیا کی مسجد کو مسلمانوں نے مزید نقصان کے ساتھ کھودیا۔ اور دہلی کی نسبتاً زیادہ بڑی اور زیادہ اہم مسجد کو انہوں نے شاندار طور پر دو بارہ حاصل کر لیا۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں

کے نادان رہنماؤں نے اجمودھیا کی مسجد کو جاہل عوام کی سطح پر حل کرنا چاہا۔ اس کے برعکس دھلی کی مسجد کے مسئلہ کو تعلیم یافتہ خواص کی سطح پر حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی واحد وجہ ہے جس کے نتیجے میں ایک مقام پر مسلمان مفتوح اور مغلوب ہو گئے اور دوسرے مقام پر انہوں نے شاندار فتح حاصل کی۔

یہ اصول صرف مسجد کے لئے خاص نہیں۔ مسلمان جس معاملہ میں بھی عوامی ہنگامہ کھڑا کریں گے وہاں ان کا ٹکراؤ عوامی ہندوؤں سے ہو جائے گا، اور آخر کار ان کو شکست ہوگی۔ اس کے برعکس جب وہ خاموش انداز اختیار کریں گے اور ہندوؤں کے خواص طبقہ سے ربط قائم کریں گے تو معاملہ ہندو خواص کی سطح پر رہے گا۔ ایسی صورت میں وہ ہمیشہ اپنے موافق فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے، بشرطیکہ ان کا معاملہ انصاف اور صداقت پر مبنی ہو۔

ہم پیش، وہ نہ پیشیں

اس سلسلہ میں ایک صحابی کا قول نہایت بامعنی اور سبق آموز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غزوہ بدر پیش آیا تو یہ سوال تھا کہ میدان جنگ کے لئے کس مقام کا انتخاب کیا جائے۔ ایک صحابی الجباب بن المنذر الجعفی نے ایک مقام کی تجویز پیش کی۔ اس کی خصوصیت انہوں نے یہ بتائی کہ جب وہاں ہم ٹھہریں گے تو پانی کے چٹے ہمارے قبضہ میں آجائیں گے۔ اور فریق ثانی پانی کے ذخائر سے محروم ہو جائے گا۔ اس تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پھر ہم پیشیں گے اور وہ نہ پیشیں گے (فخشریب و لا یشربون) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو پسند فرماتے ہوئے فوراً اس کو قبول کر لیا (سیرۃ ابن ہشام ۲/۲۶۱)

اسی قسم کا معاملہ ہندستان کا بھی ہے۔ موجودہ حالات میں اگر ہم اپنے مسئلہ کو ہندو عوام کی سطح پر لے جائیں تو ایسی صورت میں ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ پانی پئے گا، اور مسلمان پانی سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے مسئلہ کو ہندو خواص کی سطح پر رکھ کر لے کر آئیں تو ایسی صورت میں پانی مسلمان کے حصہ میں آئے گا، اور ہندو فرقہ پرست پانی سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔

دور اول کی مشال

عوام اور خواص کے اس فرقہ کی مشال اسلام کی ابتدا کی تاریخ میں بھی موجود ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک تعداد مکہ سے ہجرت کر کے سندھ پار کے ملک حبش چلا گئی تھی وہاں ان کے لئے عوام اور مذہبی طبقہ کی طرف سے اسی قسم کے مسائل پیدا ہوئے جو ہم کو ہندوستان میں درپیش ہیں۔ مگر یہ مسائل جب وہاں کے خواص کے سامنے آئے تو انتہائی انصاف کے ساتھ یہ مسائل مسلمانوں کے حق میں طے کر دئے گئے۔

مسلمان جب حبش کے ساحل پر اترے تو وہاں کے باشندے خارجی ہونے کی بنا پر ان کو حقیرا سمجھتے تھے اور انہیں پریشان کرتے تھے۔ یہ مسلمان اگر مشتمل ہو کر عوام کے خلاف ایچی میشن کرتے تو نتیجہ برعکس نکلتا۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور مقامی عوام اکثریت میں ۱۰ اس لئے مسئلہ بڑھتا اور مسلمانوں کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

مگر مسلمانوں نے عوامی سطح پر شکایت اور احتجاج سے کامل پرہیز کیا۔ وہ ان سے اعراض کرتے ہوئے اپنا کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب کہ ان کو بادشاہ وقت نجاشی کے دربار میں جانے کا موقع ملا۔ نجاشی نے ان سے پوچھا کہ کیا حبش میں کوئی تم کو ستاتا ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہاں۔ نجاشی نے فیصلہ دیا کہ جو شخص مسلمانوں کو ستائے، اس سے چار درہم بطور جرمانہ وصول کر کے مظلوم مسلمان کو دیا جائے۔ اس کے بعد اس نے مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا آنا جرمانہ کافی ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ نہیں۔ نجاشی نے دوبارہ فیصلہ دیا اور جرمانہ کی مقدار بڑھا کر آٹھ درہم کر دی (حیاء الصماہ، الجزء الاول، صفحہ ۳۵۵)

اسی ہجرت کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام جب مکہ سے حبش پہنچے تو مکہ کے مشرکین نے اپنا ایک وفد حبش بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کو وہاں سے واپس لائے۔ مشرکین کے وفد نے حبش پہنچ کر وہاں کے مذہبی طبقہ سے ملاقاتیں کیں اور آخر میں نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے۔

مشرکین مکہ کے وفد کی باتوں کو سن کر وہاں کے مذہبی پیشواؤں کا گروہ (بگروہ) ہوا مذہبی طبقہ، ان کا حامی بن گیا۔ انھوں نے نجاشی سے کہا کہ مسلم مہاجرین کو اس وفد کے حوالے کر دینا چاہیے۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر انھوں نے دربار میں مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ فتور و غل برپا کر دیا۔ ایسی حالت میں معاملہ اگر اس مذہبی طبقہ کی سطح پر لایا جاتا تو یقیناً اس کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوتا۔

مگر مسلمان وہاں کے مذہبی طبقہ سے مطلق نہیں اٹھے۔ انھوں نے مذہبی طبقہ کو نظر انداز کرتے

ہوئے صرف نباشی کے سامنے اپنی بات پیش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نباشی نے مکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔ اس نے مشرکین مکہ کے دند کو دربار سے نکال دیا۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ جب تک چاہو حبش میں عزت کے ساتھ رہو۔ یہاں سے نکلنے پر تمہیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا (سیرۃ ابن کثیر جلد ثانی)

حرفِ آخر

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ مقابلہ کی یہ صورت حال ہمیشہ باقی رہے گی، کیوں کہ اس کو کسی "دشمن اسلام" نے قائم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کو خود خدا نے اپنی دنیا میں قائم کیا ہے۔ اس لئے مخالفین کی سازش اور فساد کو لے کر اس کے خلاف فریاد کرنا سراسر احمقانہ ہے۔ اس قسم کی فریاد کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

اس دنیا میں کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ حالات کو سمجھا جائے۔ "مخالفین" کے منصوبوں کو جان کر ان کے خلاف حکیمانہ انداز میں جو ابی منصوبہ بندی کی جائے۔ مخالف حالات کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کی جائے۔ ہر پیش آنے والے عسکر کو ٹیسر کی طاقت سے زیر کیا جائے۔ اس دنیا میں کامیابی اس شخص کے لئے ہے جو مشکل کو اپنی غذا بنا سکے، جو ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر سکے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، ان کے لئے صرف یہ انجام مقدر ہے کہ وہ حالات کے خلاف بے فائدہ احتجاج کرتے رہیں، یہاں تک کہ تاریخ کے قبرستان میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائیں۔

اوصاف انسانی

قرآن میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ دو مقام پر یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اس کو نہ بدل ڈالے جو اس کے جماعی ہے (ان اللہ لا یغیبر ما بقوم حتیٰ یغیبروا ما بانفسہم، الرعد ۱۱)

اس خدائی سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے مابقوم (اجتماعی حالت) کا انحصار اس کے مابانفس (انفرادی حالت) پر ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ حیثیت قومی کا دار و مدار اوصاف انسانی پر ہے۔ کسی قوم کے افراد میں انسانی یا اخلاقی اوصاف جیسے ہوں گے، اسی نسبت سے اس کو دنیا میں اجتماعی مقام حاصل ہوگا، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے موجودہ زمانہ کی ایک مثال لیجئے۔ یہ بات بھی لوگ مانتے ہیں کہ جاپان نے دوسری عالمی جنگ کے بعد بہت غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس ترقی کا ایک خاص راز ان کا اتحاد ہے۔ جاپانی ہر کام کو متحدہ انداز میں کرتے ہیں۔ وہ اپنے اتحاد کو آخر وقت تک برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی طاقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہتے ہیں۔

جاپان کے اس اتحاد کا راز ان کے افراد کا ایک شگھی مزاج ہے جو تقریباً تمام جاپانیوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ پروفیسر چی نکانی (Chie Nakane) کی جاپانی زبان میں ایک کتاب ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں جاپانی سماج (Japanese Society) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں جاپانی پروفیسر نے لکھا ہے کہ جاپانیوں کا انفرادی مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کے ماتحت ہوں :

I am under someone (p. 51).

دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر جاپانی احساس ماتحتی میں جیتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی اجتماعیت قائم ہوتی ہے تو وہ فوراً اس سے جڑ جاتا ہے، وہ تنظیم کے سربراہ کو فوراً اپنا سربراہ مان لیتا ہے، کیوں کہ وہ پہلے ہی سے یہ مانے ہوئے تھا کہ میں کسی کے ماتحت ہوں۔ یہ ہے جاپانیوں کے اس اتحاد کا راز جس کے نتیجہ میں انہوں نے موجودہ زمانہ میں حیران کن ترقی حاصل کی ہے۔

اب موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ مسلمانوں کا معاملہ جاپانیوں کے بالکل برعکس ہے۔ مسجد

سے لے کر سیاست تک کوئی معاملہ ایسا نہیں جس میں مسلمان متہد ہوں۔ موجودہ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ برباد قوم ہیں، اور اس کی سب سے بڑی وجہ بلاشبہ ان کا عدم اتحاد ہے۔ اس بے اتحادی نے ایک ارب انسانوں کی عظیم قوم کو دنیا کی سب سے کمزور قوم بنا دیا ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی اس بے اتحادی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب دوبارہ ان کے افراد کا وہ غلط مزاج ہے جو کسی بھی اتحاد کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ بن گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جب مسلمان تنزل اور مغلوبیت کا شکار ہوئے تو ان کے رہنماؤں کی تشکیلیں یہ تھی کہ مغرب سے معریت نے ان کو زوال سے دوچار کیا ہے۔ چنانچہ تمام رہنماؤں نے ایک یا دوسری صورت میں یہ کیا کہ اسلام کو پر فخر انداز میں ان کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ مگر ان کی معریت ختم کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ پوری نسل فخر اور حاکمیت کے احساس پر پرورش پا کر اٹھی ہے۔ ہر آدمی نظری اور اعتقادی طور پر اپنے اندر برتری کا جذبہ لیے ہوئے ہے۔ کیوں کہ یہی جذبہ اس کے اندر برا گیا تھا۔

یہ نفسیات اتحاد کی قائل ہے۔ اتحاد اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ ایک شخص کو بڑا بنا کر بقیہ تمام لوگ اس کے مقابلہ میں چھوٹے بننے پر راضی ہو جائیں۔ مگر مسلمانوں کی پر فخر نفسیات اس میں مانع ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر آدمی سردار بننا چاہتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی بات چلے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ مالکانہ سیٹ پر بیٹھے۔ ایسی حالت میں اتحاد قائم ہونا ممکن نہیں۔ اور مسلمانوں کی یہی وہ نفسیات ہے جس نے آج ان کے درمیان کسی بھی اتحاد کو سر اسرنا ممکن بنا دیا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ اقتدار کو کھونا نہیں ہے بلکہ انسانی اوصاف کو کھونا ہے۔ موجودہ مسلمان، اپنے رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں، اعلیٰ انسانی اوصاف سے خالی ہو گئے ہیں۔ اب سب سے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر وہ اوصاف پیدا کیے جائیں جو اعلیٰ انسانیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ جب تک یہ کام نہیں کیا جائے گا مسلمانوں کے احوال تبدیل نہیں ہو سکتے۔ کوئی دوسری کوشش خواہ وہ کتنی ہی بڑی مقدار میں کی جائے، مسلمانوں کے لیے کسی نئے بہتر مستقبل کی تخلیق نہیں کر سکتی۔

یہ ایک قانونِ فطرت کا مسئلہ ہے، اور قانونِ فطرت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ قانونِ فطرت

ماضی کی امتوں سے بھی مطلوب تھا اور موجودہ امت سے بھی یقیناً طور پر مطلوب ہے۔

مصر سے زندہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ارض مقدس (شام و فلسطین) کو ان کے لیے لکھ دیا۔ حضرت موسیٰ کے ذریعہ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم لوگ اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ۔ تم کو خدا کی مدد ملے گی اور تم وہاں کے لوگوں پر غالب آ جاؤ گے (المائدہ ۲۱)

وہاں جو قوم اس وقت آباد تھی، وہ بظاہر ایک طاقتور قوم تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل ان کا نام سن کر ڈر گئے۔ ان پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ خدا اور خدا کے رسول کی ہدایت کے باوجود ان کے خلاف اقدام کے لیے تیار نہ ہوئے (المائدہ ۲۲) بائبل میں ہے کہ: "تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی۔ اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے۔ اور کل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے۔ اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی، ہمارے کاش ہم مصر ہی میں مرجاتے۔ یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے۔ خداوند کیوں ہم کو اُس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے۔ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں" (گنتی ۱۴ : ۱-۴)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوا کہ بنی اسرائیل چالیس سال (۱۴۰۰-۱۳۶۰ ق م) تک فاران اور شرقِ اُردن کے درمیان صحرائیں بھٹکتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ان میں جو ۲۰ سال سے نیچے ہیں، صرف وہی زندہ بچیں گے۔ ۲۰ سال سے اوپر کی عمر کے تمام لوگ ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ ۴۰ سال کی صحرائی زندگی میں ان کے تمام بڑی عمر والے مر کر ختم ہو گئے۔ اس دوران ان کے بچے نئے صحرائی حالات میں پرورش پانے کی حالت کے ساتھ اٹھے۔ اس نئی نسل نے یوشع بن نون کی قیادت میں ارض مقدس کو فتح کیا۔

بنی اسرائیل نے ابتداً حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ اگر ہم اس ملک پر حملہ کریں تو ان کے مقابلہ میں ہم ہار جائیں گے۔ اور پھر ہمارے بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ مگر یہی بچے بعد کو بڑے ہو کر شام و فلسطین کے علاقہ میں داخل ہو گئے اور وہاں کے حکمران (عمالقہ) سے لڑ کر

اس پر قبضہ حاصل کر لیا۔

بنی اسرائیل کے بچوں میں یہ طاقت کیسے پیدا ہوئی۔ وہ بے حوصلہ سے باحوصلہ کیونکر بن گئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے باپ دادا کے برعکس، لمبی مدت تک صحرائی زندگی کی مشقتوں کو برداشت کیا۔ بچوں کے باپ جن سخت حالات کو اپنے بچوں کے حق میں موت سمجھتے تھے، انہیں سخت حالات کے اندر داخل ہونے میں ان بچوں کے لیے نئی زندگی کا راز چھپا ہوا تھا۔

موافق حالات میں زندگی گزارنا بظاہر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر موافق حالات ہمیشہ جمود پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے اندر تمام اعلیٰ خصوصیتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ اس کو حالات کا مقابلہ کر کے زندہ رہنا پڑے۔ مصر میں بنی اسرائیل صدیوں تک عافیت کی زندگی گزارتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک مردہ قوم بن گئے۔ مگر مصر سے خروج کے بعد ان کو غیر آباد صحرائیں زندگی گزارنی پڑی۔ یہ صحرائی زندگی ان کے لیے سراپا چیلنج تھی۔ ان پر مشقت حالات میں جو لوگ بچپن سے جوانی کی عمر کو پہنچنے وہ قدرتی طور پر بالکل دوسری قسم کے انسان تھے۔

بنی اسرائیل کی یہ نسل اخلاق و کردار کے اعتبار سے اپنے باپ دادا سے بالکل مختلف تھی۔ صحرائی حالات نے ان کے اندر سادگی، جفاکشی، حوصلہ اور حقیقت پسندی جیسی خصوصیات پیدا کر دی تھیں۔ اور بلاشبہ یہی وہ اوصاف ہیں جو کسی قوم کے افراد کو زندہ افراد بناتے ہیں۔ کوئی قوم اگر طول آمد (تھید ۱۶) کے نتیجے میں مردہ قوم بن جائے تو اس کو دوبارہ زندہ قوم بنانے کی تدبیر یہی ہے کہ اس کو غیر معمولی حالات میں ڈالاجائے۔ اور اس کو ایسے شدید عمل سے گزاراجائے جس کے دوران اس کی سابقہ غیر مطلوب شخصیت ختم ہو اور نئی مطلوب شخصیت ابھرائے۔

کسی مقصد کے حصول کے لیے افراد کار کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگر مطلوب افراد موجود نہ ہوں تو خدا کا آیا ہوا حکم اقدام بھی ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر سے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ جب ضروری افراد تیار نہ ہوں اس وقت بڑے بڑے اقدامات کی بات کرنا صرف غیر نچوڑگی کی علامت

ہے نہ کہ جوش اقدام کی علامت۔ کیونکہ ایسا اقدام بدترین ناکامی کے سوا کسی اور انجام تک پہنچانے والا نہیں۔

دس سال خاموشی

خلافت تحریک بیسویں صدی کے آغاز میں اٹھی اور ۱۹۲۳ء میں آخری طور پر ختم ہو گئی۔ تقریباً دس سال تک ہندوستانی مسلمانوں میں اس کا ہنگامہ جاری رہا۔ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳-۱۹۴۳) غالباً واحد نمایاں شخص تھے جو اس کے مخالف تھے اور اس پر سخت تنقید کرتے تھے۔

مولانا تھانوی کے موقوفات میں ہے کہ "جس زمانہ میں تحریک خلافت کا شہاب تھا، شورشِ پسند طبیعتیں جو شش میں بھوک رہی تھیں۔ چار طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ سودہ برا بھلا کہنے اور من ضمن اور قسم قسم کے بہتان و الزامات لگانے کی دنگی کے خطوط میرے پاس آئے کہ یا تو تحریک ہو جاؤ ورنہ قتل کر دئے جاؤ گے۔"

مولانا تھانوی اس سلسلہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں تحریک خلافت کے ایک ممتاز حامی میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس تحریک میں شریک کیوں نہیں ہوتے میں نے کہا کہ اس کام کو کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی امیر المومنین ہو۔ اس شرط کی تکمیل کے بغیر یہ ساری تحریک غلط ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم آپ ہی کو امیر المومنین بناتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں امیر المومنین بننے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اس میں کچھ شرائط ہیں۔

مولانا تھانوی کی پیشکش کردہ پہلی شرط کا خلاصہ یہ تھا کہ تمام ہندوستان کے مسلمان اپنا تمام مال اور جائیداد میرے نام بہ کر دیں۔ کیوں کہ مال کے بغیر کوئی امیر المومنین کچھ نہیں کر سکتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام مشاہیر علماء اور بیڈروں کے دستخط کرواؤ کہ وہ مجھ کو امیر المومنین تسلیم کر لیں۔ اگر بلا اختلاف سب نے تسلیم کر لیا تو میں امیر المومنین ہوں گا۔ اگر ایک نے بھی اختلاف کیا تو میں امیر المومنین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اختلاف کی صورت میں امیر امیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تسلیم کے بعد پھر کوئی اختلاف یا خلاف کرے تو امیر کو حق ہے کہ وہ اپنی قوت سے ایسے لوگوں کو دبائے اور ٹھیک کرے۔ قبل از تسلیم حق نہیں کہ اس کو دبا یا جائے۔

اس کے بعد مولانا تھانوی نے کہا: "اب سنئے کہ امیر المومنین ہونے کے بعد سب سے اول جو حکم دوں گا وہ یہ ہوگا کہ دس سال تک کے لئے سب خاموشی۔ ہر قسم کی تحریک اور ہر قسم کا شور وغل

بند۔ اس دس سال میں انتظام کروں گا مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے اور ان کی اصلاح کے لئے باقاعدہ انتظام ہوگا۔ غرض کہ مکمل انتظام کے بعد جو مناسب ہوگا حکم دوں گا۔ عملی صورت یہ ہے کام کرنے کی۔ اور اگر عرض کاغذ ہی امیر المؤمنین بنانا چاہتے ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج امیر المؤمنین ہوں گا بلکہ کو اسیر الکافرین ہوں گا۔ آج سردار بنوں گا، کل سردار ہوں گا۔

مولانا تھانوی اس کے بعد کہتے ہیں: "خلاصہ یہ ہے کہ ہر کام اصول سے ہو سکتا ہے۔ بے اصول تو کھر کا انتظام بھی ہو سکتا۔ ملک کا تو کیا خاک کا انتظام ہوگا۔ یہ ہیں وہ اصولی باتیں جن پر مجھ کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور قسم قسم کے الزامات و بہتان میرے سر تھوپے جاتے ہیں اور لوگ مجھ سے خفا ہیں۔ اور وجہ خفا ہونے کا صرف یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اصول کے ماتحت کام کرو۔ جو شس سے کام مت لو۔ ہوش سے کام لو۔ جو ش کا انجام خراب نکلے گا۔ حدود شریعی کی حفاظت رکھو۔ وہ ان باتوں کو اپنے مقاصد میں روز آٹھکانا سمجھتے ہیں۔" (الاقاضات الیومیہ، جلد اول، صفحہ ۱۰۳-۱۰۱)

مولانا تھانوی کی ان انتہائی معقول باتوں کو کسی نے نہیں سنا۔ تمام مسلمان پر جو شس خطیبوں کی آواز پر بے معنی دوڑ لگاتے رہے۔ اپنے زمانہ کے مسلمانوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے مولانا تھانوی کہتے ہیں: مسلم عوام کی حالت یہ ہے کہ جس نے مرضی کے موافق فتویٰ دے دیا، یا کوئی عالم یا مسلمان ان کے ساتھ ہو لیا، اس میں سب کمالات ہیں۔ اس کو عرض پر پہنچادیں گے۔ اگر کسی نے مرضی کے خلاف کوئی بات کی تو سخت تازیانی میں اس کو جگہ ملنا مشکل۔ غرض کہ ایک گڑبڑ ہے۔ اور یہ طریقہ کار جو موجود ہے، یہ سراسر اسلام اور شریعت سب کے خلاف ہے۔ اس کو اسلام اور مسلمانوں سے کیا تعلق (صفحہ ۱۱۱)

اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی صحیح لیڈر نہیں۔ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان اپنے گمراہ ہوئے مزاج کی بنا پر کسی صحیح آدمی کو اپنا لیڈر نہیں بناتے۔ وہ جمہور نے الفاظ بولنے والوں کے پیچھے دوڑتے ہیں، اور جو آدمی کچے الفاظ بولے، اس سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ آج مسلمانوں کا حال، قرآن کے مطابق، یہ ہو رہا ہے کہ اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں گے اور اگر ہم راہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنالیں گے (الاعراف ۱۳۶)

قوموں کی قیادت کے سلسلہ میں اصل مسئلہ رہنمائی کی موجودگی کا نہیں ہے۔ بلکہ خود قوم کے اندر

رہنمائی کو قبول کرنے کی استعداد کا ہے، بہترین رہنمایا بہترین رہنمائی کی موجودگی بھی اس وقت عملاً بے فائدہ ہو جاتی ہے جب کہ قوم کے اندر صحیح رہنمائی کو قبول کرنے کی استعداد پائی نہ جا رہی ہو۔

قرآن میں بار بار مختلف انداز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ بہت سے انسان ایسے ہیں جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے سچائی کو ہر قسم کے دلائل کے ساتھ بیان کر دیا جائے، تب بھی وہ اس کو قبول نہیں کریں گے۔ مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کے تذکرہ کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے سامنے حق کو پوری طرح واضح کر دیا، اس کے باوجود وہ لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ آخر میں وہ اپنی قوم سے نکل گئے اور کہا کہ اے میری قوم، میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی۔ مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے (الاعراف ۷۹)

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اپنی نشانوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناطق تکبر کرتے ہیں۔ اور وہ ہر قسم کی نشانیوں کو دیکھ لیں تب بھی وہ ان پر ایمان نہ لائیں (ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو وہ نہیں اپنائیں گے۔ اور اگر وہ گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو وہ اپنائیں گے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ہماری نشانوں کو جھٹلایا اور ان کی طرف سے وہ غافل رہے (الاعراف ۱۳۶)

ان دونوں آیتوں میں ایسے گروہوں کا ذکر ہے جن کو خدا کے پیغمبر کے ذریعہ اعلیٰ ترین شکل میں دعوت پہنچی۔ اس کے باوجود انھوں نے دعوت حق کو قبول نہیں کیا۔ اس کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب ان کی بگڑی ہوئی نفسیات تھی، نفسیات کا یہ بگاڑ اکثر حالات میں تکبر کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ دونوں آیتوں میں تکبر ہی کو اس کا سبب بتایا گیا ہے (الاعراف ۷۵، ۱۳۶)

نصیحت ہر انسان کے لئے ناپسندیدہ چیز ہے۔ اور خاص طور پر تکبر انسان کو نصیحت کو بالکل ہی ناپسند کرتا ہے۔ جو لوگ تکبر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں وہ کبھی اپنے خلاف کسی نصیحت کو سننے پر راضی نہیں ہوتے۔ ایسا کوئی حق ان کے لئے آخری حد تک ناقابل قبول ہوتا ہے جس میں انھیں اپنی شخصیت کی نفی دکھائی دے رہی ہو۔

جو لوگ اپنے آپ کو اپنے مقام پر بیٹھا ہوا فرض کر لیں وہ کس ایسی دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جس میں انھیں محسوس ہو کہ اس کو قبول کرنے کی صورت میں انھیں اپنے اپنے مقام سے نیچے

اترنا پڑے گا۔ جو لوگ فز اور ناز کی نفسیات میں مبتلا ہوں، ان کی یہ نفسیات ان کے لئے کسی ایسی بات کو ماننے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے جس میں ان کا فز و ناز انہیں ٹوٹتا ہوا نظر آئے۔

جو لوگ اپنا منصبِ اقتسابِ قوم سمجھ نہیںیں وہ اپنے مزاج کی بنا پر ایسی کسی پرکار کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس میں اقتسابِ خویش پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہو۔ جو لوگ آرزوؤں اور خوش خیالیوں کی دنیا میں ہی رہے ہوں وہ کسی ایسے پیغام کو اپنے لئے ابھنی محسوس کرتے ہیں جس میں حقائق و واقعات کی رعایت کر کے زندگی کی تعمیر کا سبق دیا گیا ہو۔ جن لوگوں کی نگاہ اپنی ذمہ داریوں کے بجائے اپنے حقوق پر ہو، جن کے اندر خارجی طرز فکر پیدا ہو جائے وہ ایسی کسی دعوت کو غیر ضروری سمجھ کر رد کر دیتے ہیں جس میں انہیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں اور ان کے اندر داخلی طرز فکر ابھارنے کی کوشش کی جائے۔

جو لوگ اپنے متعلق یہ سمجھ لیں کہ وہ بخشنے ہوئے لوگ ہیں وہ ایسے پیغام کی مضبوطی کو سمجھ نہیں پاتے جس میں اپنی موجودہ حالت کے تحت انہیں اپنی بخشش مشتبہ نظر آتی ہو۔ جن لوگوں نے تنزیلات کی رومانی دنیا میں اپنے قلمے بنا رکھے ہوں وہ کسی ایسے پیغام کو اہمیت دینے میں ناکام رہتے ہیں جس کو ماننے کی صورت میں انہیں دکھائی دے کہ وہ کسی محفوظ قلمہ میں نہیں ہیں بلکہ صحرا میں کھڑے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا ہو کہ کسی عمل کے بغیر پیشگی طور پر ان کے لئے جنت کے عملات رزرو ہو چکے ہیں وہ کسی ایسی تحریک میں حصہ لینا غیر ضروری سمجھتے ہیں جس میں عمل کی بنیاد پر جنت میں داخلہ کارا ز بتایا گیا ہو۔ جن کو قبول کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بگڑا ہوا مزاج ہے۔ جو لوگ بچھے ہوئے مزاج میں مبتلا ہوں، ان کو صرف اپنے مزاج کے مطابق بات ہی اپیل کرتی ہے۔ دوسری کوئی بات، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ بیان کر دی جائے، وہ کسی طرح انہیں اپیل نہیں کرتی۔ اپنے مخصوص مزاج کے خلاف کسی بات کو ماننا ان کے لئے اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے جتنا کہ بکری کے لئے گوشت کھانا اور شیر کے لئے گھاس چرنا۔

غلط رہنمائی

جون ۱۹۸۷ میں ایک بیرونی سفر پر تھا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ فروری ۱۹۸۸ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس سفر کے دوران میری ملاقات ویرٹ انڈیز کے ایک مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ ان کی ملاقات امریکہ کے ایک تسلیم یافتہ مسیحی سے ہوئی تھی۔ ان کی داڑھی اور ان کی ٹوپی کو دیکھ کر اس نے سمجھا کہ شاید یہ مسلمان ہیں۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان جو سوال و جواب ہوا، وہ ان کے الفاظ میں یہ تھا:

Are you a Muslim?

Yes.

Then you are a terrorist.

ویرٹ انڈیز کے مذکورہ مسلمان نے یہ بات شکایت کے طور پر بتائی تھی۔ مگر میں اس کو صحت مندانہ سمجھتا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تصویر ساری دنیا میں دہشت گرد (Terrorist) کی تصویر بن گئی ہے۔ دور اول کے مسلمانوں کی تصویر یہ تھی کہ وہ دین رحمت کے نمائندہ ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تصویر ساری دنیا میں یہ ہے کہ وہ دین دہشت کے نمائندہ ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال ساری دنیا میں یہ ہے کہ وہ یا تو لڑ رہے ہیں یا لڑنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی عملی جنگ میں مشغول ہے اور کوئی قول جنگ میں۔ یہ بات اتنی عام ہے کہ شکل ہی سے کچھ لوگوں کو اس سے متشنی کیا جاسکتا ہے۔

یہ عملی یا قولی جنگ تین صورتوں میں جاری ہے۔ ایک وہ جنگ جس میں مسلمان اپنی مدعو قوموں سے سیاسی حقوق کی جنگ کرنے میں مشغول ہیں، مثلاً فلپائن۔ دوسری وہ جنگ جس میں مسلمان اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے اسلامی قانون کے نفاذ کے نام پر لڑ رہے ہیں۔ مثلاً مصر۔ تیسری وہ جنگ جس میں مسلمان باہمی شکایت کی بنیاد پر خود آپس میں لڑ رہے ہیں، مثلاً پاکستان میں ہاجروں اور غیر ہاجروں کی لڑائی۔

مسلمانوں کا ایک طبقہ براہ راست طور پر ان لڑائیوں میں مشغول ہے۔ دوسرا طبقہ، جس کو دانشور طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ تقریر یا تقریر کی صورت میں اس جنگ کی موافقت کر کے لڑنے والوں کی بہت

افزائی کر رہا ہے۔

یہ لڑائیاں بلاشبہ اسلام کے خلاف ہیں۔ اور یہ واقعات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ پوری امت اور امت کے تمام اکابر سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ان لڑائیوں میں مشغول ہیں۔ مگر ان گنت قربانیوں کے باوجود اس کا کوئی بھی مثبت نتیجہ امت کو نہیں ملا۔ پہلڑائی امت کے مسائل میں مزید کچھ اضافہ کرتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے مسائل کو حل کرنے والی نہ بن سکی۔

انیسویں صدی میں جب مغربی قومیں دنیا پر چھا گئیں۔ انھوں نے مسلم سلطنتوں کو مغلوب کر کے ہر جگہ اپنا براہ راست یا بالواسطہ غلبہ قائم کر لیا تو ہر جگہ مسلم مصلحین اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں کا مشترکہ نعرہ صرف ایک تھا جس کو انھوں نے جہاد کا عنوان دیا۔ ہر ایک نے مسلمانوں کے اندر جہاد و قتال کا جذبہ ابھارا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری امت لڑنے بھرنے والی امت بن گئی۔

انیسویں صدی میں جو واقعہ پیش آیا۔ اس کا صحیح رد عمل یہ تھا کہ مسلمانوں میں جذبہ دعوت کو ابھارا جائے نہ کہ جذبہ قتال کو۔ مسلم مصلحین کی یہی وہ اجتہاد سی غلطی ہے جس نے مسلمانوں کا یہ حال کر دیا ہے کہ وہ ہر جگہ لاماصل لڑائیوں میں مشغول ہیں، کیوں کہ انھیں اس کے سوا کچھ اور بتایا ہی نہیں گیا۔

انیسویں صدی میں مغربی قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مغلوبیت کا سبب اندر تھا نہ کہ باہر یہ حادثہ حقیقتاً مسلمانوں کے اپنے زوال کی بنا پر پیش آیا نہ کہ دوسری قوموں کی زیادتیوں اور سازشوں کی بنا پر۔ معاملہ اگر ساوہ طور پر دوسری قوموں کی زیادتی کا ہوتا تو مسلمانوں کی قربانیاں اس کو دفع کرنے کے لئے کافی ہو جاتیں۔ مگر معاملہ مسلمانوں کی اپنی داخلی کمزوریوں کا تھا اور خارجی اقدامات کے ذریعہ داخلی کمزوریوں کا علاج نہیں کیا جاسکتا۔

دعوت داخلی کمزوریوں کا علاج ہے۔ زوال کے بعد مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کا واحد راز دعوت ہے، اَلْکَلْبِیۃ (۱۶ - ۱۷)، موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین اگر بروقت اس راز کو جان لیتے کہ یہ داخلی زوال کا معاملہ ہے نہ کہ خارجی تعدی کا معاملہ، تو وہ مسلمانوں میں جذبہ دعوت کو ابھارتے۔ وہ مسلمانوں کے اندر دایمانہ سپرٹ کو زندہ کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو مسلمانوں کی نئی تعمیر شروع ہو جاتی۔ وہ اٹھ کر دوبارہ نئی کامیابی حاصل کر لیتے۔

مگر مصلحین نے انتہائی نادانی کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمانوں کے اندر جذبہ قتال کو ابھارا۔ اس

کانتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ایسی لڑائیاں چھیڑ دیں جس کا نتیجہ اس کے سوا کسی اور شکل میں برآمد نہیں ہو سکتا تھا کہ جو کچھ ان کے پاس باقی بچا ہے اس کو بھی وہ آخر کار کھودیں۔

نشانی عمل

دور اول کے مسلمانوں نے اپنی طاقت کو مثبتیت کاموں میں استعمال کیا اور اسلام کی علمبردار بنائی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال، اس کے برعکس، یہ ہے کہ وہ آپس میں لڑ کر اپنی قوتوں کو ضائع کر رہے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی ہستی کا حال یہ ہے کہ مصر کے اسلام پسندوں نے فوجی افسروں کے ساتھ مل کر شاہ فاروق کا خاتمہ (۱۹۵۲) کیا، اور جب شاہ فاروق کو مصر سے جلا وطن کر چکے تو اس کے بعد دونوں خود آپس میں لڑنے لگے۔ اسی طرح برصغیر ہند کے مسلمانوں نے ہندوؤں سے لڑ کر پاکستان (۱۹۴۷) بنوایا۔ اور جب پاکستان بن چکا تو انہوں نے خود اپنے درمیان لڑائی شروع کر دی۔

اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کو اٹھانے کے لئے سنت رسول پر عمل نہیں کیا، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی ایسا نہ کر سکے جو بظاہر ”نظام مصطفیٰ“ اور ”الرسول متاٰدنا“ جیسے نعرے بلند کر رہے تھے۔

اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو ایسے تعمیری نشانے دئے جن میں وہ پوری طرح مشغول ہو جائیں اور باہمی ٹکراؤ سے بچتے ہوئے اپنی قوتوں کو مفید کاموں میں استعمال کریں۔ یہ تعمیری نشانے خاص طور پر دو تھے — دعوت الی اللہ، اور علوم اسلامی کی تدوین۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام اصحاب میں، اور آپ کے اصحاب نے تمام تابعین میں یہ تڑپ پیدا کر دی کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ وہ اس وقت تک مطمئن نہ ہوں جب تک تمام انسانوں کو اللہ کی مرضی سے پوری طرح باخبر نہ کر دیں۔ اس داعیاء مشن نے مسلمانوں کے جذبہ عمل کو باہمی ٹکراؤ سے ہٹا کر خاری پیغام رسانی کی طرف موڑ دیا۔

دوسرے مقصد کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تدبیر اختیار فرمائی کہ ابتداً آپ نے مسلمان فرمایا کہ: لا تکتبوا عینی غیر القرآن (مجھ سے قرآن کے سوا کچھ اور نہ لکھو) اس طرح آپ کی حیات میں لوگ قرآن کو پڑھنے پڑھانے اور اس کو جمع کرنے میں لگے رہے۔ آخر

عمر میں آپ نے لوگوں کو اپنی امارت لکھنے کی اجازت دے دی۔

یہ ایک بے حد اہم قسم کی حکیمانہ تدبیر تھی۔ اس طرح آپ نے اپنے بعد امت کے اذہان کو حدیث کی جمع و تدوین میں لگا دیا۔ آپ کی وفات کے بعد کئی سو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اسباب سے جو تاریخی عظمت حاصل کی تھی، اس کی بنا پر آپ کی امارت کو جمع کرنا ایک ایسا باعظمت کام بن گیا کہ اس زمانہ میں بڑے بڑے محدثین کو خلفاء و سلاطین سے بھی زیادہ اونچا درجہ معاشرہ میں حاصل ہو گیا۔ لوگ نہایت شوق اور محنت کے ساتھ اس کام میں لگ گئے۔ قرآن کی طرح اگر حدیث بھی آپ کی زندگی میں ایک کتاب کی صورت میں مدون ہو جاتی تو لوگوں کے لئے وہ اس سرگرمی کا سبب بنتی جو عملاً پیش آیا۔

ابتداءً یہ کام صرف جمع حدیث یا تدوین حدیث کا کام تھا۔ پھر اس سے اور بہت سے علوم پیدا ہوئے۔ اولاً علوم حدیث، اس کے بعد علوم لغت، علوم تفسیر، علوم فقہ، علوم تاریخ، وغیرہ۔ اور جب مسلم معاشرہ میں علمی سرگرمیاں جاری ہوئیں تو وہ بالآخر علوم منقولات سے گزر کر علوم منقولات تک پہنچ گئیں۔ پوری مسلم دنیا علمی سرگرمیوں سے گونج اٹھی۔ تدوین حدیث کی ہم اپنے آخر میں پہنچ کر علوم اسلامی کی تدوین کی ہم پہنچ گئی۔ اس طرح امت تقریباً ایک ہزار سال تک اس میں مشغول رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو سراسر تعمیری نشاندہ دیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اس کے عکس مسلمانوں کو تخریبی نشاندہ دیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی تعمیری سیاسی انداز میں کی۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما مسلمانوں کے سیاسی زوال کے حالات سے متاثر ہو کر اٹھے۔ اس لئے ہر ایک نے، کسی ایک یا دوسری صورت میں ہی کیا کہ اسلام کو ایک سیاسی نظریہ کے روپ میں پیش کیا۔ اس تعمیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کا انفاذی سیاست بن گیا۔ ہر ایک کا ذہن یہ بن گیا کہ، ہمیں سیاسی نظام میں تبدیلی لاکر دوبارہ اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے اہم کام یہ قرار پایا کہ حکمران افراد سے ٹکراؤ کیا جائے تاکہ ان کو ہٹا کر دوسرا نظام حکومت قائم کیا جاسکے۔

جن ملکوں میں حکومت غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھی، وہاں وہ حکومت کے خلاف اس لئے ٹکرائے

کہ وہ "کافر" ہونے کی وجہ سے یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ خدا کی زمین پر اپنا اقتدار قائم کریں۔ اور جہاں حکومت مسلم افراد کے ہاتھ میں تھی وہاں اس لئے وہ ان سے لڑ گئے کہ ان کے نزدیک وہ نام کے مسلمان تھے، اور خدا کے قانون کو زمین پر جاری نہیں کر رہے تھے۔

اس طرح مسلمان کی تصویر ساری دنیا میں لڑا کو قوم کی تصویر بن گئی۔ وہ غیر قوموں کے ملک میں بھی دہشت گرد کی نظر سے دیکھے جانے لگے اور خود اپنے ملک میں بھی۔

تعمیری کام کا نقشہ

دور اول میں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تدریس اور تدریس اور تدریس علوم اسلامی کا نشانہ دیا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے مصلحین مسلمانوں کو ایک اعلیٰ تعمیری نشانہ دے سکتے تھے۔ یہ نشانہ تھا اسلامی لٹریچر کی تیاری اور اس کی اشاعت۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف پریس اور جدید مواصلات کے ظہور نے اشاعت کے بالکل نئے مواقع کھول دیے ہیں۔ اسی کے ساتھ مختلف تحریکوں اور مختلف انقلابات کے نتیجے میں عالمی سطح پر فکر انسانی میں تبدیلی ہوئی ہے۔ آج کا انسان بالکل نئے انداز سے سوچتا ہے اور نئے انداز سے باتوں کو سمجھنا چاہتا ہے۔

ان حالات میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا کام ایک ایسا عظیم کام بن گیا ہے کہ اگر امت کے تمام ذہن افراد اس کام میں لگ جائیں تو ایک صدی تک وہ ان کی مشغولیت کے لئے کافی ہو جائے۔

۱۔ اس سلسلے میں پہلا کام یہ ہے کہ قرآن کے ترجمے تمام زبانوں میں شائع کئے جائیں۔ اس کے ساتھ حدیث اور سیرت کی مستند کتب ابوں کے ترجمے کر کے ان کو ساری دنیا میں اور تمام قوموں کے درمیان پہنچا دیا جائے تاکہ ان پر خدا کی رحمت تمام ہو سکے۔

۲۔ دوسرا کام یہ ہے کہ جدید سائنس و فنکارانہ انداز میں دعوتی لٹریچر تیار کیا جائے اور اس کو دنیا کی تمام اہم زبانوں میں شائع کر کے تمام قوموں میں پھیلا دیا جائے۔

۳۔ تیسرا کام یہ ہے کہ ہفتہ وار اور ماہوار پرچے اعلیٰ معیار پر ہر ملک میں شائع کئے جائیں۔ ان میں عالم اسلام کی خبریں، جدید دنیا کے موافق اسلامی واقعات اور دوسری مناسب چیزوں کو فراہم کر کے شائع کیا جائے۔

۴. چوتھا کام یہ ہے کہ خالص دعوتی انداز میں اجتماعات کئے جائیں۔ موجودہ زمانہ میں اجتماعات اور کانفرنسوں کا کام بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ مگر یہ کسی نہ کسی اعتبار سے اجتماعی اجتماعات ہیں۔ اس کے بجائے مثبت انداز پر دعوتی اجتماعات بڑے پیمانہ پر منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

۵. ایسے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں جہاں دعوتی مقاصد کے تحت نصاب تیار کر کے لوگوں کی تسلیم و تربیت کی جائے۔

۶. ریسرچ ادارے قائم کئے جائیں جہاں جدید موضوعات پر اسلامی انداز میں تحقیق کا کام کیا جاسکے۔

مسلمان اگر اس قسم کے تعمیری کاموں میں لگ جائیں تو وہ اپنی قوت کے استعمال کا ایک مثبت میدان پائیں گے، اور اسی کے ساتھ وسیع تر انسانیت کے لئے اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کوسکیں گے۔

صبر کا ہتھیار

۶ ستمبر ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ سنرکلیش (۲۲ سال) شاہدہ کی ایک سڑک پر چل رہی تھیں۔ ان کے گلے میں سونے کی زنجیر تھی۔ اچانک اشوک نامی ایک شخص جس کی عمر ۲۵ سال تھی بھینسا اور سنرکلیش کی زنجیر کھینچ کر بھاگا۔ پولیس کانسٹیبل کشن چندیاگی (۳۲ سال) اس وقت ڈیوٹی پر گھوم رہے تھے۔ کسی نے ان کو واقعہ کے بارہ میں بتایا۔ وہ تلاش کرتے ہوئے ایک بالیکی سندر میں پینے جہاں بھرم موجود تھا۔ پولیس کی وردی دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا کشن چند نے اس کا پیچھا کیا۔ بھرم کے پاس ایک ریو اور تھا۔ اس نے ناز کیا تو اس کی گولی کشن چند کی آنکھ کے نیچے ان کے چہرہ اور گردن کو زخمی کرتی ہوئی گذر گئی۔ انھوں نے چلا کر کہا "ایک بار تو نے مجھے مار دیا۔ پر دوبارہ تو نہیں مار سکتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا تیرے پاس ریو اور ہے" اب وہ چوکنٹ ہو گئے۔ بھرم نے دوبارہ اور گولی چلائی۔ مگر بارہ نہایت پھرتی کے ساتھ بیٹھ گئے اور اس کے وار کو خالی کر دیا۔ کشن چند کسی خوف کے بغیر تنہا بھرم کا پیچھا کرتے رہے جب کہ "دشمن" کے پاس ریو اور تھا اور ان کے اپنے پاس لاطھی بھی نہیں تھی۔ دوڑتے دوڑتے آخر کار ساڑھے چارنٹ کی ایک چسار دیواری سامنے آگئی۔ بھرم اس پر کود گیا۔ کشن چند نے بھی فوراً اچھا لگائی اور دوسری طرف جا کر اس کو پکڑ دیا۔

"ایک سلع بھرم کو دوڑاتے ہوئے آپ کو ڈر نہیں لگا" ایک اخبار نویس نے کشن چند سے پوچھا "نہیں" انھوں نے جواب دیا "میں جانتا تھا کہ جب اس کا ریو اور خالی ہو چکا ہوگا تو میں اس کو پکڑ لوں گا" بھرم کے پاس تین گولی تھی۔ کشن چند نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی تینوں گولیاں خالی کر دیں۔ اب بھرم کا ہتھیار ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔ کشن چند نے اس کو پکڑ لیا (ہندستان مالٹریہ ستمبر ۱۹۸۰)

اس چھوٹے سے واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اکثر حالات میں حریف سے مقابلہ کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس کے وار کو خالی کر دیا جائے، یہاں تک کہ اس کے ہتھیار کی "تین گولی" ختم ہو جائے۔ پھر اس سے مقابلہ کرنا نہایت آسان ہو گا۔ مثلاً ایک

شخص آپ سے طاقت در ہے اور وہ آپ کی کسی بات پر برہم ہو جاتا ہے۔ جب وہ آپ کو ڈانٹتا اور بگڑنا شروع کرے تو ابتداً آپ اس کے وار کو خالی کر دیں، یعنی بالکل چپ ہو کر اس کی بات کو سنتے رہیں۔ یہاں تک کہ جب اس کے الفاظ ختم ہو جائیں اور اس کی بوجھ اس نکل جائے، اس وقت سبیدگی کے ساتھ صورت حال کے بارہ میں اس کو بتائیں۔ اگر آپ ابتداً میں اس قسم کا صبر دکھائیں تو آپ یقیناً کامیاب رہیں گے۔ کیوں کہ اب وہ اپنے ہتھیار کی "تین گولیاں" ختم کر چکا ہے اور اب بہت آسانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ ہیں جو آپ کے خلاف متحد ہو کر آگے ہیں اور آپ کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ غور کیجئے تو یہ اتحاد صرف اس بنیاد پر ہو گا کہ آپ ان کے سامنے ان کے حریف بن کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ حکمت عملی کا طریقہ اختیار کریں اور کچھ دیر کے لئے اپنے کونشانہ سے ہٹا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا اتحاد ڈوٹس رہا ہے۔ ان کے اتحاد کے ہتھیار کی گولی آپ کا حریف بن کر کھڑا ہونا تھا۔ جب آپ نے اپنے کو حریف کے مقام سے ہٹا دیا تو جو یا آپ نے ان کی "تینوں گولیاں" خالی کر دیں۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ منتشر ہو جائیں گے اور جو گروہ اختلاف اور انتشار میں پڑ جائے اس کو ختم کرنے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا گروہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے کو ختم کر لیتا ہے۔

کوئی حریف جب سامنے آتا ہے تو آدمی جوش میں آ کر اس سے لڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں وہ حریف کی طاقت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اگر آدمی صبر اور دانش مندی سے کام لے اور تقابل کے ابتداًی مرحلہ میں حریف کے وار کو خالی جانے دے تو بہت جلد ایسا ہو گا کہ حریف خود اپنی کارروائیوں کے نتیجہ میں اپنے کو غیر مسلح کر چکا ہو گا۔ یاد رکھئے، کوئی بھی شخص جو آپ کے مقابلہ میں آتا ہے اس کے پاس، ہمیشہ "تین" ہی گولیاں ہوتی ہیں۔ لاقعداً گولیاں کسی کے پاس نہیں ہوتیں۔ اگر آپ یہ ہوشیاری دکھائیں کہ مقابلہ کے آغاز میں کسی طرح اپنے کونشانہ سے ہٹا لیں تو اس کے بعد یقینی طور پر ایسا ہو گا کہ دشمن اپنی "تین گولیوں" کو ختم کر کے خالی ہاتھ ہو چکا ہو گا۔ اب زیادہ بہتر طور پر وہ وقت آ جائے گا کہ آپ اس کو زیر کر سکیں۔ یہ کامیابی ہر ایک حریف کے اوپر حاصل کی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ مقابلہ پیش

آنے کے بعد آدمی اپنے حواس کو نہ کھوئے۔

خدا جلدی نہیں چاہتا

ایک شخص اپنے عیسائی دوست سے ملنے گیا۔ جب وہ دوست کے یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے سامنے بے تالی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ "آج میں آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔ عیسائی دوست اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا:

I am in hurry, but God isn't

میں جلدی چاہتا ہوں۔ مگر خدا جلدی نہیں چاہتا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے صحن میں ایک مڑھائے ہوئے آم کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: میں نے اس کو بڑی امیدوں کے ساتھ پکھلے ہفتہ لگایا تھا۔ مگر اب وہ سوکھ کر ختم ہو چکا ہے۔

"یہ درخت تو کافی بڑا ہے، پھر ایک ہفتہ پہلے کیسے آپ نے اس کو لگایا تھا؟" آدمی نے پوچھا۔ "یہی تو اصل بات ہے" عیسائی دوست نے کہا "میں نے چاہا کہ میں اچانک ایک بڑا درخت اپنے یہاں کھڑا کر دوں۔ مگر خدا کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ میں نے آم کا چھوٹا پودا بونے کے بجائے یہ چاہا کہ پانچ سال کا درخت لا کر اپنے صحن میں لگاؤں اور اس طرح پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے کر لوں۔ میں نے درخت تو کہیں نہ کہیں سے لا کر لگایا۔ مگر وہ اگلے ہی دن سوکھ گیا۔ اور اب اس کی جو صورت ہے وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔"

اس کے بعد عیسائی دوست نے کہا: اس دنیا میں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے خدا کا ایک قانون ہے۔ ہم اس قانون کی پیروی کر کے ہی اس چیز کو اپنے لئے وجود میں لاسکتے ہیں۔ اگر ہم قدرت کے اصول کی پیروی نہ کریں اور اپنی خواہشوں پر چلنے لگیں تو ہمارے حصہ میں "سوکھا درخت" آئے گا نہ کہ "ہرا ہوا باغ"۔

لکڑی کی ایک کشتی کی تاریخ اگر چھوٹے پودے سے شروع کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر کشتی والا انتظار کرتا ہے کہ قدرت ایک درخت اگائے۔ زمین و آسمان کے تمام انتظامات

اس کو پروان چڑھانے کے لئے وقف ہوں۔ یہ کام سو برس تک ہوتا رہے۔ یہاں تک کہ جب مسلسل عمل کے نتیجہ میں ننھا پروا پختہ درخت کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، اس وقت کشتی والا اس کو کاٹتا ہے۔ اس کے تختے بناتا ہے اور پھر ان تختوں کو لوہے کی کمیلوں سے جوڑ کر کشتی تیار کرتا ہے جو انسانی قافلوں کو پانی کے اوپر سفر کرنے کے قابل بنائے۔

ذاتی معاملات میں ہر آدمی اس بات کو جانتا ہے۔ مگر جب ملت کا معاملہ ہو تو وہ چاہتا ہے کہ فی الفور ایک عظیم الشان کشتی دریا میں اتار دے۔ خواہ اس کے پاس کشتی کے نام سے کاغذ کی ناؤ ہی کیوں نہ ہو۔

یاد رکھئے، یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ اس کو خدا نے بنایا ہے۔ اور وہ اسی خدا کے قانون کے تحت چل رہی ہے۔ ہم اس سے موافقت کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کے ساتھ موافقت نہ کریں تو ہمیں اس دنیا میں کچھ ملنے والا نہیں۔

جس طرح درخت تدریج کے ساتھ اگتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے معاملات بھی تدریج کے ساتھ درست ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے قدرت کے اس تدریجی قانون کو جاننے اور اس کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے اپنا سفر شروع کیجئے۔ اس کے سوا اس دنیا میں کامیابی کا کوئی اور راستہ نہیں۔ بقیہ تمام راستے کھڈ کی طرف جاتے ہیں نہ کہ کسی منزل کی طرف۔

قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ صبر کا مطلب بے عملی نہیں، صبر دراصل منصوبہ بند عمل کا دوسرا نام ہے۔ بے صبر آدمی فوری رد عمل کے تحت بے سوچے سمجھے کارروائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس صبر والا آدمی اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملہ پر غور کرتا ہے۔ وہ اپنی طاقت اور دوسرے کی طاقت کا اندازہ کرتا ہے۔ وہ حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ قانون قدرت کو سمجھتا ہے جس کے دائرہ میں اس کو اپنا عمل کرنا ہے۔

اسی طرح سوچ بچار کے بعد عمل کا نقشہ بنانے کے لیے اپنے جذبات کو تھما پڑتا ہے، اس لیے اس کو شریعت میں صبر کہا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسی کو منصوبہ بند عمل کہتے ہیں۔ اس دنیا میں صابرانہ عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور غیر صابرانہ عمل ہمیشہ ناکام۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں عشرتیں میسر ہے۔ یہاں ہر ڈس ایڈوائس کے ساتھ ہمیشہ ایڈوائس موجود ہوتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

الم نشرح لَكَ صَدْرَكَ ووضعتنا لك وزرك الذي انقض ظهرك ورفعتنا لك ذكرك فإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ وَإِلَى رَبِّكَ فَارْغَبْ

کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا۔ اور تمہارا وہ بوجھ اتار دیا جو تمہاری پیٹھ کو توڑ رہا تھا۔ اور ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا۔ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو قسمت کرو، اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھو (الانفصاح)

یہ سورہ مکہ کے ابتدائی زمانہ میں اتری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب دعوت توحید کا آغاز کیا تو یہاں تمام لوگوں کو دینی لحاظ سے غیر متبرک سمجھانے کے ہم منہی تھا جو غیر اللہ کی بنیاد پر پڑائی اور سرداری کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ آپ کے سنت دشمن ہو گئے۔ وہ آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے۔ اس صورت حال نے آپ کو سنت پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اس وقت اس سورہ کے ذریعے آپ کو ایک سنت الہی سے باخبر کیا گیا۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں میسر کا رشتہ عشرت سے بندھا ہوا ہے۔ اس دنیا میں مشکل کا پیش آنا کسی نئی آسانی کی تہمید ہوتا ہے، بشرطیکہ آدمی جو مسئلہ دکھونے اور آنے والے بہتر مستقبل کا انتظار کر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت سے پہلے یہ مرحلہ گزرا کہ آپ حق کی تلاش میں منت سرگرداں ہوئے۔ وقت کے ماحول اور مروجہ مذہب میں آپ کو اطمینان نہیں مل رہا تھا۔ "سپائی کیا ہے؟" اس سوال نے آپ کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون غارت کر دیا۔ یہ اضطراب اگرچہ ابتداً "عسر" تھا، مگر اس کے اندر "یسر" کا پہلو بھی آ گیا۔ کیوں کہ اس نے آپ کو خشک زمین کی مانند بنا دیا تاکہ جب وحی کی صورت میں ہدایت آئے تو اس کی ایک ایک بوند آپ کے اندر جذب ہوتی چلی جائے۔ آپ بھر پور طور پر اس کو اخذ کر لیں۔ وہ پوری طرح آپ کے ذہن کو واضح اور روشن کر دے۔

دوسری چیز جو مذکورہ سنت کے لئے بطور مثال پیش کی گئی، وہ ریل ذکر کا معاملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید سے جن لوگوں کو مخالفت پیدا ہوئی، انہوں نے اس کو ناکام

کرنے کے لئے دعوت اور صاحب دعوت کو بدنام کرنے کی ہم شروع کر دی۔ وہ آپ کے خلاف اشعار کہہ کر اس کو پھیلاتے جو گویا اس زمانہ کی صحافت تھی۔ میلے اور بازار جو گویا اس زمانہ کے اجتماعات تھے، وہاں جا کر وہ لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے۔ وہ لوگوں کے سامنے آپ کی بری تصویر پیش کرتے تاکہ وہ آپ سے اور آپ کے سچے مشن سے بدگمان ہو جائیں۔

مخالفین نے عیب جوئی اور الزام تراشی کی جو ہم چھائی، اس کا مقصد ان کے اپنے خیال کے مطابق یہ تھا کہ صاحب دعوت کو بدنام کریں اور اس طرح لوگوں کو آپ کی دعوت سے متوحش کر دیں۔ مگر اس حصر میں بھی یسر کا پہلو نکلیا۔ مخالفین کے نزدیک وہ آپ کو بدنام کرنے کی کوشش تھی، مگر دوسروں کے لئے وہ تجسس کے ہم معنی بن گئی۔ اس طرح آپ کی شخصیت نہایت وسیع پیمانہ پر لوگوں کے سامنے سوال بن کر کھڑی ہو گئی۔ ہر آدمی تفصیلی طور پر یہ جاننے کا طالب بن گیا کہ محمد کون ہیں اور ان کی دعوت کیا ہے۔

انسانی فطرت کبھی جزئی مسلم پر تعلق نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ پوری بات جاننا چاہتی ہے۔ چنانچہ آپ کے خلاف کچھ باتیں سن کر لوگ اتنے ہی پر رک نہیں جاتے تھے، بلکہ وہ دعوت اور صاحب دعوت کے بارہ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے براہ راست تحقیق کرتے تھے۔ وہ آپ سے ملنے اور قرآن کا مطالعہ کرتے۔ اس طرح مخالفین کی مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کی دعوت ان دور دور کے معلقوں میں پہنچ گئی جہاں آپ خود ابھی تک اس کو نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مخالفین نے آپ کو بدنام کر کے آپ کے بارہ میں لوگوں کے اندر شوق تحقیق پیدا کیا۔ اور جب ان لوگوں نے براہ راست تحقیق کی تو ان میں سے بہت سے لوگ آپ کی دعوت کو حق پا کر اس کے حامی بن گئے۔

اس سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ عُمَر کے کُسر میں تبدیلی ہونے کا دو تجربہ تم کر چکے ہو۔ تلاش حق کی بے عینی کے بعد ہدایت کا منہ، بدنہی کی ہم سے اشاعت دعوت کے نئے مواقع پیدا ہونا۔ اسی طرح اس سنت الہی کا تیسرا نمونہ بھی حاضر ہے تمہارے سامنے آجائے گا۔ حالات کی فطری رفتار کو اپنی حد پر پہنچنے دو اور مستقبل کے ظہور تک صبر کے ساتھ اس کا انتظار کرو۔

اس تیسرے دور سے مراد دعوت اور صاحب دعوت کا نزاری دور سے نکل کر سکہ دور میں

داخل ہونا ہے۔ جس کو سورہ نصر میں "فتح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ موجودہ دور نزاع میں جو سخت حالات پیش آرہے ہیں، وہ آنے والے یسر کی تہئید ہیں۔ اس طرح وہ تمام ضروری اسباب حج کے بارہے ہیں کہ آئندہ جب مرحلہ استحکام آئے تو وہ حقیقی معنوں میں استحکام اور شہادت بن سکے۔

اس عمل کے دوران دعوت کے تمام پہلو پوری طرح واضح ہو جائیں۔ سچے انسان اور جھوٹے انسان ایک دوسرے سے الگ کر دئے جائیں۔ یہ معلوم ہو جائے کہ کون واقعی معنوں میں حق کا طالب ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو حق کا نام صرف اس لئے لیتے ہیں کہ اس کی آڑ میں اپنا ذاتی مفاد حاصل کر سکیں۔

گم نامی میں پڑے ہوئے جو اہر نکھرائیں اور مصنوعی شہرت کا سبب وہ اور مٹنے والے لوگ بے نقاب ہو جائیں۔

نیز یہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی منکر کو ماحول میں غلبہ حاصل ہو تو اس طرح ہو کہ وہ ان کا ایک ثابت شدہ حق بن چکا ہو، اور اسی طرح جب آپ کے مخالفین کو مغلوب کیا جائے تو یہ مغلوبیت اس طرح آئے کہ وہ لوگوں کو ایک کھلی ہوئی تاریخی ضرورت دکھائی دینے لگے۔

عُسر میں یسر کا یہ تجربہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا، یہی آئندہ بھی آپ کے امتیوں کو ہوتا رہے گا، بشرطیکہ وہ اسی صراط مستقیم پر چلیں جس پر آپ چکے اور اسی صبر اور استقامت کا ثبوت دے سکیں جس کا ثبوت آپ نے اپنے زمانہ میں دیا۔

فرقہ وارانہ مسئلہ

الرسالہ مارچ ۱۹۸۹ء کے سرورق پر لکھا گیا تھا — ہر قسم کے فساد کے خلاف سب سے بڑا روک صرف ایک ہے : اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا۔

اس میں شک نہیں کہ یہی فسادات کو روکنے کا واحد کارگر اصول ہے۔ اس کے سوا جو باتیں بھی باقی ہیں وہ سب کی سب صرف جھگڑے کو بڑھانے والی ہیں نہ کہ اس کو ختم کرنے والی۔ مزید یہ کہ اس اصول کا تعلق صرف ہندستان سے نہیں، بلکہ تمام دنیا سے ہے۔ خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ایک قوم کا معاملہ ہو یا کئی قوموں کا معاملہ، ہر جگہ فساد سے بچنے اور پر امن زندگی گزارنے کا یہی بے نظا اصول ہے۔ مسلمانوں کو جہاں کہیں بھی پرامن زندگی حاصل ہے، وہ اسی لیے حاصل ہے کہ وہاں انہوں نے یہ قیمت ادا کر دی ہے۔ اور جہاں کہیں انہیں پرامن زندگی حاصل نہیں، وہ اسی لیے حاصل نہیں کہ وہاں وہ یہ ضروری قیمت دینے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔

مسلمانوں کے لیڈر اور دانشور اب تک جس روش پر قائم رہے ہیں، اس کو، ایک لفظ میں، دل کی بھڑاس نکالنا کہا جاسکتا ہے۔ مگر الفاظ بول کر دل کی بھڑاس نکالنا کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ ضرورت ہے کہ اب اس معاملہ میں اپنی کوششوں کو نتیجہ خیز (Result-oriented) بنایا جائے۔ مسئلہ کا حل تلاش کرنے پر ساری توجہ صرف کی جائے نہ کہ مسئلہ کے خلاف لفظی احتجاج کرنے پر۔

ہندستان کے فسادات

ہندستان میں پچھلی آدھی صدی سے فرقہ وارانہ فسادات بھڑک رہے ہیں۔ ان فسادات کی کہانی ہمیشہ تقریباً ایک ہوتی ہے۔ ابتدا پسند ہندوؤں کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز کارروائی کی جاتی ہے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو کر جوابی کارروائی کرتے ہیں۔ اب نزاع بڑھتی ہے، یہاں تک کہ باقاعدہ فساد ہو جاتا ہے جو بالآخر مسلمانوں کے سخت جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتا ہے۔

ایسے موقع پر مسلم رہنما اور دانشور ہمیشہ مسلمانوں کے ردعمل کو یہ کہہ کر جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ جوابی طور پر پیش آیا۔ اس سلسلہ میں کوٹہ (راجستھان) کے فساد کی مثال لیجئے۔ ایک مسلم انگریزی ہفت روزہ (۸-۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء) کی اپنی رپورٹ کے مطابق، ۱۳ ستمبر ۱۹۸۹ء کو کوٹہ میں ہندوؤں نے انتہا چتر دشی کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس مسلم علاقہ سے گزرا۔ وہاں اس نے اشتعال انگیز نعرے لگائے جو مسلمانوں کے جذبات

کو مجرد کرنے والے تھے۔ مسلمانوں نے بلوس والوں کو ایسے نعرے لگانے سے روکا۔ مگر وہ نہیں رکے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے بھی جوابی طور پر نعرے بلند کیے۔ اس کے بعد (ہندوؤں کی طرف سے) مسلمانوں پر پتھر پھینکنے گئے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی ان پر پتھر پھینکے۔ اس کے بعد فساد بھڑک اٹھا۔ مسلمان مارے گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ ان کی بہت سی دکانیں اور مکانات جلا دیے گئے۔ (صفحہ ۳) نئی دہلی موت ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹

اسی طرح بدایوں (یوپی) میں ۲۸ ستمبر ۱۹۸۹ کو فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں مسلمانوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اتر پردیش کی کانگریسی حکومت نے اردو کو ریاست کی سکولز اینڈ ٹیچنگ قرار دینے کا بل پاس کیا۔ اس پر بدایوں کے شہری کرشن انٹر کالج کے ہندو طلبہ نے اردو کی مخالفت میں ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں مشتعل کرنے والے نعرے لگائے گئے۔ یہ جلوس کلکٹریٹ تک جا کر ختم ہو گیا اور اس دن کوئی فساد پیش نہیں آیا۔

اگلے دن (۲۸ ستمبر) کو بدایوں کے اسلامیہ انٹر کالج کے مسلم طلبہ نے تقریباً تین سو کی تعداد میں جمع ہو کر جوابی جلوس نکالا۔ یہ جلوس نعرہ لگاتا ہوا شہری کرشن انٹر کالج کے سامنے سے گزرا۔ وہاں مسلم طلبہ پر پتھر اڑا ہوا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی ویسا ہی کیا۔ اس کے بعد فرقہ وارانہ فساد سپوٹ پڑا (قومی آواز ۹ اکتوبر ۱۹۸۹)

یہی اکثر فسادات کی کہانی ہے۔ مسلم ترجمانوں کے خود اپنے بیان کے مطابق، ہندوؤں کی طرف سے جلوس، لاوڈ اسپیکر، ہولی کے رنگ، نعرہ بازی یا اور کسی صورت میں اشتعال انگیزی کا دانتھ پیش آتا ہے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو کر ان سے لڑا جاتا ہے۔ اب لڑائی بڑھتی ہے اور باقاعدہ فساد کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو "نزاع بر عضو ضعیف" کے اصول پر ہمیشہ مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتی ہے۔

منفی رد عمل

مسلمانوں کا یہ طریقہ منفی رد عمل کا طریقہ ہے۔ اور ایسا طریقہ یقینی طور پر قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ ایسے مواقع پر قرآن نے اعراض کا حکم دیا ہے نہ کہ جوابی طور پر الجھنے کا۔ یہ صحیح ہے کہ مذکورہ قسم کی جوابی کارروائی میں مسلمانوں کا ایک ممد و طبقہ ہی ملوث ہوتا ہے۔ مگر دوسرے مسلمان، خاص طور پر مسلمانوں کا رہنما اور دانشور طبقہ، بھی پوری طرح اس میں شریک ہے، کیونکہ وہ ان کی مذمت نہیں کرتا، بلکہ ان کی جوابی کارروائی کو جائز و مستحکم دے کر ان کا لفظی دفاع کرتا ہے۔ کچھ مسلمان اگر اس منفی رد عمل میں براہ راست طور پر شریک ہیں تو یقیناً مسلمان

اس میں بالواسطہ طور پر شریک قرار پاتے ہیں۔

مسلمان پچھلے پچاس برس سے اسی جوانی روش پر قائم ہیں اور وہ اس کو جہاد سمجھتے ہیں۔ مگر اصل مسئلہ کامل نہ ہونا بلکہ اس کا بڑھتے رہنا ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کی منشا کے خلاف ہے۔ اگر ان کا عمل خدا کی منشا کے مطابق ہوتا تو خدا کی مدد آتی اور مسئلہ کو حل کر دیتی۔ مگر بان و مال کی بے پناہ ہلاکت کے باوجود اب تک اس معاملہ میں خدا کی مدد نہیں آئی۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مسلمانوں کا یہ عمل خدا کے نقشہ کے مطابق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان اور ان کے رہنما اپنی اس روش کو مکمل طور پر بدل ڈالیں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ صورت حال اور خراب ہو جائے۔ اب تک وہ انسانوں کی پکڑ میں تھے، آئندہ وہ خدائے ذوالجلال کی پکڑ میں آجائیں۔

سترآن و مدیث کی رہنمائی

مسلمانوں کا یہ طریقہ منفری رد عمل کا طریقہ ہے، اور اس قسم کے رد عمل سے قرآن و مدیث میں صراحتاً منع کیا گیا ہے۔ قرآن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جو اب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قربت والا۔ اور یہ بات انہیں کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیب والا ہے (رحم السجدہ ۳۳-۳۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ لا یمحوا السیئ بالسیئ ولكن یمحوا
الشریرائی کو برائی کے ذریعہ نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو
السیئ بالحسن۔ ان الخبیث لا یمحوا
بھلائی کے ذریعہ مٹاتا ہے۔ بری چیز کبھی بری
الخبیث (مشکاۃ العالیخ، الجزران، ص ۸۳۵) چیز کو نہیں مٹاتی۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے مذکورہ قرآنی آیت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

امر اللہ المؤمنین بالصبر عند الغضب
والعلم عند الجهل والنعو عند الإساءة
اللہ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے غصہ کے وقت صبر کا، جہالت
کے وقت برداشت کا، اور برائی کے وقت معافی
کا۔ جب وہ ایسا کریں تو اللہ انہیں شیطان سے محفوظ
کر دے گا اور ان کے دشمن کو ان کے لیے جہاد دے گا۔ گویا
ونضع لهم عدوهم کاندہ ولی حمیم

(تفسیر ابن کثیر، الجزاء الرابع، صفحہ ۱۰۱)

کہ وہ ان کا قریبی دوست ہو۔

مذکورہ آیت اور حدیث اور صحابی کی تشریح کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان کے موجودہ حالات میں مسلمان جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ سراسر شریعت اسلامی کے خلاف ہے۔ مسلمان رد عمل کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ وہ صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔

مسلمان اپنے نام نہادر ہنماؤں کے بتائے ہوئے عمل پر پچاس برس تک کم از کم پچاس ہزار بار عمل کر چکے اور ہمیشہ ناکام رہے۔ اب انھیں خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کا تجربہ کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ مسلمان برائی کے بدلہ میں بھلائی کی روش اختیار کریں۔ وہ شور کا جواب خاموشی سے دیں اور نفرت کے معنی بدلہ میں محبت کا مظاہرہ کریں۔

خدا نے اپنی دنیا کا جو نظام بنایا ہے اس میں برائی کا خاتمہ جو ابی برائی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ برائی کے جواب میں بھلائی کی جائے۔ خدا کی دنیا میں صبر کی طاقت فہم سے زیادہ ہے۔ یہاں جہالت کے مقابلہ میں برداشت زیادہ وزن رکھتی ہے۔ یہاں انتقام کے بجائے معاف کر دینا اپنے اندر تیزی طاقت رکھتا ہے۔ یہاں دشمن کو زیر کرنے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ دوستی اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے۔

نرمی اور تحمل کے طریقہ کی اہمیت حدیث میں مختلف طریقوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بتائی گئی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نرم و مہربان ہے اور نرمی و مہربانی کو پسند کرتا ہے۔ اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا اور نہ کسی اور چیز پر دیتا۔ نرمی جس چیز میں بھی ہو وہ اس کو نیت دے گی۔ اور وہ جس چیز میں بھی اس کو نیت دے گی۔ جو شخص برائی سے غالی ہو وہ ہر بھلائی سے غالی ہو جائے گا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : ان اللہ تعالیٰ رقیق یحب الرفق ویعطی علی الرفق مللاً یعطی علی العنف و مللاً یعطی علی ما سواہ۔۔۔ ان الرفق لا یكون فی شیء الا زانہ و لا یفسد من شیء الا شانہ۔۔۔ من یحرم الرفق یحرم الخیر (مشکوٰۃ المعانی) الجزاء ث، صفحہ ۱۳۰۴

صبر و اعراض ایک اعلیٰ ترین حفاظتی تدبیر ہے۔ اس تدبیر کے ذریعہ آپ فساد کے ہر کم کو یقیناً ناکارہ

(Defuse) کر سکتے ہیں۔ یہ مل ہم خرم و ہم ثواب کا مصداق ہے۔ اس کو اختیار کر کے مسلمان اپنا مسئلہ بھی حل کریں گے، اور اسی کے ساتھ انھیں عبادت کا ثواب بھی حاصل ہوگا، کیونکہ یہ مل خود خدا و رسول کی طرف سے ہمیں بتایا گیا ہے۔

مثبت طرز عمل کی مثال

ادپر کوڑ اور بدایوں کی مثال نقل کی گئی ہے جب کہ مسلمانوں نے منفی رد عمل کا طریقہ اختیار کیا اور اس کا برا انجام ان کے سامنے آیا۔ اب اس کے برعکس دو مثالیں لیجئے جب کہ مسلمانوں نے جوابی کارروائی سے پرہیز کرتے ہوئے مثبت روش اختیار کی۔ اس کے نتیجہ میں ان کے جان و مال بربادی سے محفوظ رہے۔

فروری ۱۹۸۹ میں شیوگنج (راجستان) میں بیڈ گواڑ جنم شتابدی کے موقع پر ہندوؤں نے جلوس نکالا۔ جلوس مقامی جامع مسجد کے سامنے پہنچ کر اشتعال انگیز نعرے لگانے لگا۔ مگر وہاں کوئی مسلمان ان کا جواب دینے یا روک ٹوک کرنے کے لیے سامنے نہیں آیا۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ مسجد کے امام مولانا تاندان بخش بلوچ باہر نکلے۔ انھوں نے جوابی اشتعال کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سادہ طور پر یہ کہہ کر جلوس کے افراد سے دوستانہ ملاقات شروع کر دی۔ ان کے ”آداب عرض“ کو دیکھ کر جلوس کے نوجوان بھی ”مولوی جی نمستے، مولوی جی نمستے“ کے الفاظ بولنے لگے۔ اس کے بعد جلوس کا سارا زور اپنے آپ ختم ہو گیا۔ پانچ منٹ میں لوگ ٹھنڈے ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

دوسری مثال دہلی کی ہے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو دہلی ہندو پریشد کی طرف سے دہلی میں ”وراث ہندو سمیلن“ منایا گیا۔ بوٹ کلب پر بڑی تعداد میں ہندو جمع ہوئے۔ وہاں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں اور مخالفانہ نعرے لگائے گئے۔ ہندوؤں کا یہ ہجوم بوٹ کلب سے واپس ہوا تو وہ مسلم مخالف نعرے لگا رہا تھا۔ مثلاً ”ہندو بن کر رہنا ہوگا، ہندو سے ماترم کہنا ہوگا“ وغیرہ۔ انھوں نے اپنے راستے میں مسجدوں کی بے حرمتی کی۔ نئی دہلی کی ایک مسجد کا بورڈ توڑ ڈالا۔ وغیرہ

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر دہلی کے مسلمان پوری طرح اعراض کی پالیسی پر قائم رہے۔ انھوں نے سناگر اپنے کان بند کر لیے۔ انھوں نے دیکھا مگر اپنی نظریں پھیر لیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ۲۲ ستمبر کو دہلی میں کوئی فساد ہوا اور نہ اس کے بعد۔ ہندوؤں کے مخالفانہ الفاظ وقتی شور وغل بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔

یہ صرف دو مثالیں نہیں ہیں۔ اس طرح کی مثالیں بڑی تعداد میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ

ہے کہ فساد ہونے کے مقابلہ میں فساد نہ ہونے کے واقعات کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ مگر اول الذکر واقعات ان خبروں میں چھپ کر مشہور ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ثانی الذکر واقعات اخباروں میں نہیں چھپتے، اس لیے وہ لوگوں کے علم میں بھی نہیں آتے۔

صماہی کی نصیحت

ہندستان کے فسادات کا بہترین حل وہ ہے جو ایک صماہی نے ۱۳ سو سال پہلے بتا دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد بن غنم بن حنیف نے اپنی لڑکے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

من لا یرضی بالقلیل مما یأتی بہ السفیدہ جو شخص نادان کی طرف سے پیش آنے والی چھوٹی یرضی بالکثیر (حیاء الصماہی، الجزر الثانی، تکلیف پر راضی نہ ہوگا اس کو نادان کی طرف سے بڑی تکلیف پر راضی ہونا پڑے گا۔ صفحہ ۶۳۷)

صماہی کے اس قول میں زندگی کی ایک حقیقت بتائی گئی ہے۔ یہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں جتنی باہمی تھی، اتنی ہی باہمی وہ آج بھی ہے۔ وہ جس طرح مسلم اکثریت کے ملک میں اہمیت رکھتی تھی، اسی طرح وہ غیر مسلم اکثریت کے ملک میں بھی اہمیت رکھتی ہے۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں بہر حال دوسروں کی طرف سے تکلیف کی باتیں پیش آتی ہیں۔ یہاں عقل مندی اور کامیابی یہ ہے کہ بہت دانی چھوٹی تکلیف کو برداشت کر لیا جائے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو معاملہ بڑھتا ہے اور زیادہ بڑی تکلیف سے سابقہ پیش آتا ہے۔ بڑی تکلیف سے بچنے کا واحد راستہ چھوٹی تکلیف کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہی کامیاب زندگی کا واحد اصول ہے، خواہ گھر کا معاملہ ہو یا سماج کا معاملہ یا پورے ملک کا معاملہ۔

اس کی ایک مثال بلوس کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوؤں کا بلوس باجا بجاتا ہوا مسجد کے سامنے سے گزرتا تھا اس وقت مسلمانوں نے باجا کو برداشت نہیں کیا اور بلوس کی روٹ بد لنے پر اصرار کیا۔ اس سے مسئلہ تو ختم نہیں ہوا۔ البتہ بعد کو مزید یہ خرابی پیدا ہوئی کہ ہندوؤں کا بلوس اسی کے ساتھ مسلم مخالف نعرے بھی لگانے لگا۔ اس پر مسلمانوں نے دوبارہ روک ٹوک کی۔ اب یہ ہوا کہ بلوس اور نعرہ تو ختم نہیں ہوا۔ البتہ اس میں تیسری چیز کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ کہ بلوس باجے اور نعرے کے ساتھ ٹرک میں پتھر بھر کر پلٹے لگتا کہ مسجدوں اور مسلم محلوں پر خشک باری کرتا ہوا گزرے۔ مزید یہ کہ پہلے اگر بلوس سال میں چھتہ بار

نکلتا تھا تو اب وہ روزانہ اور ہر جگہ نکلنے لگا۔

بڑھتے ہوئے مسائل کی یہ صورت حال صحابی کی نصیحت کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ مسلمانوں کی ردعمل کی سیاست کو بالکل بے فائدہ ثابت کر رہی ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان صحابی کی مذکورہ نصیحت کی اہمیت کو سمجھیں اور ردعمل کی روش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔

دوسری غلطی نہیں

فساد کا عمل سادہ لفظاً میں صرف ایک ہے ————— ”دوسری غلطی نہ کیجئے“ — ایک فریق کی طرف سے کی جانے والی پہلی غلطی کبھی فساد تک نہیں پہنچ سکتی، جب تک فریقِ ثانی دوسری غلطی نہ کرے۔ جس طرح دونوں ہاتھوں کو حرکت میں لائے بغیر تالی نہیں بنتی، اسی طرح صرف پہلی غلطی فساد برپا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ مسلمان اگر یہ غلطے کر لیں کہ وہ فرقہ پرست عناصر کی پہلی غلطی کے باوجود کبھی دوسری غلطی نہ کریں گے تو صرف اس ایک فیصلے سے وہ فساد کے اسکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔

پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا فساد کو پھیلنے کا موقع دینا ہے۔ اس کے برعکس جب پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کی جائے تو فساد اپنے پہلے ہی مرحلے میں ختم ہو کر رہ جائے گا۔ پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا گویا آگ پر پٹرول ڈالنا ہے، اور پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کرنا گویا آگ پر پانی ڈالنا۔

مسلمان ہر سال بے شمار تعداد میں سیرۃ النبیؐ کے جلسے کرتے ہیں۔ ان جلسوں میں پرفر طور پر کہا جاتا ہے کہ ”سلام اس پر کہ جس نے گایاں کہا کہ دما میں دیں“ مسلم شعرا و جو شس و خروش کے ساتھ اس قسم کی نظلیں پڑھتے ہیں :

راہ میں جس نے کانٹے پھمائے گالی دی پتھر برسائے اس پر چھر کی پیاری شبنم صلی اللہ علیہ وسلم
اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبرؐ کی جس صفت کو بطور فخر پیش کرتے رہے ہیں، اس کو اپنی زندگیوں میں بطور نمونہ اختیار کر لیں۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے امتی بھی بن جائیں گے اور اسی کے ساتھ تعصب اور غلظ اور فساد کا مسئلہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا جس طرح وہ رسول اور اصحاب رسول کے لیے اسی طریقہ کو اختیار کرنے کی بنا پر ختم ہو گیا تھا۔

داعیانہ اخلاق

صبر و اعراض کی اہمیت صرف اس لحاظ سے نہیں ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کا حل ہے۔ اس

سے بڑھ کر یہ کہ اپنی داعیہ حیثیت کی بنا پر مسلمانوں کو لازماً ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مسلمان خدا کی طرف سے خدا کے دین کا داعی ہے۔ ہندو اور دوسری تمام قومیں اس کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جو لوگ مدعو کی حیثیت رکھتے ہوں، ان کے بارہ میں خدا کا حکم ہے کہ ان کی طرف سے پیش آنے والی ناخوش گوار یوں کو ایک طرز طور پر برداشت کیا جائے۔ تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان تناؤ کی فضا پیدا نہ ہونے پائے۔ کیونکہ تناؤ کی فضا میں کوئی دعوتی کام نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں کی داعیہ حیثیت ان کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری قرار دیتی ہے کہ وہ برادران وطن سے حریت اور رقیب کا برتاؤ نہ کریں۔ بلکہ وہ ان کے ہمدرد اور غیر خواہنیں۔ مسلمانوں کے اوپر لازم ہے کہ وہ برادران وطن کی ایذا رسانی پر آخری حد تک صبر کریں۔ وہ ان کی ایذا رسانی کے باوجود ان کے حق میں دعائیں کریں۔ وہ دل سے ان کی اصلاح اور نجات کے حریص بن جائیں۔

آخرت میں امت محمدی کو جو سب سے بڑا اعزاز ملنے والا ہے وہ شہداء علی الناس کا اعزاز ہے۔ مگر یہ اعزاز صرف انہیں لوگوں کو ملے گا جنہوں نے دنیا میں خدا کے دین کی شہادت دی ہو۔ اور اس شہادت (گواہی) کی راہ میں ایک طرز صبر و اعراض کی وہ قربانی دی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔

آخری بات

اب موجودہ حالات میں مسلمانوں کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ ایک، نام نہاد رہنماؤں کا طریقہ جو ان کو رد عمل کے راستے پر چلنے کا سبق دے رہا ہے۔ دوسرا، خدا و رسول کا طریقہ جو انہیں پکار رہا ہے کہ رد عمل سے بچو اور صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ رہنماؤں کا طریقہ ذلت اور بربادی کی طرف لے جاتا ہے، اور خدا و رسول کا طریقہ عزت اور کامیابی کی طرف۔ اب مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ دونوں میں سے کس طریقہ کو اپنے لیے پسند کر رہے ہیں۔

سازہ واقعات امید افزا طور پر بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں نیا شعور جاگا ہے۔ اب تک مسلمانوں میں یہ روایت جاری تھی کہ جب بھی ہندوؤں کا کوئی جلوس مسجد کے سامنے سے گزرے یا ہندوؤں کی ایک جماعت کوئی منافیانہ نعروں کا دے تو مسلمان فوراً اس کو اپنے لیے قومی وقار کا سلبنا لیتے تھے اور ایسے لوگوں سے لڑنے بھڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے تیسرے بار ہندوؤں کا فساد پیش آیا تھا۔ اب اس کے برعکس منظر سامنے آ رہا ہے۔ بلکہ جو مسلمان ایسا کر رہے ہیں کہ وہ ایسے واقعات کو ناقابل لحاظ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس

طرح فساد کا قائم نام اپنے آپ ناکارہ ہو کر غیر موثر ہو جاتا ہے۔

یہ ایک نئے مستقبل کی علامت ہے۔ انشا اللہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ صبر و اعراف کی نئی روایت مسلمانوں میں قائم ہو جائے جس طرح ماضی میں رد عمل کی روایت ان کے درمیان قائم ہو گئی تھی۔ لوگ ناپسندیدہ باتوں کو اسی طرح نظر انداز کرنے لگیں جس طرح اس سے پہلے وہ ان سے الجھ جیا کرتے تھے۔ مستقبل کے افق پر صبح کا اجالا ظاہر ہو چکا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ایک روشن سورج ان کے اوپر اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگے۔

امن اور ترقی کی طرف

۱۹ نومبر سے لے کر ۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ تک میں ایک بیرونی سفر پر تھا۔ اس دوران میں قیام امریکہ اور جاپان میں رہا۔ امریکہ میں ایسے مسلمان بڑی تعداد میں ہیں جو ہندستان، پاکستان وغیرہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور اب امریکہ کے شہری بن کر وہاں پر عافیت زندگی گزار رہے ہیں۔

سفر کے آخری دنوں میں امریکی مسلمانوں کی ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں میں بھی شریک تھا۔ اس میٹنگ میں ہندستانی مسلمانوں کے موجودہ حالات پر تشریحات کا اظہار کیا گیا۔ اس کا انداز تقریباً وہی تھا جو عام طور پر ہندو پاک کے مسلم لیڈروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ہر ایک نے اس معاملہ میں مسلمانوں کی مظلومیت پر غم کا اظہار کیا، اور ہندوؤں کو ظالم بت کر ان کے خلاف ہرجس جوش احتجاجی تقریر کی۔ حتیٰ کہ کچھ لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندستانی مسلمانوں کو جہاد کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرنا چاہئے

میں نے کہا کہ یہ طریقہ بظاہر درست نظر آسکتا ہے، مگر وہ مسئلہ کا حل نہیں۔ اس طریقہ کا مطلب مسلک کو خالص اصولی اور قانونی اعتبار سے دیکھنا ہے۔ عام طور پر لوگ اظہار خیال کے وقت اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا انداز بھی اسی قسم کا ہے۔ مگر مسئلہ کے حل کے اعتبار سے یہ طریقہ بالکل کارآمد نہیں۔ اپنی ذات پر آپ اصولی معیار کا استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جب معاملہ دوسروں کا ہو تو عملی نقطہ نظر اختیار کرنا ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ اصولی جائزہ میں زیادہ سے زیادہ جو چیز آپ کے حصہ میں آتی ہے، وہ فوری ثانی کے خلاف نفی مذمت یا لفظی احتجاج ہے۔ جہاں تک اصل صورت حال کا تعلق ہے، وہ بدستور اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔ اس طریقہ کا اول و آخر حاصل صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنا ہے نہ کہ فی الواقع اختلافی مسئلہ کو ختم کرنا۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو عملی نقطہ نظر کہا جاسکتا ہے۔ یعنی نظری انصاف کے پہلو کو زیر بحث لانے بغیر یہ دیکھنا کہ مسئلہ کا واقعی حل کیا ہے۔ جو ناپسندیدہ صورت حال موجود ہے، اس کا عملی فائدہ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ یہی دوسرا طریقہ تادم ہیر ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ معاہدہ

(۶۲۸ء) کے ضمن میں اختیار فرمایا۔ اس کو ہم ایک نقطہ میں، حدیبیہ پرنسپل (Hudaibiya principle)

کہہ سکتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے اب تک اس عملی حل کو اختیار نہیں کیا۔
 قدیم مثل ہے کہ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو ہاتھوں میں سے ایک
 ہاتھ کو ہٹایا جائے تو تالی کا بننا اپنے آپ بند ہو جائے گا۔ اسی عملی اصول کا تاریخی نام حدیثیہ پرنسپل ہے۔
 اس پرنسپل میں معاملہ کا ایک فریق اپنے آپ کو اس پر راضی کرتا ہے کہ وہ غیر شرط طور پر فریق ثانی کے
 ساتھ ایڈجسٹمنٹ کرے گا۔ وہ ایک طرف طور پر اپنا "ہاتھ" شکرانہ کے مقام سے ہٹا کر تالی بننے کے عمل کو متوقف
 کر دے گا، تاکہ وہ معتدل فضا قائم ہو جس میں تعمیر و ترقی کا کام پر امن طور پر انجام دیا جاسکے۔

میں نے امریکی مسلمانوں سے معذرت کہتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ اس معاملہ میں ڈبل ایڈجسٹمنٹ
 نظر آتے ہیں۔ آپ لوگوں کا اپنا حال تو یہ ہے کہ آپ آخری حد تک امریکہ کے نظام سے ایڈجسٹ کر کے
 یہاں اپنے مستقبل کو بنانے میں مشغول ہیں۔ مگر ہندستانی مسلمانوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کے
 نظام سے لڑ کر وہاں اپنے لئے زندگی کی تعمیر کریں۔

میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے
 ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق، آپ کو ہندستانی مسلمانوں سے یہ کہنا چاہئے کہ امریکہ
 میں ہمارے لئے بہت سی ناموافق باتیں تھیں، مگر ہم نے ان سے لڑے بغیر اپنے لئے راستہ نکالا۔ اس کے
 نتیجہ میں یہاں ہم کو ایک کامیاب زندگی حاصل ہو گئی۔ تم لوگ بھی ہندستان میں اسی تجربہ کو دہراؤ۔ تم لوگ
 بھی اسی طرح وہاں کے نظام سے لڑے بغیر حکیمانہ تدبیر سے اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔ مگر آپ لوگوں کا حال، اس
 کے برعکس یہ ہے کہ آپ اپنے لئے ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ پسند کر رہے ہیں اور ہندستانی مسلمانوں کے لئے
 مکراد کا طریقہ۔

انطباق کی دو صورتیں

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ لڑاؤ میں۔ اختلافی معاملات، اکثر
 حالات میں ایک طرف (unilateral) طریقہ پر حل ہوتے ہیں نہ کہ دو طرفہ (bilateral) طریقہ پر۔
 اس ایک طرفہ اصول (unilateralism) کے استعمال کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اکثریتی فریق
 اپنا "ہاتھ" ہٹانے پر راضی ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اقلیت فریق اس کی ذمہ داری قبول کرے۔ اگر
 وہ ایسا کرے تو وہ اپنے "ہاتھ" کو سامنے سے ہٹا کر معاملہ کا خاتمہ کر دے گا۔

امریکہ اور جاپان میں جو کچھ میں نے دیکھا، اور دونوں ملکوں کے بارہ میں جو کچھ پڑھا، اس کے مطابق، میری رائے ہے کہ امریکہ کی تاریخ میں اقلیتی فریق کے ایڈجسٹمنٹ کی مثال پائی جاتی ہے۔ اور جاپان اکثریتی فریق کے ایڈجسٹمنٹ کی ایک کامیاب مثال ہے۔

اقلیتی فریق کا ایڈجسٹمنٹ

امریکہ کے اقلیتی فریق سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو عام طور پر ہاجر (immigrants) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو مختلف ملکوں سے امریکہ آئے اور پھر یہاں کے شہری بن کر یہاں رہنے لگے۔ اس سفر کے دوران اس طبقہ کے بہت سے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی۔ ان میں مختلف ملکوں کے لوگ بھی تھے اور مختلف مذہبوں کے لوگ بھی۔

ان ہاجرین کے لئے امریکہ میں مختلف مسائل تھے۔ مگر ان مسائل میں انہوں نے ایک طرف طور پر امریکی نظام سے ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کیا۔ مثال کے طور پر ایک ہندو جب ہندوستان میں تھا تو وہ "بھارت" کو اپنا دیوتا سمجھتا تھا۔ اس کی تمام وفاداریاں بھارت کی سرزمین سے وابستہ تھیں۔ وہ فزکے ساتھ وطن تقدس کا وہ ترانہ گاتا تھا جس کو ہندسے ماترم کہا جاتا ہے۔ مگر امریکہ میں جب اس نے وہاں کی شہریت لینا چاہا تو اس کو معلوم ہوا کہ اس کا بھارتی عقیدہ امریکی نظریے سے ٹکرا رہا ہے۔ اس کو امریکی شہریت صرف اس وقت مل سکتی ہے جب کہ وہ بھارت سے اپنی وفاداری کو مکمل طور پر اور مطلق طور پر ختم کر دے۔ وہ اپنی تمام وفاداریاں صرف امریکہ (U.S.A.) کے ساتھ وابستہ کر دے۔ یہاں اس نے امریکی نظام سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے اصول کو بدلے۔ اس کے بدلے اس نے خود اپنے عقیدہ پر نظر ثانی کی۔ امریکی دستور کے مطابق اس نے امریکہ کی غیر مشروط وفاداری کا لطف (Oath of Allegiance) لیا اور اس طرح وہ امریکہ کا شہری بن گیا۔

اسی طرح مسلمان کے عقیدہ کے مطابق، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے جنگ کرنا حرام ہے۔ مسلمان کا یہ عقیدہ امریکہ کے قانون شہریت سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ امریکہ کے دستور کے مطابق، ہر امریکی شہری پر لازم ہے کہ جب بھی کسی دوسرے ملک سے امریکہ کی جنگ پیش آنے کو کسی تحفظ یا استثناء کے بغیر وہ امریکہ کی طرف سے اس غیر ملک کے خلاف جنگ کرے۔

امریکہ کے زمانہ قدیم میں میری ملاقات ایک مسلمان فوجی سے ہوئی۔ اس نے کہا کہ مجھے علیحدگی عرب

میں جانے والی امریکی فوج میں بھیجا جا رہا ہے۔ امریکہ اگر عراق کے خلاف جنگ چھیڑتا ہے تو مجھے ایک مسلم فوج کے خلاف لڑنا ہوگا جو کہ اسلام میں حرام ہے۔ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔

امریکہ میں اس وقت تقریباً پانچ ملین مہاجر مسلمان آباد ہیں۔ ان مسلمانوں نے وفاداری کا مقررہ حلف نامہ دے کر امریکہ کی شہریت کا اختیار کیا ہے۔ انہوں نے امریکہ سے یہ مانگ نہیں کی کہ وہ اپنے قانون کو بدل کر اس میں یہ استثنائی دفعہ شامل کرے کہ مسلمان مہاجر اس وقت جنگ میں شرکت کے پابند نہ ہوں گے جب کہ امریکہ کسی مسلم ملک یا مسلم قوم سے برسرِ جنگ ہو جائے۔ تمام امریکی مسلمانوں نے بلاکٹ امریکن نظام کو قبول کرتے ہوئے اس کی دفاداری کا حلف لیا، اور خود امریکہ کی شرط پر نہ کہ اپنی مشیٹ پر، امریکہ کے شہری بن گئے۔ امریکہ کے مہاجرین نے امریکہ میں جو کامیابی حاصل کی ہے، اس کو انہوں نے ایڈجسٹمنٹ کے ذریعہ حاصل کیا ہے نہ کہ ٹکراؤ کے ذریعہ۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ امریکہ میں یہ قانون ہے کہ ایک شخص اگر اپنے بعد جائیداد چھوڑ کر مرے تو اس کی جائیداد کا ۴۰ فی صد حصہ گورنمنٹ کے خزانہ میں چلا جائے گا۔ اس کے بعد بقیہ ترکہ کا بیسٹرز حصہ متوفی کی رفیقہ حیات (spouse) کو ملے گا۔ اور نسبتاً بہت تھوڑا حصہ متوفی کی اولاد کے حصہ میں جائے گا۔

امریکہ کا یہ قانون وراثت واضح طور پر ہندوؤں، مسلمانوں اور اس طرح دوسری ایشیائی قوموں کے اپنے مذہب یا کم از کم ان کی ذاتی پسند سے ٹکراتا ہے۔ مگر یہاں بھی مہاجر لوگوں نے امریکہ سے یہ مانگ نہیں کی کہ وہ اپنے قانون وراثت میں ترمیم کرے اور اس معاملہ میں اس قانونی اصول کو رائج کرے جس کو ہندستان میں "پرسنل لا" کہا جاتا ہے، تاکہ مہاجر لوگوں کو یہ قانونی حق مل جائے کہ ان کی جائیداد ان کے اپنے مذہب یا اپنے خاندانی رواج کے مطابق تقسیم کی جاسکے۔

Oath of Allegiance

I hereby declare, on oath, that I absolutely and entirely renounce and abjure all allegiance and fidelity to any foreign prince, potentate, state or sovereignty, of whom or which I have heretofore been a subject or citizen; that I will support and defend the Constitution and Laws of the United States of America against all enemies, foreign and domestic; that I will bear true faith and allegiance to the same; that I will bear arms on behalf of the United States when required by the Law; that I will perform noncombatant service in the armed forces of the United States when required by the Law; that I will perform work of national importance under civilian direction when required by the Law; and that I take this obligation freely without any mental reservation or purpose of evasion: So help me God.

یہاں کے زمانہ تقسیم میں امریکی مسلمانوں کی ایک میننگ میں شریک ہوا۔ اس میننگ کا خاص موضوع وراثت کی تقسیم کے اسی مسئلہ پر غور کرنا تھا۔ وہاں کسی بھی شخص نے یہ تجویز پیش نہیں کی کہ امریکہ کا یہ قانون مداخلت فی الدین ہے۔ اس لئے اس پر مسلمانوں کی طرف سے سخت احتجاجی بیان شائع کیا جائے اور ملک کے تمام حصوں میں اس کے خلاف جلسے اور جلوس کے منظر ہرے کئے جائیں، تاکہ حکومت پر دباؤ پڑے اور وہ موجودہ قانون وراثت میں ترمیم پر مجبور ہو جائے۔ میں نے دیکھا کہ ہر آدمی اس قسم کے بیانوں اور خطاہروں کو خارج از بحث قرار دیتے ہوئے صرف یہ بات کر رہا ہے کہ موجودہ قانون کے ہوتے ہوئے ہم اپنے مسئلہ کو کس طرح حل کر سکتے ہیں۔ بیرونی ملکوں میں مقیم حضرات ہر جگہ ایڈجسٹمنٹ کی سیاست چلا رہے ہیں نہ کہ وہ سیاست جس کو ہندوستان کے سٹی لیڈر و باؤ کی سیاست کا نام دئے ہوئے ہیں۔ امریکہ میں مجھے معلوم ہوا کہ وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس سلسلے سے نمٹنے کے لئے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے امریکہ کے ماہرین قانون سے مل کر ان سے مشورہ طلب کیا کہ امریکی قانون سے جو کچھ بغیر وہ کس طرح اس کے دائرہ میں اپنا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔

امریکی وکیلوں نے انھیں بتایا کہ امریکہ کے قانونی نظام میں وصیت نامہ (will) کی بے حد اہمیت ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی موت سے پہلے اپنا ہاتھ وصیت نامہ تحریر کر دے تو امریکہ کے موجودہ قانون کے مطابق، اس کو کسی تبدیلی کے بغیر مکمل طور پر نافذ کیا جائے گا۔ اس لئے آپ لوگ یہ اہتمام کریں کہ ہر آدمی اپنی موت سے پہلے اپنا وصیت نامہ لکھ کر اس کی رجسٹری کرادے۔ وصیت نامہ میں وہ اپنے مذہب یا اپنے خاندانی رواج کے مطابق اپنی جائیداد کے جوارہ کی اسکیم درج کر دے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی اسکیم کو عین اس کی وصیت کے مطابق جاری کیا جائے گا۔ تمام ہندوؤں، تمام مسلمانوں اور تمام دوسرے لوگوں نے امریکی وکیلوں کے اس مشورہ کو بجا کر مان لیا۔ اس کے مطابق اب وہ امریکہ کے قانونی نظام سے موافقت کر کے اپنی جائیداد اور اپنے ترکہ کے مسئلہ کو حل کر رہے ہیں۔ امریکہ کے ہذا ہر حضرات کا جس میں معاملہ میں بھی امریکہ کے نظام یا وہاں کے قانون سے ٹکراؤ پیش آیا، اس کو انھوں نے اسی طرح ایڈجسٹمنٹ کر کے حل کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اس سے پرہیز کیا کہ ایسا کوئی مسئلہ ان کے اور امریکیوں کے درمیان ٹکراؤ کا شہ بن جائے۔

بیرونی ملکوں کے جو لوگ امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے ہیں، ان میں سے کئی لوگوں سے میں نے پوچھا کہ

آپ نے اپنے ملک کو چھوڑ کر کیوں امریکہ کو اپنا وطن بنا لیا۔ ان سب کا متفقہ جواب یہ تھا کہ یہاں ہم کو پرامن زندگی (peaceful life) حاصل ہے۔ مگر ان حضرات کا یہ بیان اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس میں یہ شامل نہ کیا جائے کہ امریکہ کی یہ پرامن زندگی انہیں وہاں کے نظام سے موافقت کرنے کی قیمت پر مل رہی ہے نہ کہ وہاں کے موجودہ نظام سے ٹکراؤ کرنے کی بنا پر۔

امریکہ کے ہاجر وہاں اقلیتی فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں امریکی نظام کی حیثیت گویا اکثریتی فریق کی ہے۔ مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ وہاں کے اقلیتی فریق نے اپنے اکثریتی مد مقابلہ کے سطر سطر ایڈجسٹ کیا۔ انہوں نے اس معاملہ کے نظری یا اصولی پہلوؤں پر کوئی بحث نہیں چھیڑی۔ بلکہ اپنے مسئلہ کے حل کے لئے وہ عملی طریقہ اختیار کر لیا جس کو ہم نے حدیث پر اسپل کا نام دیا ہے۔

اکثریتی فریق کا ایڈجسٹمنٹ

اب دوسری نوعیت کی مثال لیجئے۔ یعنی وہ مثال جب کہ اکثریتی فریق نے معاملات کے تقاضے کا احترام کرتے ہوئے اپنے اقلیتی فریق کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کی ایک واضح مثال جاپان کی موجودہ تاریخ میں پائی جاتی ہے۔

امریکہ سے جاپان کا سفر بحر الکاہل کے اوپر طے ہوتا ہے۔ یہ تقریباً دس گھنٹہ کی طویل پرواز ہے۔ چنانچہ مسافروں کی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے جہاز میں دوران سفر نظم شاد کھایا جاتا ہے۔ میں جب لاس اینجلس سے جاپان اسٹراٹنز کے ذریعہ ٹوکیو جا رہا تھا تو راستہ میں جاپان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اسکرین پر دکھایا گیا۔ ایک منظر میں میں نے دیکھا کہ امریکہ کا قومی جھنڈا جاپان کی سرزمین پر لہرا رہا ہے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے برٹش حکومت کا سرکاری جھنڈا بمبئی کے اوپر لہرا رہا ہو۔ ایسا واقعہ ہندوستان میں یقینی طور پر ناقابل برداشت سمجھا جائے گا۔ مگر جاپانی قوم پچھلے ۴۵ سال سے اس کو برداشت کر رہی ہے۔ اور اس "برداشت" نے جاپان کو زبردست فائدہ پہنچایا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۵ میں امریکی فوجیں جاپان کی سرزمین پر اتر گئیں۔ انہوں نے سیاسی اور فوجی اعتبار سے جاپان کے اوپر اپنی بالادستی قائم کر دی۔ اس کے بعد امریکی جنرل میکارتھر نے جاپان کا نیا دستور تیار کیا، اس میں یہ لکھ دیا گیا کہ جاپان کبھی بھی فوجی طاقت بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ جاپان کے تسلیمی نظام کو مکمل طور پر امریکہ کے تعلیمی نمونہ پر ڈھال دیا گیا۔ جاپان کے

جزیرہ اوکی ناوا کو امریکہ کا فوجی اڈہ بنا کر وہاں امریکہ کا قومی جھنڈا لہرایا گیا۔ وغیرہ وغیرہ

اس معاملہ میں جاپان اکثریتی فوجی کی حیثیت رکھتا تھا اور امریکہ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں اقلیتی فوجی کی تھی۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ جاپان اپنے اوپر امریکہ کی بالادستی کو قبول نہ کرے۔ وہ اس کے خلاف مذمت اور احتجاج کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دے، وہ امریکہ کے خلاف گوریلا جنگ چھیڑ دے وغیرہ۔ مگر جاپانیوں نے اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی۔ یہ معاملہ اگرچہ ان کی قومی غیرت کے سراسر خلاف تھا۔ مگر انھوں نے نظری پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے فاصلہ عمل نقطہ نظر کو اپنایا۔ انھوں نے یہ کیا کہ ایک طرز طور پر امریکہ کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کر کے ممکن دائرہ میں اپنی زندگی کی تعمیر شروع کر دی۔

۱۹۴۵ میں جب یہ قومی مصیبت پیش آئی تو جاپان کے سابق شہنشاہ ہیرو ہیتو نے ریڈیو پر ایک تاریخی تقریر کی۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۵ کی اس تقریر میں جاپان کے قومی لیڈر نے اپنی قوم کو یہ پیغام دیا کہ وہ جذباتی مظاہروں (outbursts of emotions) سے قلمی پرہیز کریں۔ وہ اپنی تمام طاقتوں کو مستقبل کی تعمیر (construction of future) کے محاذ پر لگا دیں۔ وہ اپنے آپ کو غیر ملکی نفرت (antiforeign sentiment) سے بچائیں۔ جاپان کی تعمیر نو (reconstruction) کے سوا وہ کسی اور چیز میں کوئی دل چسپی نہیں۔

جاپان کے لیڈر نے اپنی قوم کو اس قسم کی ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے یہ عزم کیا ہے کہ کئی والی نسلوں کو ایک عظیم امن مہیا کرنے کے لئے ایک ایسی چیز کو برداشت کریں جو ناقابل برداشت ہے، اور اس کو ہمیں جو سہی نہیں جاسکتی :

We have resolved to pave the way for a grand peace for all the generations to come by enduring the unendurable and suffering what is unsufferable.

Ian Nish, *The Story of Japan*, p. 192

اس اصول کو اختیار کرنا جاپان کے لئے اپنے آپ کو امریکہ کے ماتحت بنانے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں جاپان نے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اپنا مقام کھودیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۴۷ میں ہندستان کے پہلے وزیر اعظم بنے تو انھوں نے اپنی خارجہ پالیسی میں جاپان کو کوئی مقام نہیں دیا۔

اپنے پورے دور حکومت میں وہ جاپان کو نظر انداز کرتے رہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک، جاپان ایک
والستہ ملک (aligned nation) بنا ہوا تھا۔ اور نہرو کے اپنے ذہن کے مطابق کسی ملک کی عظمت
اس میں تھی کہ وہ نا وابستہ قوم (non-aligned nation) کی حیثیت رکھتا ہو۔

مگر آج ساری دنیا جانتی ہے کہ جاپان کی اسس یک طرفہ پالیسی نے جاپان کو غیر معمولی فائدہ پہنچایا۔
اس کا نتیجہ یہ ہو کر جاپان کو دسین پیمانے پر ایک وقفہ تیر مل گیا۔ اس نے اس وقفہ کو استعمال کر کے اتنی
زیادہ اقتصادی ترقی کی کہ جاپان کے اوپر امریکہ کی سیاسی اور فوجی بالادستی عملاً بے معنی ہو کر رہ گئی۔
آج جاپان خود امریکہ کی دیو سپیکر کمپنیوں کو بڑی بڑی قیمت دے کر خرید رہا ہے۔ امریکہ اور جاپان کے
درمیان ہر روز ایک درجن فلائٹ آتی ہے اور ہر روز ایک درجن فلائٹ جاتی ہے۔ جاپان نے ساری
دنیا میں نبر ایک اقتصادی طاقت کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان پر سیاسی غلبہ
حاصل کیا تھا، آج خود امریکہ زیادہ بڑے پیمانے پر جاپان کے اقتصادی غلبہ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ جاپان
ایک چھوٹا سا بھوسیلہ ملک ہے، اس کے مقابلہ میں ہندستان بہت بڑا اور باؤسید ملک ہے۔ مگر جاپان کے
مقابلہ میں آج ہندستان کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہ اقلیتی فریق کے مقابلہ میں اکثریتی فریق کے ایڈجسٹمنٹ کی مثال ہے۔ اس معاملہ میں امریکہ گویا
اقلیتی فریق کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں جاپان کی حیثیت اکثریتی فریق کی تھی۔ جاپان نے نظری
پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے غلطی پہلو کو اختیار کر لیا اور اپنے اقلیتی حریف سے موافقت کرتے ہوئے ممکن
دائرہ میں تیسرا دستہ کام کا عمل جاری کر دیا۔ یہ عملی طریقہ اتنا کارآمد تھا کہ جب اس کی تکمیل ہوئی تو جاپان
نے عالمی نقشہ پر پہلے سے کبھی زیادہ بڑی حیثیت حاصل کر لی۔

ہندستان کی مثال

ہندستان میں کبھی ظاہری فرق کے ساتھ ہی صورت حال جاری ہے۔ یہاں کا مسئلہ بنیادی طور پر
ہندو اور مسلمان کا مسئلہ ہے۔ اس معاملہ میں ہندو فریق کی حیثیت اکثریتی فریق کی ہے۔ اور مسلمان اس کے
مقابلہ میں اقلیتی فریق کی حیثیت رکھتا ہے۔

اکثریت اور اقلیت کا جھگڑا ۱۹۴۷ سال سے مسلسل جاری ہے۔ عین اسی مدت میں جب کہ
امریکہ کے ہماجر طبقہ نے اپنے اکثریتی فریق سے موافقت کر کے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی۔ اور اسی طرح

جاپان نے اپنے اقلیتی فریق کے ساتھ موافقت کر کے عالمی سطح پر اپنے لئے نمایاں مقام حاصل کر لیا، اسی مدت میں ہندستان کے دونوں فرقوں میں صرف دہنگے اور فساد جاری رہے اور آج تک جاری ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ ہندو فرقہ کوئی حقیقی ترقی کا درجہ حاصل کر سکا اور نہ مسلم فرقہ۔ دونوں کے دونوں بربادی کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔

امریکہ کے زمانہ قیام میں روزانہ وہاں کے اخبارات پڑھتا تھا۔ مگر امریکہ کے اخبارات ہندستان کی خبروں سے خالی تھے۔ اس مدت میں میں ہندستان کے حالات سے اس طرح بے خبر رہا گو یا کہ ہندستان جیسے کسی ملک کا کہہ ارض پر کوئی وجود ہی نہیں۔ ہندستان جغرافی اعتبار سے بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کے بہترین وسائل موجود ہیں۔ اس کو آزادانہ حیثیت میں تقریباً نصف صدی تک عمل کا موقع ملا۔ مگر اس کے باوجود حالات یہ ہے کہ عالمی نقشہ میں ہندستان کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ہندستان میں ان دونوں میں سے کوئی واقعہ پیش نہ آسکا، جتنی کہ کسی ملک کی زندگی کے درجہ میں بھی وہ بات نہ کہی جس کی شاندار مثال امریکہ اور جاپان میں موجود تھی۔ ہندستان کو یا ہندستان کے لیڈروں کو نہ امریکہ میں کوئی نمونہ ملا اور نہ جاپان میں۔ انہیں کرنے کا کام صرف یہ نظر آیا کہ وہ سبے فائدہ طور پر آپس میں لڑتے رہیں۔ یہاں تک کہ دنیا کی بین الاقوامی بربادی میں ایک بکھرنا ہوا گروہ بن کر رہ جائیں۔

مسئلہ کا حل

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے جس کو ہم نے مدد میں پرنسپل کہا ہے۔ یعنی دو فریقوں میں سے کسی ایک فریق کا اس پر راضی ہونا کہ وہ ایک طرف طور پر تمام جھگڑوں کو ختم کر دے گا۔

اس معاملہ میں ہمارے لئے دو قسم کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جس کی مثال امریکہ میں ملتی ہے۔ اور دوسرا وہ جس کی مثال جاپان پیش کر رہا ہے۔ امریکہ کی مثال میں ہندستان کے اقلیتی فرقہ (مسلمان) کے لئے ایک جدید نمونہ ہے۔ اور جاپان کی مثال ہندستان کے اکثریتی فرقہ (ہندو) کے لئے جدید نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندستان کے لئے لازم ہے کہ وہ ان دو میں سے کسی ایک نمونہ کو اختیار کرے۔ اگر ایسا نہیں ہو تو

اس ملک کے جھگڑے ابدی طور پر باقی رہیں گے، یہاں تک کہ ہندوستان کمزور ہوتے ہوتے دنیا کے نقشہ میں ایک ناقابل ملاحظہ ملک بن کر رہ جائے گا۔

اکثریتی فریق (ہندو) اگر حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی تمام صحیح یا غلط شکایتوں کو ایک طرف طور پر بھلا دے۔ وہ اپنی مسلم طرفداری کو چھوڑ کر حقیقی مسلمانوں میں پرو بھارت طرز فکر اختیار کرے۔ وہ مسلمانوں کے سلسلہ میں ماضی کی تمام شکایتوں کو فراموشی کے خانہ میں ڈال دے اور اپنی تمام توجہ اور اپنی تمام طاقت ملک کی ترقی کی راہ پر لگا دے۔ ہندو اگر ایسا کرے تو وہ وہی کرے گا جو جاپان نے "اکثریت" کے باوجود اپنی "اقلیت" کے مقابلہ میں کیا۔ اگر ہندو ایسا کرنے پر راضی ہو جائے تو تاریخ اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر اس کے حق میں اپنے آپ کو دہرائے گی جس کی شاندار مثال جاپان کے تجربہ میں نظر آتی ہے۔

دوسری ممکن صورت یہ ہے کہ اس "حدیث پر نسیل" کو یہاں کا اقلیتی فریق (مسلمان) اختیار کرے۔ مسلمانوں کو صحیح یا غلط اپنے اکثریتی فریق سے بہت سی شکایتیں ہیں۔ اگر مسلمان اپنے آپ کو اس تاریخی فیصلہ پر راضی کریں تو انھیں وقتی طور پر یہ کرنا ہوگا کہ وہ ہندو کے مقابلہ میں اپنی ہمدردی کو خوار وہ بظاہر جائز ہو یا نا جائز، صبر و ادراغ کے خانہ میں ڈال دیں، ہندوؤں کی طرف سے اشتعال انگیزی کی بجائے تو ایک طرف طور پر اس کو برداشت کریں۔ ہندو فساد پر آمادہ ہو جائے تب بھی وہ مقابلہ آرائی کا انداز اختیار نہ کریں۔ ہندو انھیں محرومی کا تجربہ کرائے تو اس کو بھی وہ اپنے ذہن سے نکال دیں۔ مسلمان اپنے آپ کو رد عمل کی نفسیات سے اوپر اٹھائیں، وہ مکمل طور پر اور ایک طرف طور پر مثبت نفسیات میں جینے لگیں۔

موجودہ حالات میں صبر و ادراغ کی یہ پالیسی مسلمانوں کے لئے وقف تیر حاصل کرنے کی تدبیر ہے۔ مسلمان اپنے مستقبل کی تیر کے لئے اس صورت حال کو برداشت کریں۔ وہ صبر و ادراغ کی پالیسی اختیار کر کے صرف یہ کریں کہ ممکن دائرہ میں اپنی تیر و ترقی کی ہمدردی جاری کر دیں۔ تمام ناموافق باتوں کے باوجود اس ملک میں ان کے لئے یہ موقع کھلا ہوا ہے کہ جس چیز کو دوسرے لوگ کم محنت کر کے پارہے ہیں، اس کو وہ زیادہ محنت کر کے اپنے لئے حاصل کریں۔ اور مسلمانوں کو اسی امکان کو استعمال کرنا چاہئے۔

مسلمانوں کے لئے اب بھی تعلیم، تجارت، زراعت، سماجی خدمت، وغیرہ شعبوں میں کام کرنے کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ وہ ناموافق باتوں سے اعراض کرتے ہوئے ان تعمیری میدانوں میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ یہ اگرچہ ان کے لئے ناقابل برداشت کو برداشت کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ مگر اس دنیا میں کوئی بڑی کامیابی ہمیشہ ان لوگوں کو ملتی ہے جو اس اعلیٰ حوصلہ مندی کا ثبوت دیں۔ مسلمان آریسا کریں تو یقینی طور پر یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ ۲۵ سال کے اندر اس ملک کی پوری تاریخ بدل جائے گی۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ کو میں جاپان ایئر لائنز کے جس جہاز کے ذریعہ سفر کر کے دہلی پہنچا، اس میں تقریباً تین سو مسافر تھے۔ ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جن کو ہاجر (immigrants) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک خوشی اور خوش حالی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ایک شخص نے کہا: اگر ہم انڈیا میں ہوتے تو یہاں لڑائی جھگڑوں سے فرصت نہ ملتی۔ یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ حالات نے ہم کو امریکہ پہنچا دیا۔ وہاں ہم نے اتنی ترقی حاصل کر لی۔

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، یہ امریکہ کی بات نہیں بلکہ طریق کار کی بات ہے۔ لوگ امریکہ میں جو طریق کار اختیار کئے ہوئے ہیں، مسلمان اگر اس طریق کار کو اپنائیں تو خود اسی ملک میں وہ ساری ترقیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمان اس ملک میں بھی عزت اور کامیابی کے وہ تمام مواقع پالیں گے جو اسی طریق کار کو اختیار کرنے کے نتیجے میں امریکہ کے ہاجر لوگوں نے وہاں اپنے لئے حاصل کیا ہے۔

مزید یہ کہ یہ مسلمانوں کے لئے ملک کی ایک اعلیٰ خدمت کے ہم معنی ہے۔ مسلمان اگر اس طرز عمل کو اختیار کریں تو بالواسطہ طور پر وہ اس ملک کی عمومی ترقی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ وہ ملکی ترقی کے اس دروازے کو کھول دیں گے جو باہمی جھگڑوں کے نتیجے میں پچھلے نصف صدی سے عملاً بند پڑا ہوا ہے۔

قرآن میں زندگی کا ایک اہم اصول ان لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ جو چیز لوگوں کو نفع دیتا ہے وہ زین میں قیام حاصل کرتی ہے (الرعد ۱۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفع بخشی کی صفت ایسی تسخیری صفت ہے کہ جو لوگ اپنے اندر یہ صفت پیدا کر لیں وہ لازماً مضبوط اور مستحکم زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب اگر مسلمان مذکورہ اصول پر عمل کریں تو اس کے بعد بہت جلد ایسا ہوگا کہ وہ اس ملک میں ایک نفع بخش گروہ کی حیثیت حاصل کر لیں گے۔ اور یہ قرآن کی گواہی ہے کہ جو لوگ کسی ملک میں نفع بخش

گروہ بن جائیں وہ اس ملک میں مستحکم مقام کا درجہ بھی ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔

دعوتی فائدہ

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ مسلمانوں کا اس ملک میں "حدیبیہ پرنسپل" کو اختیار کرنا ان کے لئے امرِ عیہا جریں کی طرح صرف مادی فائدہ کا سبب نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہوگی کہ یہاں مسلمانوں کے دین کے لئے فتوحات کا وہ دروازہ کھل جائے گا جو دور اول میں حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں ان کے اسلام کے لئے کھلا تھا۔

مسلمان کی تمام حیثیتوں میں سب سے بڑی حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک صاحبِ نظر یہ تو مہم ہیں۔ وہ واحد ملت ہیں جن کے پاس محفوظ دین ہے۔ انہیں اجارہ داری کے درجہ میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ دنیا کو خدا کا صحیح تصور دے سکتے ہیں۔ مسلمت کی یہ حیثیت، امکانی طور پر، اُس کو ساری دنیا کے اوپر نظری امام بنا رہی ہے۔ ان کے دین کی یہ امکانی خصوصیت اگر واقعہ بن جائے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ساری دنیا کے اوپر فکری قیادت کا درجہ حاصل کر لیں گے۔ اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ وہ ایک قائم شدہ دین کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ اور علوم انسانی کی تمام گواہیاں اس کی تصدیق کر رہی ہیں۔ اسلام کی ان خصوصیات نے اسلام کے اندر تسخیری صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ آج وہ اس طاقت کا حامل ہے کہ اپنے آپ لوگوں کے درمیان پھیلے، اپنے آپ لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جائے۔

آج صرف ایک چیز ہے جو اسلام کے تسخیری سیلاب کو پھیلنے سے روکے ہوئے ہے، یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نزاع اور جھگڑا کی موجودہ فصل ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اشتعال کی فضلے اس مستدل ماحول کو ختم کر رکھا ہے جس میں غیر مسلم حضرات مسلمانوں کے مذہب (اسلام) کو کھلے دل کے ساتھ دیکھیں اور اس کو خود اپنی نظرت کی آواز پاکر اس کی طرف دوڑ پڑیں۔

اب اشاعتِ اسلام کا دروازہ کھولنے کی ذمہ داری تمام تر مسلمانوں پر آگئی ہے۔ یہ خود مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ داعی اور مدعو کے درمیان کشمکش کا فائدہ کر کے اسلام کے لئے نئی تاریخ کا آغاز کریں۔

مسلمان اگر صبر و اعراض کا ایک طرز طریقہ اختیار کر کے باہمی نفرت کی فضا کو ختم کر دیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اسلام اپنے آپ پھیلنے لگے گا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب کہ دنیا یہ منظر دیکھے گی کہ حدیبیہ پر نرسپل کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں وہی واقعہ دوبارہ تاریخ میں پیش آ گیا ہے جو دور اول میں اس اصول کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں پیش آیا تھا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے لئے تیار ہے، بشرطیکہ مسلمان اس حوصلہ مندی کا ثبوت دے سکیں کہ وہ دوبارہ اس ناقمانہ تدبیر کو دہرانے کے لئے تیار ہیں جو ان کے پیش روؤں نے چودہ سو سال پہلے دہرایا اور بظاہر شکست کے بعد وہ چیز حاصل کر لی جس کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔

حدیبیہ پر نرسپل کو اختیار کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں، موجودہ حالات میں یہ مسلمانوں کے لئے ہم فرما وہم ثواب کے ہم معنی ہے۔ اس کے ذریعہ ایک طرف وہ اپنی دنیاوی زندگی کی تعمیر کے مواقع پائیں گے۔ وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ ملک کے وسائل کو بھر پور طور پر اپنے حق میں استعمال کر کے اپنے آپ کو خوش حال اور ترقی یافتہ بنا سکیں۔

دوسری طرف یہ تدبیر ملک میں اشاعت اسلام کے بند دروازے کو کھول دے گی۔ اس کے بعد اسلام اپنے آپ اس ملک میں پھیلنے لگے گا جس طرح موجودہ قومی جمگڑوں سے پہلے وہ مسلسل یہاں پھیل رہا تھا۔

قرآن میں "حدیبیہ پر نرسپل" کا یہ فائدہ بتایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے فتح مبین بھی ملتی ہے اور اللہ کی منفرت بھی حاصل ہوتی ہے (الفتح ۱-۲) یہ اسلامی اصول آج دوبارہ مسلمانوں کو پکار رہا ہے اور انہیں بشارت دے رہا ہے کہ اگر تم نے اس کو صحیح طور پر اختیار کر لیا تو وہ تمہاری دنیا کی کامیابی کا بھی ضامن ہے اور اسی کے ساتھ آخرت کی کامیابی کا ضامن بھی۔

باب چهارم

امت مسلمہ

امت مسلمہ کی ایک ڈیوٹی ہے جو خدا کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔ دوسری چیز اس کے وہ مسائل ہیں جو دنیا کے حالات کی نسبت سے اس کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ڈیوٹی کو پورا کرنے کی ذمہ داری امت کی ہے۔ اور مسائل کو حل کرنے کا کام خدا نے خود اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ فرائض اور مسائل کی یہ تقسیم قرآن کی اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے :

يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله يعصمك من الناس (المائدہ ۶۷)

اے رسول، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے براہ راست مخاطب ہیں اور آپ کی امت اس آیت کی بالواسطہ مخاطب ہے۔ اس آیت کے مطابق، دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اہل اسلام پر ہے، اور عصمت من الناس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر۔

اللہ تعالیٰ کی یہ مستقل سنت ہے کہ وہ حامل کتاب قوم کی خصوصاً نصرت فرماتا ہے۔ یہ نصرت اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ اس قوم کی حامل کتاب ہونے کی حیثیت باقی ہو۔ اسی سنت الہی کے تحت پہلے زمانوں میں بنی اسرائیل (یہود) کی غیر معمولی مدد کی گئی۔ یہود کے دینی بگڑنے کے باوجود ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ مختلف صورتوں میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ انھیں حامل کتاب کی حیثیت سے معزول کر دیا گیا۔ اب قیامت تک کے لئے حامل کتاب ہونے کی حیثیت امت مسلمہ کو حاصل ہے۔ اس لئے امت کے بگاڑ کے باوجود اس کی عمومی نصرت کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے، وہاں ہر آدمی اپنے کئے کے مطابق اپنی جزا پائے گا۔ مگر دنیا میں اللہ تعالیٰ اس امت کو ہر حال میں بچاتا رہے گا۔ مسلمانوں کا داخل زوال یا بیرونی مداخلت، کوئی بھی چیز اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

اس مخصوص خدائی معاملہ کا تعلق امت مسلمہ کی انصافیت سے نہیں ہے، بلکہ دین کی حفاظت سے ہے۔ چونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے، اس لئے اب اس دین کو آخر وقت تک محفوظ رہنا ہے۔ اور جب دین کو محفوظ

رہنا ہے تو اس امت کو بھی لازماً محفوظ رہنا ہے جو مددہ اسباب کی دنیا میں اس دین کی حامل بنائی گئی ہے۔ جس طرح مکتوب قرآن کے لئے کاغذ کی ضرورت ہے، اسی طرح محفوظ دین کے لئے ایک امت درکار ہوتی ہے جو اس کو اٹھانے اور نسل در نسل اس کو لوگوں تک منتقل کرتی رہے۔ موجودہ زمانہ میں امت مسلمہ کے لئے یہ نصرت بہت بڑے پیمانہ پر ظاہر ہو چکی ہے۔

نصرت کا ظہور

انیسویں صدی ختم ہوئی تو مسلم دنیا اپنے زوال کے آخری نقطہ پر پہنچ چکی تھی۔ مگر بیسویں صدی آئی تو مسلمانوں کی اپنی کسی کوشش کے بغیر براہ راست خدائی مداخلت کے تحت دنیا کے حالات وسیع پیمانے پر بدلا شروع ہو گئے۔

اس تبدیلی کا پہلا مظاہرہ سیاسی اعتبار سے ہوا۔ موجودہ زمانہ کا ایک مسئلہ وہ تھا جس کو نوآبادیات (Colonialism) کہا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ ابتداً پندرہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ اسپین، پرتگال، ڈچ، فرانسیسی اور برطانوی قوموں نے بڑی بڑی نوآبادیاتی سلطنتیں بنائیں۔ ایشیا اور افریقہ کے تمام مسلم ممالک براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان کے قبضہ میں چلے گئے۔

مگر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ نوآبادیاتی طاقتیں مختلف اسباب سے زوال کا شکار ہو گئیں۔ پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴ء) میں جزئی طور پر اور دوسری عالمی جنگ (۳۵-۱۹۳۹ء) میں کلی طور پر ان کی طاقت ٹوٹ گئی۔ وہ اس قابل نہ رہیں کہ ایشیا اور افریقہ میں اپنے زیر قبضہ ملکوں پر اپنا سیاسی اقتدار باقی رکھیں چنانچہ ایک کے بعد ایک ملک آزاد ہوتے چلے گئے۔ بیسویں صدی کے عمل کے دوران بیشتر نوآبادی علاقے سیاسی آزادی حاصل کر چکے ہیں:

In the course of the 20th century, most colonial areas have gained formal political independence. (III/17)

اب دنیا بھر میں پچاس سے زیادہ مسلم ملک ہیں جو سیاسی اعتبار سے آزاد ملک کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ امکانی طور پر وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ آزادانہ طور پر جو فیصلہ لینا چاہیں لے سکیں۔ سیاسی محکوم کا مسئلہ اب ان کے لئے باقی نہیں رہا۔

۲- دوسرا مسئلہ اقتصادی اعتبار سے تھا۔ موجودہ زمانہ میں اقتصادی قوت زیادہ تر انڈسٹری کے

ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ مسلمان مختلف اسباب کے تحت انڈسٹری میں داخل نہ ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جدید دنیا میں ایک مظلوم قوم بن کر رہ گئے۔

یہاں بھی خدا کی مداخلت نے مسلمانوں کے مسئلہ کو حل کر دیا۔ میری مراد اس واقعہ سے ہے جس کو ارضیات کے ماہرین جغرافیائی اتفاق (Accident of geography) کہتے ہیں۔ یعنی دنیا کے پٹرول کے ذخیرہ کا تقریباً نصف حصہ مسلم ملکوں (شرق اوسط) کی زمین کے نیچے ہونا۔ ایک طرف صنعتی دور میں پٹرول کی بے حد اہمیت پیدا ہوئی۔ دوسری طرف پٹرول کا بہت بڑا ذخیرہ مسلم ملکوں کی زمین کے نیچے رکھ دیا گیا۔ بیسویں صدی کے نصف تک مسلم دنیا اقتصادی اعتبار سے بالکل بے حیثیت بنی ہوئی تھی، اسی صدی کا نصف ثانی شروع ہوا تو مسلم دنیا کے پاس اتنی دولت آپہنچی تھی جو اسراف کی حد تک ان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی ہو۔

اس واقعہ نے آج مسلم دنیا کو عالمی اقتصادی سرگرمیوں کے نقشہ میں نہایت اہم مقام دے دیا ہے۔ امریکی میگزین نیوزویک (۱۸ فروری ۱۹۷۳) نے اپنے خصوصی مضمون میں لکھا تھا کہ ساتویں صدی عیسوی میں جب کہ اسلامی فوجیں عرب جزیرہ نما پر چھا گئیں تاکہ وہ محمد کے پیغام کو پھیلاویں۔ اس کے بعد عربوں نے اپنی تاریخ میں پہلی بار اس قسم کی کامیابی حاصل کی ہے۔ کسی زمانہ میں اگر تمام مشرکین روم کو جاتی تھیں تو آج تمام مشرکین ریاض کو جا رہے ہیں۔ جہاں ہر روز مغربی قوموں کے نمائندے آ رہے ہیں تاکہ وہ جدید دنیا کے قارون (سعودی گنگ) سے ملاقات کر سکیں۔ پہاڑ آخر کار محمد کی طرف آ رہا ہے؛

The mountain, at last, is coming to Muhammad.

۳۔ تیسری اہم ترین چیز دعوتی مواقع کا کھلنا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی کوشش کے بغیر اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنی مداخلت کے وقت دعوت کے زبردست نئے مواقع کھول دیئے ہیں — جدید اصطلاحی فرائض، آزادی کے انقلاب کے ذریعہ بے روک ٹوک مذہبی تبلیغ کی اجازت۔ سائنسی دریافتوں کے نتیجے میں اسلام کی باتوں کی علمی تصدیق۔ مذاہب کے تنقیدی مطالعہ کے ذریعہ اسلام کے سواد و سر سے تمام مذاہب کا غیر متارکینی ثابت ہونا۔ مادی تہذیب کی ناکامی کی بنسٹ پر لوگوں کا از سر نو دین خدا کی طرف رجوع۔ وغیرہ تاہم ان تمام جدید مواقع کے باوجود ایک شدید رکاوٹ ابھی تک باقی تھی۔ وہ ہے مارکس اشتراکیت کے جبری نظام کی بنا پر دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اسلام کے لئے اشاعت و عمل کے مواقع کا سدود ہو جانا۔ یہ

ایک ایسا معاملہ تھا جس میں مسلمان نکل طور پر بے بس ثابت ہو رہے تھے۔ مگر یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی ظاہر ہوئی جو حدیث کی کت ابوں میں اس طرح نقل کی گئی ہے :

عن ابی بکرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
انہ قال : ان اللہ تبارک وتعالیٰ سیؤتد نے فرمایا کہ اللہ اس دین کی مدد ایسے لوگوں سے
فذلالدین باقوام لانحلاق لہم (سند احمد) کرے گا جن کا دین میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

سوویت روس کے حکمران میخائیل گورباچیف کا ہنر غالباً ہی خبر رسالت کی تصدیق ہے۔ گورباچیف نے تمام قیاسات کے خلاف اشتراکی سلطنت میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں کہ اشتراکی دنیا تاش کے پتوں کی طرح بکھرنے لگی۔ ٹائم میگزین (۱۲ مارچ ۱۹۹۰ء) کے الفاظ میں سوویت۔ یونین سوویت ڈس یونین (Soviet Disunion) کی عملی تصویر بن گیا۔

ٹائم کے مذکورہ شمارہ میں ایک با تصویر رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سوویت روس کے تقریباً ۵۵ ملین مسلمان وہاں آنے والی نئی مذہبی رواداری کا پھل پارہے ہیں :

Some 55 million Soviet Muslims enjoy the fruits of the new religious tolerance (p. 26).

رپورٹ میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ اشتراکی دنیا میں نئے انقلاب کے بعد کس طرح مارکس کے خلاف مذہب نظریات غیر معتبر ثابت ہو گئے ہیں۔ اور خود سوویت یونین میں اسلام کی اشاعت کے نئے مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ اس رپورٹ کا عنوان بامعنی طور پر، ٹائم نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے — کارل مارکس محمد کے لئے جگہ خالی کرتا ہے :

Karl Marx makes room for Muhammad

روس جیسے مخالف مذہب ملک میں یہ جو وافق مذہب انقلاب آیا ہے، اس نے حیرت انگیز طور پر اسلام اور مسلمانوں کے لئے نئے دروازے کھول دئے ہیں۔ اس تبدیلی کی بہت سی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ روس کی ہوائی کمپنی ایر و فلائٹ اس پر راضی ہوئی کہ وہ اپنے ۳۰ مال بردار جہازوں کے ذریعہ قرآن کے دس لاکھ نئے سعودی عرب سے روس کے شہروں میں پہنچائے گی۔ اس سلسلہ میں ایر و فلائٹ کا پہلا جہاز ۱۶ اپریل ۱۹۹۰ء کو جدهائیر پورٹ پر اترا۔ یہ دس لاکھ نئے سعودی حکومت نے روسی مسلمانوں کو بطور

تحفظ دئے ہیں۔ یہ ایک انتہائی نئی صورت حال ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے روسی علاقہ میں قرآن کا داخلہ مطلق طور پر ممنوع تھا۔

یہ انقلابات جو پیش آئے، ان کا ایک پہلو یقیناً یہ تھا کہ اس سے امت مسلمہ کو تقویت حاصل ہو۔ وہ دوسری قوموں کی دستبرد سے محفوظ رہ کر ایک مستحکم اور خود کفیل قوم کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائے، وہ دنیا میں اپنے سیاسی، اقتصادی اور نسلی وجود کو قائم رکھ سکے۔

مگر یہ استحکام برائے استحکام نہ تھا۔ وہ خود ایک اعلیٰ مقصد کے لئے تھا۔ امت مسلمہ کے لئے قیام و استحکام کا یہ خدائی انتظام اس لئے تھا کہ وہ عزم اور یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اس مقصد کی راہ میں لگائے جو خدا کی طرف سے اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی دعوت و شہادت۔ یہ گویا واللہ یصلح من انشائے وعدہ الہی کی تکمیل تھی۔ تاکہ پیغمبرؐ کی امت بے لطمہ و آہن نازل الیک من ربک کی ذمہ داری کو بخوبی طور پر ادا کرے۔

ذمہ داری کی ادائیگی میں ناکامی

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کی اعلیٰ ترین صورت میں مدد کی ہے۔ مگر یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے "نفی نفعی" کا معاملہ ہے۔ جس طرح بارشس برسانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، مگر اس بارشس کو استعمال کر کے نفع اگانا ناک ان کی ذمہ داری ہے۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کے ضروری مواقع انفرادی کے ساتھ نازل کئے جاتے ہیں۔ مگر ان مواقع کو استعمال کر کے دین کا احیاء کرنا پھر بھی اہل اسلام کی ذمہ داری ہے۔ اگر اہل اسلام اپنی ذمہ داری کو ادا نہ کریں تو مواقع کی فراوانی کے باوجود دین کے لئے ان کا مفید ہونا ممکن نہ ہو سکے گا۔

بد قسمتی سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی طرف سے یہی صورت پیش آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا "پچاس فیصد" حصہ مزید اضافہ کے ساتھ ادا کر دیا۔ مگر مسلمان اپنا "پچاس فی صد" حصہ ادا کرنے میں سراسر ناکام رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فراوانی کی حد تک مواقع کے حصول کے باوجود اسلام کی نئی تاریخ بنانے کا کام ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔

۱۔ موجودہ صدی میں مسلمانوں کو جو سیاسی اقتدار ملا، اس کو انھوں نے صرف باہمی جنگ کو تیز تر کرنے میں استعمال کیا ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی طبقہ اب تک زیادہ تر یہ کرتا رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح

دوسرے طبقوں کو محروم کر کے خود پورے سیاسی اقتدار پر قابض ہو جائے۔ اقتدار کی اس باہمی جنگ میں مسلمانوں کی بہترین صلاحیتیں اس طرح ختم کر دی گئیں جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

اس معاملہ میں اسلام پسند طبقہ نے جو کردار ادا کیا ہے، وہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس طبقہ نے یہ کیے کہ مسلم ملکوں میں آزادی کا تہہ ہی وہ حکمران گروہ کے خلاف اپوزیشن پارٹی کا کردار ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ "اسلامی قانون نافذ کرو" کے نام پر اس نے اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے سیاسی جنگ چھیڑی۔ اس طرح اسلام اور حکمران غیر ضروری طور پر ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔

اسلام پسند طبقہ اگر اس کے برعکس یہ کرتا کہ وہ تدریجی اور رجوعی انداز اختیار کرتا، اور سیاسی حکمرانوں سے پوری طرح اپنے آپ کو بچاتا تو مسلم حکمرانوں کی طرف سے اس کو زبردست تعاون ملتا۔ جیسا کہ مصر میں جمال عبدالناصر نے اپنے زمانہ حکومت (۱۹۵۲-۶۰) میں لائونگ سلون کو مصر کی وزارت تعلیم کی پیش کش کی۔ پاکستان میں محمد ایوب خاں نے اپنے زمانہ حکومت (۱۹۵۸-۶۹) میں جماعت اسلامی کو یہ پیش کش کی کہ اعلیٰ سطح کی ایک اسلامی یونیورسٹی بنا کر ان کے حوالے کر دی جائے اور وہ اس کے ذریعہ پاکستان کی نئی نسلوں کو اسلامی فہم پر تیار کریں۔ مگر مصر اور پاکستان دونوں جگہوں کے اسلام پسندوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس طرح مسلم ملکوں کی سیاسی آزادی سیکورائیزڈوں اور اسی کے ساتھ اسلامی لیڈروں کی باہمی سیاسی آویزش کی نذر ہو گئی۔ ان مواقع کا کوئی فائدہ اب تک اسلام کو حاصل نہ ہو سکا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔ اس معاملہ میں اسلام پسند رہنما دراصل اپنی اس غلطی کا شکار ہوئے جو انہوں نے دین کی سیاسی تعبیر کی صورت میں کی تھی۔ اس طبقہ کے مفکرین نے اسلام کی تصویر اس طرح بنائی کہ وہ دنیا میں تعمیر نظام کے ہم معنی بن گیا۔ جس طرح ڈیکوریشن یا سوشلزم تعمیر نظام کے ہم معنی ہے۔ اس بنا پر ان کا نشانہ عملی طور پر سیاست و حکومت بن گیا۔ ان کو کرنے کا اصل کام یہ نظر آتا کہ وہ موجودہ سیاسی نظام کو توڑیں تاکہ اس کی جگہ دوسرا سیاسی نظام قائم کر سکیں۔ اپنی اس تعبیر دین کی بنا پر وہ فوراً اپنی حکومتوں سے ٹکرا گئے۔

اس کے برعکس اگر انہوں نے دین کی تفسیر آخرت میں حصول نباتات کی صورت میں کی ہوتی تو ان کا نشانہ دعوت ہوتا۔ وہ سب سے بڑا کام اس کو سمجھتے کہ اہل عالم کو آخرت کی حقیقت سے باخبر کر دیں۔ وہ انداز آخرت کو اپنا نشانہ بنا تے نہ کہ قیام حکومت کو۔

۲۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ وقت آنے والا ہے کہ فرات سونے کا خزانہ ظاہر کرے۔ پس جو شخص اس وقت موجود ہو وہ اس میں سے کچھ لے لے (عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یوشق الضرات ان یحس عن کس من ذہب فمن حضر فلا یأخذ منه شیئا، متفق علیہ)

اس حدیث میں دریائے فرات کی تمیش غالباً پٹرول کی تعبیر ہے جس کو گچھلا ہوا سونا (Liquid gold) کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پٹرول کا سیال خزانہ جب مسلم دنیا میں ظاہر ہو تو اس کو شخصی عیش یا ذاتی مقاصد میں لگانا درست نہیں۔ اس کا اصل استعمال یہ ہے کہ اس کو دعوت الی اللہ اور ملت کے احیاء جیسے کاموں میں خرچ کیا جائے۔

مگر اب تک کے واقعات بتاتے ہیں کہ اس خزانہ کا بہت ہی کم حصہ حقیقی دینی مقصد میں استعمال ہو سکا ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ ذاتی حوصلوں کی تسکین میں خرچ ہو رہا ہے، اور دوسرا بڑا حصہ بے فائدہ جنگوں میں ضائع ہو رہا ہے۔ مثلاً عراق۔ ایران جنگ جو آٹھ سال (۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء تا ۲۰ اگست ۱۹۸۸ء) مسلسل جاری رہی۔ اس جنگ میں دونوں ملکوں کا ایک ہزار بلین (1,000 billion) ڈالر سے زیادہ بر باد ہوا۔ یہ وہ نقصان ہے جو براہ راست ہوا۔ بالواسطہ نقصان کی مقدار بھی کسی طرح اس سے کم نہیں۔

پٹرول کے خدائی خزانہ کا سب سے بڑا استعمال یہ تھا کہ اس کو دعوت الی اللہ کے مقاصد میں خرچ کیا جائے اور اسلام کے پیغام کو ہر جہاد اور ہر مکان تک پہنچا دیا جائے۔ گزشتہ ہی وہ کام ہے جو اب تک انجام نہ پاسکا۔ ہمارے رہنما مختلف ناموں سے اپنی اپنی عمارتیں کھڑی کرنے میں مصروف ہیں یا جلسوں اور کانفرنسوں کے ہنگامے جاری کرنے میں۔ دعوت الی اللہ کے کام کو وہ اس طرح چھوڑے ہوئے ہیں جیسے کہ وہ اس کو جانتے ہی نہیں۔ یہ صیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے لوگ اپنے آباء دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے ہیں مگر ایسا انھوں نے خود اپنی فطرت کی آواز کی بت پر کیا ہے کہ ہمارے دینی رہنماؤں کی تبلیغ و دعوت کے نتیجہ میں۔

۳۔ موجودہ زمانہ میں جو دعوتی امکانات پیدا ہوئے ہیں، وہ ابھی تک غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دعوت کا یہ کام غیر مسلم قوموں میں انجام دینا ہے، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں مختلف اسباب سے ان قوموں کے خلاف آتی زیادہ شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ ان کے اندر

دعوتی کام کی رغبت پیدا نہیں ہوتی۔ دعوت کے کام کے لئے نصیح خیر خواہی، کاجذبہ درکار ہے۔ مگر جو وہ زمانہ میں یہ جذبہ مسلمانوں کے اندر موجود نہیں۔ غیر مسلم قومیں ان کے لئے نفرت کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ پھر وہ ان پر دعوت کا کام کس طرح کر سکتے ہیں، جو سراسر شفقت اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت انجام دیا جانے والا کام ہے۔

یہ دنیا مقابلہ اور سلالت کی دنیا ہے۔ مزید یہ کہ انسان کے اندر حرص اور ظلم اور اقتدار پسندی جیسی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اس بنا پر اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف شکایت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے دائمی پر لازم ٹھہرایا گیا ہے کہ دعوتی تامل شکایت باتوں پر وہ ایک طرف طور پر مہر کرے۔ اگر دائمی ایسا نہ کرے تو وہ کبھی اپنے مدعو گروہ پر دعوت کا کام انجام نہیں دے سکتا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وجعلنا منہم اثمة یجدون باصرفنا صبرا (۲۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ہدایت بننے کے لئے صبر کی شرط کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ صبر کی لازمی شرط کو پورا نہ کریں، وہ امام ہدایت بننے کی توفیق پانے سے بھی محروم رہیں گے۔ یہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ میں اس وقت جب کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اقتدار دیا۔ اس نے ان کے لئے اقتصادی ذرائع فراہم کئے۔ اس نے دعوت کے نئے امکانات کھول کر دعوت کے عمل کو آخری حد تک آسان بنا دیا، میں اس وقت مسلمان اپنی مدعو قوموں کی بعض زیادتیوں سے رد عمل کا شکار ہو کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے۔ دعوت کا عمل انتہائی خیر خواہی کا عمل ہے، اور جب دائمی اپنے مدعو کے لئے خیر خواہی کھودے تو اس کے بعد وہ اس کے اوپر دعوت کا عمل انجام نہیں دے سکتا۔ یہی حادثہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر پیش آیا ہے۔

مدعو سے نفرت کرنا ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر اپنے مریض سے نفرت کرنے لگے۔ یا تاجر اپنے گاہکوں سے بیزار ہو جائے۔ لہذا ڈاکٹر اور ایسا تاجر کبھی اپنے کام کو اس طرح انجام نہیں دے سکتا جیسا کہ اسے انجام دینا چاہئے۔ اسی طرح جو دائمی اپنے مدعو کے بارہ میں نفرت اور بیزارگی میں مبتلا ہو جائے وہ کبھی مدعو کے اوپر اپنی دامیانہ ذمہ داری کو ادا نہیں کر سکتا۔

اسی لئے دائمی کو اپنے مدعو کی ذمہ داری پر صبر کا حکم دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر، شکایتوں اور زیادتیوں

کے باوجود دائی کو اپنے مدعو کا نام صح اور خیر خواہ بنے رہنا ہے۔ تاکہ وہ دعوت کی ذمہ داریوں کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔

کرنے کا کام

۱۔ آج کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں، خاص طور پر مسلم نوجوانوں کے اندر دعوتی شعور پیدا کیا جائے۔ مسلم دنیا میں موجودہ زمانہ میں دعوت کا لفظ اس طرح استعمال کیا جا رہا ہے جیسے کہ وہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا نعرہ ہی عنوان ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ دعوت سے مراد یہ ہے کہ اسلام کا مثبت پیغام دوسری قوموں تک پہنچایا جائے۔ یہی امت محمدی ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی اصل ذمہ داری ہے۔ دعوت کی بنیاد پر جب تک مسلمانوں کے اندر ذہنی انقلاب نہ لایا جائے کوئی حقیقی دعوتی کام نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان لکھنے والوں نے ہرزبان میں بے شمار کتابیں چھاپی ہیں۔ مگر اسلام کا جدید کتب خانہ اسلام پر سائنٹفک بشریح سے تقریباً خالی ہے۔ موجودہ پریس کے دور میں دعوتی کام کرنے کے وقت کے معیار کے مطابق اسلامی لٹریچر انتہائی ضروری ہے۔ یہ لٹریچر اپنے مضمون اور اپنی زبان و دلائل اعتبار سے انتہائی طاقت ور ہونا چاہئے، ورنہ وہ دعوتی کام میں زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔

۳۔ قرآن اور منتخب احادیث کے ترجمے ہرزبان میں تیار کر کے شائع کئے جائیں۔ اسی طرح سیرت پر سادہ اور تاریخی انداز میں کتاب تیار کر کے ہرزبان میں چھاپنی جائے۔ یہ کام اعلیٰ علمی معیار پر ہونا چاہئے۔ اعلیٰ معیار سے کم تر معیار کی کوئی چیز موجودہ زمانہ میں فکری تاثیر پیدا کرنے والی نہیں بن سکتی۔

۴۔ آج کل ہر مسلم ملک میں اسلام پسند طبقہ ایک سیاسی جمہوری کئے ہوئے ہے۔ یہ اپنے ملک کے حکمران افراد سے خفیہ یا علانیہ انداز میں شکر ادا ہے۔ اس منکر اذکر اسلامی قانون کے نفاذ کے نام پر جاری کیا گیا ہے۔ مگر یہ ہم نپہاد اسلامی سیاست دعوت کا عمل جاری کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سیاسی بدعت کو کھل طور پر ختم کر دیا جانا چاہئے۔ ورنہ مسلم ممالک کے قیمتی وسائل ضائع ہوتے رہیں گے۔ وہ دعوت کے کام میں استعمال نہیں ہو سکتے۔

۵۔ دوسری چیز جس کو فوراً ختم ہونا چاہئے وہ غیر مسلم اقوام کے خلاف احتجاج اور مطالبات کی سیاست ہے۔ یہ سیاست بھی ساری دنیا میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ غیر مسلم اقوام مسلمانوں کے لئے مدعو کے دھبہ ہیں۔ اسی مسائل کے عنوان پر ان کے خلاف ایسی ہم چیلانا جس سے دونوں گروہوں

میں نزاع کا ماحول پیدا ہوتا ہو، سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ اس سے دعوت کی فضا ختم ہوتی ہے، اور دعوت کی فضا اتنی اہم چیز ہے کہ اس کو ہر قیمت پر باقی رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ خواہ اس کو تالم کرنے کی خاطر مسلمانوں کو ایک طرف طور پر نقصان اٹھانا پڑے۔

۶۔ دعوتی کام کے لئے کوئی لگا بندھا پروگرام بنانے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کے اندر دعوتی کام کی تڑپ پیدا کر دیجئے، اس کے بعد لوگ خود ہی اپنے حالات کے مطابق اپنا دعوتی پروگرام بنالیں گے۔

آخری بات

اوپر جو کچھ کہا گیا، اس سے چند باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔ یہ کہ امت مسلمہ کا اصل مشن لوگوں تک آخرت کے پیغام کو پہنچانا ہے۔ جہاں تک اس کے دنیوی مسائل کا تعلق ہے، ان کو براہ راست توجہ کا مرکز بنانا درست نہیں۔ ان کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم نے اصل مشن کو انجام دیا تو ایسے حالات پیدا کئے جائیں گے کہ تمہارے مسائل براہ راست کوشش کے بغیر حل ہوتے چلے جائیں۔ دوسری بات یہ کہ موجودہ زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے دعوت کے عمل کو بہت زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ تاہم ان دعوتی امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے انہوں کی ضرورت ہے۔ سارے امکانات کے باوجود یہ ضرورت باقی رہتی ہے کہ کچھ اہل افراد اٹھیں اور ضروری جدوجہد کر کے ان امکانات کو واقعہ بنا دیں۔

اسلام کے پاس نظریہ ہے، مگر اسلام کے پاس آج مردان کار نہیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں اسلام کا اصل مسئلہ ہے۔ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک سبب ہے۔ مگر یہ تقلیدی انسانوں کی بھیڑ ہے، وہ ہاشعور انسانوں کا گروہ نہیں۔ آج سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو شعوری معنوں میں مسلمان بنایا جائے۔ ان کا ایمان ان کے لئے فکری انقلاب کے ہم معنی بن جائے۔ جس دن ایسا ہوگا اس دن اسلام کی وہ نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی جس کا آج زمیں و آسمان کو سب سے زیادہ انتظار ہے۔

دعوتِ حق

۱۹۱۱ میں انہی کی فوجیں سمندر پار کر کے طرابلس (لیبیا) میں داخل ہو گئیں۔ یہاں ان کا قبضہ ۱۹۴۳ تک باقی رہا۔ یہ خیریب عالم اسلام میں پھیلی تو لوگوں نے جذباتی تقریریں کیں۔ مشاعروں نے اشعار کہے۔ ایسہوں نے پرشور مضامین لکھے۔ وغیرہ

مولانا حمید الدین فراہی (۱۹۳۰ - ۱۸۶۳) ہندوستان کے ایک خاموش عالم دین تھے۔ مگر طرابلس میں اطلاعی فوجوں کے داخلہ کی خبر سن کر وہ بھی بے چین ہو گئے اور انہوں نے ایک عربی نظم کی صورت میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

کیف العتزار وفتدنکس اعلامنا بطرابلس
(کیسے خود چین آئے، جب کہ ہمارے جھنڈے طرابلس میں جھک گئے)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان کس چیز کے لئے تڑپے۔ وہ اس لئے تڑپے کہ موجودہ زمانہ میں ان کا سیاسی جھنڈا گر گیا۔ ان کی قومی عظمت کا مینار ڈھ گیا۔ دنیوی اعتبار سے انہوں نے اپنے لئے سر بلندی کا مقام کھو دیا۔

یہ نفسیات سراسر خلاف قرآن اور خلاف سنت ہے۔ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر یہ دی گئی ہے کہ آپ کو سب سے زیادہ لوگوں کی ہدایت کا غم تھا، حتیٰ کہ اس غم میں آپ اپنے کو ہلاک کئے دے رہے تھے (اعلک باخع نفسک آلا یکنوا مو منین . اشعرا ۳) مولانا حمید الدین فراہی قرآن کے مفسر تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں اپنی اس غیر قرآنی نفسیات کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی بے شمار تفسیریں لکھی گئیں مگر اس کی کوئی دعوتی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ قرآن سراسر کتاب دعوت ہے۔ مگر یہی بات قرآن کے تمام مفسروں نے حذف کر رکھی ہے:

ہماں ورق کہ ریہ گشتہ مدعا لیں ہماست

سورۃ اشعرا کی مذکورہ آیت (اعلک باخع نفسک آلا یکنوا مو منین) کی بابت عام مفسرین یہ کہتے ہیں کہ یہ تسلی کی آیت ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین ایمان نہیں

لا رہے تھے تو آپ کو خنسم ہوا کہ میں یہ میری کوتاہی نہ ہو۔ اس لئے آپ کو تسلی دی گئی کہ آپ کو زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ محمد علی الصابونی نے صفحہ القاسم میں مفسرین کی رائے کا خواص صال لفظوں میں نقل کیا ہے:

فيه تسلية للرسول عليه السلام حتى لا يعجزن ولا يتأثر على عدم إيمانهم
سيد قطب نے لکھا ہے کہ: ذالك انى تسلية الرسول صلى الله عليه وسلم وتعزيتة عن تكذيب
المشركين له والعسوان

حالانکہ اس آیت میں دراصل دائمی حق کی تصویر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دائمی اپنے غماہین کی ہدایت اور نجات کے لئے کتنا زیادہ بے چین ہوتا ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی تڑپ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس غم میں وہ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے گا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل کوتاہی کیا ہے۔ وہ کوتاہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ہاتھوں اپنا قومی جھنڈا اگرائے جانے پر تڑپے، مگر وہ لوگوں کے جہنم میں گرنے پر بے چین نہ ہو سکے۔ یہی پھر جس قوم نے مسل کیا، وہ مسلمانوں کے نزدیک ایک "کافر" قوم تھی۔ اپنی ضلالت کے نتیجہ میں وہ جہنم میں جانے والی تھی۔ مگر یہ دائم مسلمانوں کو بے چین نہ کر سکا کہ وہ انھیں اور ان کو آگ کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے پر چڑانے کی کوشش کریں۔ مسلمان صرف اس وقت بے چین ہونے جب کہ یہ گمراہ قوم خود ان کے قومی اور سیاسی وجود کے لئے خطرہ بن گئی۔

پیغمبر اسلام کا نونہ

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ رسالت کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا تھا: قم فانذر
راٹھ اور لوگوں کو ڈرا دے) انذار کا لفظ بتاتا ہے کہ آپ کی دعوت کا فاصلہ نٹانڈا کیا تھا۔ آپ کی دعوت کا
خاص نشانہ یہ تھا کہ لوگوں کو زندگی کی اس حقیقت سے باخبر کیا جانے کہ موت کے بعد انھیں اللہ کے
سامنے حساب کتاب کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ اور اس کے بعد یا ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔

کہ میں جب دعوت عام کا حکم ہوا تو آپ نے لوگوں کو ہلاک و صفا پہنچا دیا۔ جب لوگ
اکٹھا ہو گئے تو آپ نے ان کے سامنے ایک مختصر تقریر کی۔ اس تقریر کا خواص صیہ تھا کہ اے لوگو، میں تم
کو ایک آنے والے سنت عذاب سے ڈراتا ہوں (فانی منذیر دمک بین یدی عذاب شدید)

لوگ زندگی کے اندیشوں میں ہی رہے تھے۔ آپ نے انہیں یہ پیغام دیا کہ تمہارے لئے زیادہ ضروری یہ ہے کہ تم موت کے اندیشہ میں جیو۔ تم دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں آپ کی حیثیت سردار اور حکم (آمر اور مطاع) کی تھی۔ مگر وہاں بھی آپ نے یہی بات کہی۔ ابن ہشام نے ہجرت کے واقعات کے تحت ایک عنوان ان لفظوں میں قائم کیا ہے: اول خطبۃ خطبہ چار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ مدینہ کے اس پہلے خطاب میں بھی آپ نے شروع سے آخر تک صرف آخرت کی بات کہی۔ اس خطاب کا متن جو ابن ہشام نے روایت کیا ہے اس کو مکمل طور پر اصل کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ میں آپ نے لوگوں کے سامنے جس حقیقت کا اعلان کیا، وہ بھی یہی آخرت کا مسئلہ تھا۔ اس کا خلاصہ آپ کے ان الفاظ میں ہے کہ — اے لوگو! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے آخری عمومی خطبہ وہ ہے جس کو خطبہ حجة الوداع کہا جاتا ہے۔ اس وقت پر اعراب اسلام کے امتحان آچکا تھا۔ مگر اس وقت بھی آپ نے اپنے خطاب کا جو انداز اختیار فرمایا، وہ تمام تر آخرت والا انداز تھا۔ خطبہ کے آخر میں آپ نے لوگوں کے سامنے یہ الفاظ دہرائے: اذہل بخلتہ (کیا میں نے پہنچا دیا) اس وقت آپ نے یہ نہیں کہا کہ — هل اقتت المسکومة، هل نفذت الشریعة۔ یہ واقعہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام کی دعوت میں اول سے آخر تک ساری اہمیت مسئلہ آخرت کی ہے۔ بقیہ تمام چیزیں ذیلی یا اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔

سنگین مسئلہ

ایک اندھا آدمی چل رہا ہے۔ وہ پلٹے پلٹے ایک کنویں کے کنارے پہنچ گیا۔ اس کا اندیشہ ہے کہ اگر وہ بڑھتا رہے تو اگلے ٹوہ کنویں کے اندر گر جائے گا۔ اس وقت اس خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ علم بلافت ہوتا ہے کہ اس وقت صرف کنوئیں کنوئیں (البئر البئر) کہا جائے گا۔ یہ نابینا اگر سنگے پاؤں ہو تو اس وقت اس کی خیر خواہی یہ نہ ہوگی کہ کوئی شخص اس کے لئے نیا جوتا خریدنے کے لئے بازار کی طرف دوڑے۔ یا اگر اس کے جسم کے کپڑے پھٹے ہوں تو کپڑے لے کر درزی کے یہاں جائے اور ایک جوڑا کپڑا تیار کرنے کا آرڈر دے۔ وہ نابینا اگر بھوکا پیاسا ہو تو اس وقت اس کے کھانے پینے کا انتظام بھی نہیں کیا جائے گا۔ حق کرایا بھی نہیں کیا جائے گا کہ آخرت اور شرفیت کا مظاہرہ

کرتے ہوئے اس سے یوں ہم کلام ہوا جانے، اسے جناب نایبنا صاحب، آپ سے مؤدبانه گزارش ہے کہ آپ جس راستے پر چارہے ہیں، اس راستے پر آپ تشریف لے جائیں، کیونکہ اس میں آپ کے آگے ایک گہرا کنواں ہے۔

اس نایبنا کے معاملہ میں ہر آنکھ والا آدمی بلاغت کے مذکورہ اصول کو برتے گا۔ وہ صرف کنواں کنواں پیکار سے گا۔ اس کے سوا ہر بات کو وہ نظر انداز کر دے گا۔ کوئی آدمی ہرگز اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ مگر ایک اور شدید تر معاملہ میں ہر آدمی اس اصول کی خلاف ورزی کر رہا ہے، اور وہ دعوت حق کا معاملہ ہے۔

موجودہ دنیا میں جو بھی آیا ہے، اس کو لازماً مرنا ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کو موت سے بچا نہیں سکتا۔ مزید یہ کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بچے بھی مرتے ہیں اور جوان بھی اور بوڑھے بھی۔ اسی طرح کوئی بیمار ہو کر مرتا ہے کوئی اچانک تندرستی کی حالت میں مر جاتا ہے۔ موت کا وقت مکمل طور پر لاعلم ہے۔ ہر آدمی کے لئے ہر وقت اندیشہ ہے کہ اس کی موت آجائے اور موجودہ دنیا سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی ہر لمحہ موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ہر آدمی ہر آن مذکورہ نایبنا سے کانٹوں اور کروڑوں گنا سے بھی زیادہ سنگین خطرے سے دوچار ہے۔ کیوں کہ اندھے کی غفلت اس کو صرف ایک کنویں میں گرا سکتی ہے، جب کہ موت سے غفلت آدمی کو چہنم میں گرا دے گی۔ جو تمام مصیبتوں سے زیادہ بڑی مصیبت ہے۔

اب جو لوگ موت کے معاملہ میں "آنکھ والے" ہیں۔ یعنی وہ جانتے ہیں کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، موت اگلی دنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے جہاں ہر آدمی کا عمل دیکھا جائے گا اور اس کے مطابق اس کو جنت یا جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ ایسے ہاں جو لوگ بے خبروں کے معاملہ میں کیا کریں گے، کیا ان کے سامنے وہ فلاح دنیا یا نظام کامل کی تجویز پیش کریں گے۔ نہیں۔ وہ پتلا نہیں گے؛ "موت، موت، وہ کہیں گے کہ اسے لوگو، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، خواہ کجیور کے ایک ٹکڑے ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو" (انٹرویو ہندو لو بشق مشعرہ)

مگر موجودہ زمانہ میں جو لوگ اسلام کے نام پر تھریکیں چھپا رہے ہیں، ان کو ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص آزادی کا نعرہ لگا رہا ہے اور کوئی شخص اتنا مت نظام کا، کوئی ظلم کو مٹانے کے لئے مباحدین کی فوج ہندو با ہے اور کوئی عالمی سطح پر حکومت الیہ تمام کرتے گا۔

مگر اس قسم کی تمام تحریکیں "بلاغت و دعوت" کے خلاف ہیں۔ جس انسان کا معاملہ ہو کہ وہ کامل برابری (موت) کے کنارہ کھڑا ہوا ہے۔ اس کے حق میں واحد سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو موت کے بعد آنے والے سنگین خطرے سے آگاہ کیا جائے۔ جس طرح کنوئیں کے کنارہ کھڑے ہونے نائینتے صرف ایک بات کہی جائے گی۔ اس کے سوا کوئی اور دوسری بات کہنا بلاغت کلام کے خلاف ہوگا۔

اسی طرح جس تحریک کے رہنما موت کے مسئلہ سے باخبر ہوں، ان کے لئے یقیناً سب سے بڑی بات یہی ہوگی۔ وہ ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر کے انسان کو اس خطرے سے آگاہ کر دیں گے تاکہ مرنے سے پہلے آدمی اس حقیقت کو جان لے، وہ دارالجزا میں داخل ہونے سے پہلے اس کی تیاری کر لے۔

سروشن چرچل نے ۱۹۵۴ میں جنگ کے خلاف پیدا وئی دیتے ہوئے کہا تھا کہ آج ساری دنیا جہنم کے کنارے گھوم رہی ہے:

The world is roaming around the brim of hell.

چرچل کے سامنے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ تھا۔ انھوں نے اپنے انتباہ میں "جہنم" کا لفظ مجازی طور پر استعمال کیا تھا۔ مگر ایک باخبر زمین اور دوائی کے لئے یہ مجاز نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ پوری دنیا بھڑکتی ہوئی جہنم کے کنارے کھڑی ہے۔ ہر آن یہ خطرہ ہے کہ کب وہ اس کے اندر گر پڑے۔ تیسری عالمی جنگ کا خطرہ مل سکتا ہے، مگر جہنم کا خطرہ اتنا یقینی ہے کہ اس سے اللہ کے متقی بندوں کے سوا کوئی بھی مومن محفوظ نہیں۔

تیسری عالمی جنگ کے خطرات سے جو لوگ آگاہ ہیں، وہ اس کو مانتے کے لئے رات دن سرگرم ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ جہنم کے شدید تر خطرات سے آگاہ ہیں، ان کو سیکڑوں گنا زیادہ بڑھ کر سرگرم مل ہونا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ آدمی کو اگر اس کا احساس ہو جائے تو اس کا دن کا سکون اور رات کی نیند اڑ جائے۔ اس کی نفسیات کے اندر ایک ایسا جھونچال آ جائے کہ وہ چاہنے لگے کہ کاش میرا ہر بال ایک زبان ہوتا اور میں اپنی ساری قوت کو استعمال کر کے ساری دنیا کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیتا۔

دعوت الی اللہ

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی الی اللہ (الاحزاب ۴۶) کہا گیا ہے۔ اس دعوت

الی اللہ کو متبعین رسول کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے (یوسف ۱۰۸) یہ دعوت الی اللہ پہلے بھی اہل ایمان کی ذمہ داری تھی، اور اب موجودہ مسلمانوں کی ذمہ داری بھی یہی ہے۔

دعوت الی اللہ حقیقتہً دعوت الی عبادۃ اللہ ہے۔ چنانچہ تمام پیغمبروں نے اپنے مخلصین سے یہی کہا کہ تم لوگ ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کسی اور کی عبادت ذکر و (۱۳/۴۱) عبادت اس کا نام ہے کہ کسی ہستی کو اپنے سے بڑا اور مقدس مان کر اس کے آگے جھکنے والا معاملہ کیا جائے (اصل العبودیۃ المنصوع والتذلل، لسان العرب)

قرآن میں ہے کہ اللہ نے انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں (وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کی صفت خود انسان کی تخلیق میں شامل ہے۔ وہ خود انسان کی فطرت میں پیوست ہے۔ تاہم عبادت کے سلسلہ میں انسان کا معاملہ وہی ہے جو پیاس کا معاملہ ہے۔ انسان کو پیاس لگتی ہے، وہ پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ اس میں پیاس لگنا ایک فطری معاملہ ہے اور پینا انسان کے اپنے اختیار کا معاملہ۔ پیاس انسان کی فطرت میں اندرونی طور پر شامل ہے۔ پیاس ہر انسان کو ضرور لگتی ہے۔ کوئی آدمی اس کیفیت کو اپنے اندر سے تم نہیں کر سکتا۔ مگر یہ آدمی کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے پانی پئے یا شراب۔ پیاس فطرت کا تقاضا ہے اور پانی یا شراب آدمی کا اپنا اختیار۔

اسی طرح عبادت کا تقاضا ایک فطری تقاضا ہے۔ آدمی اس پر متاد نہیں کہ وہ اس تقاضے کو اپنے اندر سے ختم کر دے۔ مگر یہ اس کے اپنے ارادہ اور اختیار کی بات ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے یا اللہ کے سوا کسی اور کی۔ آدمی جب اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ اپنی فطرت کے تقاضے کو صحیح صورت میں ادا کرتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرتا ہے تو وہ اپنی فطرت کے تقاضے کو غلط طور پر پورا کرتا ہے۔

سب سے بڑا ظلم

قرآن میں حضرت لقمان کی زبان سے یہ تسلیم دی گئی ہے کہ تم شرک نہ کرو، کیوں کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے (لا تشرك بالله ان الشرك لظلم عظیم، لقمان)

ظلم کے معنی ہیں — کسی چیز کو اس کی اصل جگہ کے بجائے کہیں اور رکھنا (الظلم: وضع الشيء في

غیر موضعہ، سان العرب، جب آدمی ایک اللہ کو مانتا ہے تو وہ اپنی فطرت کے جذبہ عبودیت کو اس کی جگہ پر رکھتا ہے۔ اور جب وہ اللہ کے سوا کسی اور چیز کو مانتا ہے تو وہ اپنی فطرت میں چھپے ہوئے جذبہ عبودیت کو اس کی اصل جگہ کے علاوہ کہیں اور رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے توحید وضع الشئی فی موضعہ ہے اور شرک وضع الشئی فی غیر موضعہ،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت کا اصل نشانہ یا اس کا اصل نکتہ کیا ہے۔ ایک لفظ میں وہ یہ ہے کہ انسانیت وضع الشئی فی غیر موضعہ کی غلطی میں مبتلا ہے۔ اب ہم کو تبلیغ و تمقین کے ذریعہ اسے وضع الشئی فی موضعہ کے مقام پر لے آنا ہے۔

انسان کے بارہ میں یہ بات کہ وہ ایک "عبادت گزار" مخلوق ہے، صرف مذہبی عقیدہ کی ایک بات نہیں۔ خود علم الانسان (Anthropology) سے بھی یہی بات خالص علمی انداز میں ثابت ہوئی ہے۔ انسان کے اندر پرستش اور مذہبیت کا جذبہ اتنا زیادہ رچا ہوا ہے کہ علماء وقت یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ انسان ایک پرستار حیوان ہے، انسان ایک مذہبی حیوان ہے:

Man is a worshipper animal.
Man is a religious animal.

انسان کی فطرت میں یہ بات آخری حد تک پیوست ہے کہ وہ کسی کو اپنا بڑا بنائے۔ وہ اپنی ساری توجہ اس کے گرد مرکوز کر دے۔ اس کی پوری شخصیت اس "بڑے" کے گرد گھومنے لگے۔ اس کو پاکر وہ خوش ہو، اس کو کھو کر وہ گلگین ہو جائے۔ وہ اپنے معاملات میں اس پر اعتماد کرے۔ وہ اسی کی یادوں اور تذکروں میں بیٹھنے لگے۔

یہی کسی کو عبودیت بنا ہے۔ اور اس معنی میں آدمی کو صرف ایک اللہ کو اپنا مہبود بنا نا چاہئے۔ اللہ کو مہبود بنا نا اپنے فطری جذبہ عبودیت کو صحیح استعمال کرنا ہے، اور اللہ کے سوا کسی اور مہبود بنا نا اپنے فطری جذبہ عبودیت کو غلط جگہ استعمال کرنا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو دنیا میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو عبادت گزار سے خالی ہو۔ کچھ لوگ مظاہر فطرت کا بت بنا کر ان کو پوجتے ہیں (۱۱ ابراہیم ۳۵) کچھ لوگ اپنی مترجم شخصیتوں کو مہبود کا مقام دے دیتے ہیں (التوبہ ۳۱) کوئی آدمی خود اپنی ذات کو الہ اور رب کا درجہ دے دیتا ہے (الفرقان ۳۳) حتیٰ کہ حدیث کے

مطابق ، ایک مرد اور ایک عورت باہمی تعلق سے ایک پھر پیدا کرتے ہیں اور پھر اس پھر ہی کو وہ درجہ دیکھتے ہیں جو درجہ کا درجہ ہونا چاہئے (ان تلسد الامہ و بستھا) ، اسی طرح ہر ایک کسی نہ کسی چیز کو اپنی زندگی میں بڑائی کا وہ مقام دئے ہوئے ہے جس کو معبود بنانا کہا گیا ہے۔

جولائی ۱۹۹۰ کے آخر میں روس کا سفر کیا تھا۔ وہاں میں ۲ اگست تک رہا۔ سوویت روس وہ ملک ہے جہاں ۱۹۱۷ میں کیونسٹ انقلاب آیا۔ اس کے بعد وہاں خدا کے عقیدہ کا خاتمہ کر دیا گیا۔ تعلیمی نظام ، اشاعتی ذرائع ، سماجی سرگرمیاں ، سب کی سب غیر خدائی بنیاد پر قائم کر دی گئیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہاں سے "خدا" کا مکمل خاتمہ ہو جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ عملی طور پر جو چیز پیش آئی وہ صرف یہ تھی کہ سوویت روس نے آسمانی خدا کو چھوڑ کر زمینی شخصیت کو اپنا خدا بنایا۔ یہ زمینی شخصیت ان کا ایڈرینن تھا۔ اسکو میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہاں اسمان ، خروچوف ، برزنیف ، گورباچوف ، ہر ایک پر تنقید کی جاسکتی ہے۔ لوگ علی الاملان ان پر یاد دوسرے روسی لیڈروں پر تنقید کرتے ہیں۔ مگر یہاں لینن کی شخصیت ہر تنقید سے بلند کبھی جاتی ہے۔ یہاں کا ہر آدمی لینن کو بالاتر ہستی کی طرح مقدس سمجھتا ہے۔ سوویت یونین میں لینن کو عظمت و تقدیس کا وہی درجہ دے دیا گیا ہے جو رب ذوالجلال کا ہونا چاہئے۔ لینن کا جسم مومیائی کر کے شیشے کے کیس میں رکھا ہوا ہے اور مخصوص اوقات میں اجتام کے ساتھ لوگوں کو اس کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ لینن کی زندگی سے تعلق رکھنے والی ایک ایک چیز کو خصوصی اہمیت کے ساتھ محفوظ رکھا گیا ہے۔

اسکو میں کریملن کو دیکھتے ہوئے جب میں اس مقام پر پہنچا جہاں لینن کا مقبرہ (Mausoleum) ہے تو میں نے دیکھا کہ وہاں چاروں طرف تعظیم و تقدیس کا غیر معمولی ماحول قائم کیا گیا ہے۔ اسی میں سے ایک یہ ہے کہ مقبرہ کے دو سین گریٹ کے دونوں طرف آٹھ سائے دو مسلح فوجی جوان اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے ادب و احترام کے غیر معمولی تاثر نے ان کو بے حس و حرکت بنا دیا ہو۔

ابتداء میں نے سمجھا کہ یہ رشاہد انسانی مورتیاں ہیں۔ مگر مجھے بتایا گیا کہ یہ دو زندہ فوجی ہیں ، وہ کامل احترام کے مظاہرہ کے طور پر پوری طرح غیر متحرک حالت میں کھڑے رہتے ہیں۔ یہ گویا ایک قسم کی فوجی نماز ہے جو لینن کے سامنے مستقل طور پر ادا کی جا رہی ہے۔

چونکہ کوئی زندہ انسان زیادہ دیر تک اس طرح غیر متحرک حالت میں کھڑا نہیں رہ سکتا ، اس لئے

ہر ایک گھنٹہ پر ان کی ڈیوٹی بدلتی ہے۔ ایک گھنٹہ پورا ہوتے ہی دوسرے فوجی خاص انداز سے آتے ہیں۔ اب پہلے دوپہلے جاتے ہیں اور دوسرے دو ان کی جگہ پر دوبارہ بے حس و حرکت کمرے ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ات اور دن جاری رہتا ہے اور اسی طرح ساہما سال سے جاری ہے۔

لینن کے مقبرہ کے پاس اس قسم کے تقدیسی مناظر کو دیکھ کر میں نے کہا کہ یہ غلط ہے کہ کیونسٹ سماج نے خدا کو چھوڑ دیا۔ زیادہ صبح بات یہ ہے کہ کیونسٹ سماج نے خالق کو چھوڑ کر ایک مخلوق کو اپنا مہبود بنا لیا۔ ماسکویں میں نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ کیا آپ خدا میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہر ایک نے کہا کہ نہیں۔ اس کے باوجود ہر ایک لینن کی حنفت کے احساس میں دبا ہوا تھا۔ کیونسٹ سوسائٹی کا آدمی خدا کو روکر سکتا تھا، مگر وہ اپنی فطرت کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک خدا کو تو چھوڑا مگر وہ اپنے آپ کو دوسرے خدا کے آگے جھکانے سے باز نہ رکھ سکا۔

یہی وہ سب سے بڑی غلطی ہے جس میں ہر انسان مبتلا ہے۔ اب دائمی کلام یہ ہے کہ وہ انسان کو بتانے کہ تم وضع الٰہی فی غیر موضوعہ کی غلطی کر رہے ہو۔ تم نے اپنے جذبہ تقدیس اور احساس عبودیت کا مرکز غیر اللہ کو بنا رکھا ہے۔ تم کو چاہئے کہ تم ان جذبات کا مرکز ایک اللہ کو بناؤ۔ یہ تمہارے لئے وضع الٰہی فی موضوعہ کے ہم سنی ہو گا اور وہ تمہارے لئے ابدی کامیابی کا نامن ہو جائے گا۔

صبح استعمال ، غلط استعمال

موجودہ دنیا میں انسان حالت امتحان میں ہے۔ یہ امتحان کس چیز میں ہے۔ وہ استعمال فطرت کے معاملہ میں ہے۔ انسان کے اندر پیدا نشی طور پر کچھ مانگیں یا کچھ تقاضے رکھے گئے ہیں۔ اب اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم ان مانگوں اور ان تہف منوں کو صبح رخ پر استعمال کرتے ہیں یا غلط رخ پر۔ مدت امتحان پوری ہونے کے بعد آدمی جب اگلی دنیا میں داخل ہو گا تو اسی صبح یا غلط استعمال پر اس کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

انسان کے اندر فطری طور پر یہ طلب موجود ہے کہ وہ کسی کو اپنا بڑا مانے اور اس کے آگے غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو جھکا دے۔ اس طلب کا صبح استعمال یہ ہے کہ وہ ایک اللہ کو بڑا مانے اور صرف اسی کے سامنے جھکے۔ اس طلب کا غلط استعمال یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو بڑائی کا درجہ دے اور ان کے سامنے جھکے۔

انسان کے اندر فطری طور پر پانی، خوراک اور جنسی تعلق وغیرہ کی طلب موجود ہے۔ ان میں سے بظاہر کوپورا کرنے کا ایک صحیح انداز ہے اور ایک غلط انداز۔ آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ان فطری مانگوں کو پورا کرنے کے لئے صرف صحیح انداز پر متوجہ رہے۔ وہ اپنی فطری مانگوں کو پورا کرنے کے لئے غلط انداز اختیار نہ کرے۔ انسان کی ایک لازمی ضرورت کسب معاش ہے۔ اس کو اپنی ضروریات دنیا کے لئے کمانا ہے۔ اس کسب کے کچھ طریقے حلال ہیں اور کچھ طریقے حرام۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ صرف حلال طریقوں سے کمائے، وہ حرام طریقوں سے کمائے کی کوشش نہ کرے۔

انسان جب دنیا میں زندگی گزارنا چاہتا ہے تو بار بار دوسروں سے اس کا سابقہ پڑتا ہے۔ ان سابقوں میں ایک صدق اور انصاف اور امانت کا طریقہ ہے، اور دوسرا جھوٹ اور بے انصافی اور خیانت کا طریقہ۔ یہاں آدمی کو چاہئے کہ وہ صدق اور امانت والا اخلاق اختیار کرے، وہ جھوٹ اور بے انصافی اور خیانت والے اخلاق سے پرہیز کرے۔

انسان کے اندر فطری طور پر کچھ جذبات موجود ہیں۔ مثلاً غصہ، انایت، خود پسندی اور ذوقِ بڑائی۔ یہاں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے ان جذبات کو ایک حد کے اندر رکھے، انہیں مقرر کی ہوئی حد سے باہر جانے نہ دے۔

اسی طرح زندگی کے ہر معاملہ میں ایک طریقہ معیار کے مطابق ہے اور دوسرا طریقہ معیار کے خلاف۔ اللہ تعالیٰ نے ان معیاروں کو وحی کے ذریعہ بتا دیا ہے۔ اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ خود اپنے آپ کو اس معیار پر ڈھالیں، اور دوسروں کو بھی اسی معیار کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کریں۔ اسی تلقین کا نام دعوت ہے۔

مسلمانوں کا مقام

مسلمان ختم نبوت کے بعد مقام نبوت پر ہیں۔ ان کی لازمی ذمہ داری تھی کہ وہ غیر مسلم اقوام کے اوپر اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔ مگر وہ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ یہ کوئی اتفاقی کوتاہی نہیں۔ اس کا سبب مسلمانوں کا وہ بگڑا ہوا تصور اسلام ہے جو آج تمام دنیا کے مسلمانوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔

اس کی وضاحت کے لئے میں ایک مثال دوں گا۔ مدنی کے ایک کانفرنس ہال میں ایک مسلم رہنما تقریر

ہوتی۔ تقریر کا موضوع تھا — "دور جدید میں دعوت اسلام" ایک گفتگو کی تقریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ ہندستان جیسے ملک میں دعوت اسلامی کا کام کرنے کا طریقہ کیا ہونا چاہئے۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے کہا: ہندستان میں مسلمان کمزور اقلیت کی صورت میں ہیں۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کیوں کہ اسلام میں طاقت ورحمیت (position of strength) کا ماڈل تو موجود ہے، مگر اسلام میں بے طاقت ورحمیت (position of modesty) کا ماڈل موجود نہیں۔

یہ جواب بتاتا ہے کہ مقرر کے سامنے اسلام کی صرف سیاسی تاریخ ہے۔ اس کے سامنے اسلام کی دعوتی تاریخ نہیں۔ ان کی نظر بعد کو بننے والی اسلامی تاریخ میں اٹکی ہوئی ہے وہ اس سے آگے ملکی تاریخ کو نہ دیکھ سکے۔ جو نہ صرف ان کے الفاظ میں (position of modesty) کا بہترین ماڈل ہے بلکہ وہی اصل بنیاد ہے جس کے اوپر اسلام کی بعد کی تاریخ بنی۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی ذہنی فکری عقلی کیا ہے جس نے انہیں دعوت کے کام سے بے رغبت بنا رکھا ہے۔ یہ سب کے سب لوگ اسلام کے تاریخی مظاہر میں اٹکے ہوئے ہیں وہ اسلام کی فکری اور اعتقادی قوت کو دریافت نہ کر سکے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اسلام کی سیاسی تاریخ سے متاثر ہو کر اٹھے۔ وہ اسلام کے بتائے ہوئے مسئلہ آخرت سے متاثر ہو کر نہیں اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سارے جذبات اس رخ پر چل پڑے کہ وہ اسلام کو سیاسی حیثیت سے غائب کر سکیں۔ ان کے جذبات اس رخ پر متحرک نہیں ہوئے کہ وہ اقوام عالم کو اس سب سے زیادہ سنگین مسئلہ سے آگاہ کریں جس کو قرآن میں "النبا العظیم" کہا گیا ہے۔ یہ لوگ اپنے مخصوص مزاج کے تحت، اسلام کو سیاسی غلبہ کی تحریک سمجھتے ہیں۔ اور یہی ان کی بنیادی عقلی ہے۔ اسلام لوگوں کو حقیقت آخرت سے آگاہ کرنے کی دعوت ہے اور یہی اس کا اصل پہلو ہے۔ فقیر تمام چیزیں اس کے مقابلہ میں ذیلی یا اضافی حیثیت دیکھتی ہیں۔

دو قسم کی تحریکیں

تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک مبنی بر شخصیت (personality-based) تحریک اور دوسری مبنی بر نظام (system-based) تحریک۔ اول الذکر کا نشا نہ فرد کی شخصیت اور کردار کو بدلنا ہوتا ہے۔ ثانی الذکر کا نشا نہ نظام یا سماجی ڈھانچہ کو توڑ کر دوسرا انتظامی ڈھانچہ بنانا۔ اسلام اول الذکر قسم کی تحریک

ہے۔ اس کے مقابلہ میں شمال کے طور پر، کیونزوم کی تحریک ڈھانچہ کو بدلنے کی تحریک۔

اسلام کی پوری تحریک انسانی شخصیت کو نشا نہ بنا کر چلائی جاتی ہے۔ کیوں کہ دنیا اور آخرت دونوں کی تمام کامیابیوں کا انحصار اسی انسانی شخصیت کو بدلنے یا نہ بدلنے پر ہوتا ہے۔ قرآن کی آیت (ان الله لا يعزب عن احد شئ) کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جو اس دنیا میں کسی انسانی گروہ کی انفرادی حالت (ما بانفس) کی تبدیلی کی بنیاد پر اس گروہ کی اجتماعی حالت (ما بقوم) کی تبدیلی کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

آخرت میں بھی کسی شخص کی ذاتی حالت کی بنیاد پر اس کے انجام کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں وہ شخص کامیاب ہوگا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا، اور وہ شخص ناکام ہو کر رہ جائے گا جس نے اپنے نفس کو گناہ کیا (قد افلح من زكها و قد خاب من دسها)۔

اسلامی سیاست کے لئے اٹھنے والے یہ لوگ اپنے آپ کو داعی کہتے ہیں۔ اور اپنے کام کو دعوت کا عنوان دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا موجودہ کام دعوت کا قائل ہے نہ کہ اصل دعوتی کام۔

جو لوگ سیاسی اقتدار کے لئے اٹھیں وہ فوراً فرقہ ثنائی کے لئے حریف بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی تحریک ہمیشہ جھگڑا اور ٹکر اُپیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اور جھگڑا اور ٹکر اُٹھنے کی فضا جہاں پیدا ہو جائے وہاں دعوت کا کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔

یہی واقعہ موجودہ زمانے میں بہت جیسے پیمانے پر پیش آیا۔ اسلام کو سیاسی قوت بنانے کی کوشش نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ دوسری قومیں اسلام کو "خطرہ" کے روپ میں دیکھنے لگی ہیں۔ مزید یہ کہ اسلام پسندوں کا یہ نظریہ کہ وہ زور اور قوت کے ذریعہ اسلام کو ساری دنیا میں نافذ کریں گے، اس نے اہل عالم کی نظریں اسلام کو تخریب کاری کے ایک نظریہ کی حیثیت دے دی ہے۔

یورپ کے ایک سفیر ایک مسلمان نے مجھے بتایا کہ اس کی ملاقات یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے ہوئی۔ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا:

Are you a Muslim?

Yes.

Then you are a terrorist.

پروفیسر کا یہ رپارٹک نہ مزاح ہے اور نہ انتہا پسندی۔ وہ موجودہ صورت حال کا ایک سادہ سا اظہار

ہے۔ موجودہ زمانہ کے اسلام پسندوں نے اپنے سیاسی خیالات اور انقلابی طریق کار کے ذریعہ جس اسلام کا مظاہرہ کیا ہے اس کے بعد ہی ممکن ہے کہ لوگ اسلام کو تخریب کاری اور دہشت گردی کا ایک نظریہ سمجھیں۔ اس کے سوا کوئی اور چیز ممکن نہیں۔

اسلام کی تصویر

لندن کے انگریزی ہفت روزہ آبزوردر (Observer) میں برطانوی صحافی مسٹر ہیلٹن (Adrian Hamilton) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مغربی دنیا میں آج کل کچھ دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ اب ہمارے لئے سب سے بڑا خطرہ اسلام ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترک دوبارہ وائٹنگ کے دروازہ پر ہیں۔ کیونکہ وہ ہو سکتا ہے کہ مگر گیا ہو۔ مگر آج ہیں سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرنے کی ضرورت ہے وہ دوبارہ ابھرتا ہو اسلام ہے۔ سوویت یونین ایک غیر مذہبی حکومت کی حیثیت سے ایسا کر سکتی ہے کہ وہ جنگ کی خواہش نہ کرے۔ مگر بنیاد پرست مسلمانوں کو موت کا ڈر نہیں، اس لئے اگر وہ ہم کو پالیں تو وہ اس قسم کی مقبولیت کا مظاہرہ نہیں کریں گے :

The Turks are at the gates of Vienna once more. Communism may be dead, but what we really need to fear is a resurgent Islam. The Soviet Union, as a non-theocratic state, could be relied on not to wish for war. Elsewhere, the fundamentalists have no fear of death and will therefore show no such rationale when they get the bomb.

مسٹر ہیلٹن نے اگرچہ اس کو مغربی دانشوروں کا جھوٹا ہوا کہہ کر رد کر دیا ہے۔ تاہم خود ہمارے لئے یہ ایک بے حد قابل توجہ بات ہے۔

اسلام کو اللہ تعالیٰ نے اہل عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔ مگر موجودہ مسلمانوں کی بے معنی لڑائیوں نے اسلام کو اہل عالم کی نظر میں دین بربادی بنا دیا ہے۔ دنیا یہ سمجھتی ہے کہ مسلمان گویا دیوانوں کا ایک گروہ ہے جو اپنے اتقانہ عقیدہ کے تحت سمجھتا ہے کہ لڑ کر مر جاؤ تو تم جنت میں جاؤ گے۔ اس لئے اگر اس کو کسی سے ایٹم بم اور ہائیدروجن بم مل جائیں تو وہ ان کو لوگوں کے اوپر پھینک دے گا۔ خواہ اس کے نتیجے میں وہ خود بھی برباد ہو اور ساری دنیا میں بربادی پھیلانے کا ذریعہ بنے۔

مغربی دانشوروں کا یہ ریمارک سراسر درست ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں کچھ نام نہاد مذہبیین نے اپنے خود ساختہ نظریات کے تحت بہت سے مسلم نوجوانوں کے اندر یہی بمبوناہ ذہن پیدا کر دیا ہے۔ اسلام

دین رحمت ہے مگر انقلابی اسلام کے ان علمبرداروں نے اس کو دینِ تحریب بنا دیا ہے۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اسلام کی تحریب میں مصروف ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اسلام کی تعمیر کے لئے جہادِ کبیر کا کارنامہ انہما دے رہے ہیں موجودہ زمانہ میں یہ واقعہ بہت بڑے پیمانہ پر پیش آیا ہے۔ موجودہ مسلمانوں نے ساری دنیا میں ہتھم کی سرگرمیاں دکھائیں مگر وہ اس اصل کام میں مشغول نہ ہو سکے جس کو قرآن میں اندازِ آخرت کہا گیا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا کہ موت کے بعد ہر آدمی کو خدا کی میزان میں کھڑا ہونا ہے، اس کے بعد اس کے لئے یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔

مسلمانوں کی اس عظیم کوتاہی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب موجودہ مسلمانوں کی زوال یافتہ نظریات ہے۔ آدمی جس چیز سے خود ڈرے، اس چیز سے وہ دوسروں کو بھی ڈرانے کے لئے متحرک ہو گا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان خود آخرت سے بے خوف ہو گئے تھے، ایسی حالت میں وہ دوسروں کو آخرت کا خوف دلانے کے لئے کیوں کراٹھے۔

قرآن کے مطابق، امتوں پر جب لمبی مدت گزر جاتی ہے تو ان کے اندر قساوت (الحمدید ۱۳) پیدا ہو جاتی ہے۔ قساوت خشیت یا خشوع کا ضد ہے۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امت پر ایک وقت آئے گا جب اس سے علم اٹھایا جائے گا۔ جبیر تابعی عبادۃ بن الصامت سے ملے اور کہا کہ آپ کے بھائی ابوالدرداء کہتے ہیں کہ علم اٹھایا جائے گا۔ عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابوالدرداء نے سچ کہا۔ اور اگر تم چاہو تو میں تم کو بتاؤں کہ وہ کون سا علم ہے جو سب سے پہلے اٹھایا جائے گا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ سب سے پہلے جو علم اٹھایا جائے گا وہ خشوع ہے۔ چونکہ تم کسی جامع مسجد میں داخل ہو اور وہاں تم ایک بھی خاشع انسان نہ دیکھ سکو (جامع الاصول ۱۳۶)

منتخب امت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو۔ اور اپنے رب کی عبادت کرو۔ اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم کا ایسا ہو۔ اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چنا ہے۔ اور اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا، اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہو اور تم لوگوں کے اوپر گواہ ہو۔ پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔

وہی تہارا مالک ہے۔ پس کیسا اچھا مالک ہے اور کیسا اچھا مددگار (الحج ۷۷-۷۸)

قرآن کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان "امت مجتبیٰ" ہیں۔ ان کا یہ "اہتمام" کارِ شہادت یا کارِ دعوت، کئے لئے ہوا ہے۔ اسی شہادت علی الناس، کے کام میں انہیں "حق جہاد" اور کرنا ہے۔ پھر یہ کوئی جنگ و قتال کا کام نہیں، یہ تمام تر روحانیت اور ربانیت کے زور پر انجام دیا جانے والا کام ہے۔ اور کسی داعی میں یہ اعلیٰ روحانی اوصاف عبادت اور اعتصام باللہ کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔

شہادت علی الناس ہی اہل اسلام کی اصل خدائی ذیوٹی ہے۔ اسی کام کی انجام دہی کے اوپر ان کے مستقبل کا انحصار ہے۔ اگر وہ اس کام کو انجام دیں تو یہ کام ان کی فلاح کا خاسن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان کا ناصر اور موثر بن جائے گا۔ اور اگر وہ اس کام کو انجام نہ دیں تو اس کے بعد اندر نشہ ہے کہ ان کے ساتھ لا ناصر لہم ولا مولیٰ لہم کا معاملہ کیا جائے۔

"دین میں کوئی تنگی نہیں" سے یہاں مراد "عمل شہادت" ہے۔ تہا سے لے اس کام میں کوئی تنگی نہیں رکھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے عالمی حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں کہ اب دعوت کا کام "یسر" کے حالات میں انجام دیا جائے گا، جب کہ اس سے پہلے وہ "عسر" کے حالات میں انجام دیا جاتا تھا۔

اس "یسر" کے بے شمار پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو دس اہل اعلام سے متعلق ہے۔ جدید دس اہل اعلام نے اس بات کو کھن بنا دیا ہے کہ اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں پہنچایا جاسکے۔ اس سے پہلے بادشاہ کے سرکسی کو اظہارِ خیال کی آزادی حاصل نہ ہوتی تھی۔ آج ہر آدمی کو اظہارِ خیال کی مکمل آزادی ہے۔ اس انقلاب نے آج مذہب کی تبلیغ کو ایک ایسا کام بنا دیا ہے جس کو ہر آدمی بہ آسانی انجام دے سکے۔

ہمدیہ تحقیقات نے ایک طرف تمام دوسرے مذہبی نظریات کو ناقابل اعتبار ثابت کر دیا، دوسری طرف اسلام ہر اعتبار سے ایک ثابت شدہ دین برکرا بھرا آیا۔ وغیرہ

موجودہ زمانے میں اس طرح کی بے شمار تبدیلیاں ہوئی ہیں جن کو ایک لفظ میں "عمل تیسیر" کہا جاسکتا ہے۔ خدا کا کام تیسیر ہے اور بندے کا کام تبلیغ۔ خدا نے اپنے حصہ کا "نصف اول" کام پوری طرح انجام دے دیا اب اہل اسلام کو اپنے حصہ کا "نصف ثانی" کام انجام دینا ہے۔ اگر وہ اس کام کی بجائے آدمی کے لئے ٹھہریں تو یقیناً ان کے حق میں قرآن کے یہ الفاظ پورے ہوں گے: **وَلْيَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْهُ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ۔**

انصارِ اسلام

آج اسلام کو دوبارہ ایک گروہ انصار کی ضرورت ہے۔ دور اول میں "انصار" نے اسلام کے اظہار میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، آج بھی اسلام کا اظہار اسی وقت ممکن ہے جب کہ انصار کا ایک گروہ اس کی حمایت پر کھڑا ہو جائے۔

انصار کون لوگ تھے۔ یہ وہ نادار انسان تھے جنہوں نے صداقت کو اس کے مجرور روپ میں دیکھا اور اس کے آگے جھک گئے۔ ہجرت سے پہلے مدینہ میں جب اسلام کی دعوت داخل ہوئی تو وہ صرف ایک فطری صداقت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت اسلام کے پاس درودیوار کی صورت میں اس قسم کا کوئی ایک "مرکز" بھی نہ تھا جیسے مرکز آج ساری دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں اسلام کے نام پر قائم ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اسلام کی مننوی عظمت کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

اس نادار صفت کا شرعی نام ایمان ہے اور نفسیات کی زبان میں اس کو اعتراف کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ صفت ہو، انہیں سے اعلیٰ کردار کا ظہور ہوتا ہے اور وہی لوگ اس دنیا میں کوئی تاریخ ساز عمل انجام دیتے ہیں۔

آج اسلام کو اسی قسم کے انصار کا ایک گروہ درکار ہے۔ اسلام آج دوبارہ اہم بنی ہو گیا ہے۔ اگرچہ اسلام کے نام پر عظمت کے بے شمار مینار کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر حقیقی اسلام دوبارہ ظاہری عظمتوں سے خالی ہے۔ اس کو آج اس کی معنوی سطح پر ہی پہچانا جاسکتا ہے۔

یہ ایک انتہائی نازک امتحان ہے جس کو قرآن میں "قبل الفسح ایمان" کہا گیا ہے۔ جو لوگ اس نازک امتحان میں پورے اتریں، وہی دور جدید میں "انصارِ اسلام" کا کردار ادا کریں گے۔ وہی دوبارہ اسلام کی وہ تاریخ بنائیں گے جس کا آج زمین و آسمان کو سب سے زیادہ انتظار ہے۔

اسلام کا سیلاب

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جب اسلام کا ظہور ہوا، اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت عیسائیوں کی سلطنت تھی۔ اس سلطنت کے دو بڑے حصے تھے۔ ایک مغربی حصہ اور دوسرا مشرقی حصہ۔ مغربی حصہ (یورپ) کو رومن ایمپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت روم (اٹلی) تھا۔ مشرقی حصہ (ایشیا اور افریقہ) کو بازنطینی ایمپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت قسطنطنیہ (ترکی) تھا۔

پینچھراہم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں شام کی سرحد پر رومیوں سے مسلمانوں کا فوجی ٹکراؤ شروع ہوا۔ اس ٹکراؤ میں مسلمان کامیاب رہے۔ ایک صدی کے اندر اندر انھوں نے سبھی سلطنت کے مشرقی حصے کو تقریباً پورا کر لیا اور فتح کر لیا جس میں ان کے مقدس مذہبی مقامات (شام اور فلسطین) بھی شامل تھے۔

اس کے بعد مسلمانوں نے ایک طرف سسلی اور اسپین کی جانب سے پیش قدمی شروع کی اور بڑھتے بڑھتے فرانس کے اندر داخل ہو گئے۔ دوسری طرف وہ ترکی کی جانب سے مشرقی یورپ میں داخل ہوئے۔ اور آگے بڑھتے ہوئے ویانا (آسٹریا) تک جا پہنچے۔ اس طرح انھوں نے سبھی (رومی) سلطنت کے مشرقی بازو پر تقریباً پورا پورا قبضہ کر لیا۔ اور اسی کے ساتھ اس کے مغربی بازو کے بھی ایک حصہ کو کاٹ لیا۔

مشہور عیسوی بوائیاں مغربی عیسائیوں کی طرف سے ان کی اس شکست کا رد عمل تھیں۔ عیسائی دنیا ایک غیر قوم کے ہاتھ سے اپنی اس مذلت اور شکست کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ یورپ کی سبھی سلطنتوں نے متحد ہو کر مسلم دنیا پر حملہ کر دیا۔

یہ عیسوی بوائیاں (Crusades) وقفہ وقفہ سے تقریباً دو سو سال (۱۰۹۵-۱۲۷۱ء) تک جاری رہیں۔ اس درمیان میں عیسائیوں کو وقتی اور جزئی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر سلطان صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں بالآخر مسلمانوں نے فتح پائی۔ اور مسیحیوں کو ان کی سابقہ دنیا سے باہر نکال دیا گیا۔ پیرس سائیکلو پیڈیا (Pears Cyclopaedia) نے اس سلسلے میں بہت بامعنی تبصروں کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

Millions of lives and an enormous amount of treasure were sacrificed in these enterprises, and when all was done Jerusalem remained in the possession of the 'infidels'.

لاکھوں جانیں اور بے شمار دولت ان ہموں میں قربان کر دی گئی۔ اور جب سب کچھ ہو چکا تو یروشلم بدستور "بدینوں" کے قبضہ میں پڑا ہوا تھا۔

یہ واقعہ جو آٹھ سو سال پہلے عیسائیوں کے ساتھ پیش آیا تھا، شیک ہی واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں دوبارہ مسلمانوں کی "دوسو سالہ" قربانیوں کے باوجود "یرشلیم" انہیں لوگوں کے قبضہ میں ہے جن کو مسلمان سب سے زیادہ غیر مستحق سمجھتے ہیں۔

مسیحی قومیں صلیبیں جنگوں میں تو کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ کی استعماری جنگ میں انہوں نے پوری کامیابی حاصل کی ہے۔ پچھلی صدیوں میں انہوں نے مسلمانوں کی تمام سلطنتوں کو مغلوب کر لیا اور پھر ساری دنیا میں ان کے اوپر براہ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی اور تہذیبی غلبہ قائم کر لیا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے پورے عالم اسلام میں مغربی قوموں کے خلاف لڑائی پھیر دی۔ تاہم دو سو سال تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری کی لڑائیوں اور مقابلوں کے بعد بھی صورت حال یہ ہے کہ مسیحی اقوام کا غلبہ بدستور قائم ہے۔ "یروشلم" اب بھی دشمنان اسلام کے قبضہ میں ہے۔

بے پناہ کوششوں کے باوجود اس ناکامی کی وجہ دعوت ال اللہ کے کام کو چھوڑنا ہے جو امت مسلمہ کا اصل منصبی فریضہ ہے۔ یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی پر مسلمان نصرت خداوندی کے مستحق ہوتے ہیں۔ مسلمان جب تک دعوت ال اللہ کے کام کے لئے ناکھڑے ہوں گے ان کی تمام کوششیں ضبط اعمال کا شکار ہوتی رہیں گی۔ ان کا وہی حال ہو گا جو بائبل میں بنی اسرائیل کے لئے بیان کیا گیا تھا:

ذرعتم کثیراً ودخلتم قلیلاً۔ تاکلون ولبس الی الشبع۔ تشریبون ولا تروون۔ تکتون ولاتدفاون۔ والّاخذ اجرۃ یاخذ اجرۃ لکیس
ہنقوب (جمی، الاملاح الاول)

تم اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت سا بویا، پر تھوڑا اکانا۔ تم کھاتے ہو، پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو، پر پیاس نہیں کھیتی۔ تم کپڑے پہنتے ہو، پر گرم نہیں ہوتے۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیل میں جمع کرتا ہے۔ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو (جمی، باب اول)

یہ مسلم رہنماؤں کی کوتاہ نظری تھی کہ وہ کھوئے ہوئے کے غم میں پڑے رہے۔ اور ملے ہوئے

مواقع کو استعمال کرنے کے لیے دُخوڑاٹھے اور رُقوم کو اس کے لیے بیدار کیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار ایسی نشانیاں ظاہر ہو رہی تھیں جو یہ بتا رہی تھیں کہ کرنے کا اصل کام کیا ہے۔

امریکہ میں ایک ٹی وی تنظیم ہے جس کا نام اے بی سی ہے۔ وہ ہر روز شام کو "ورلڈ نیوز ٹوناٹ" کے عنوان کے تحت اس دن کی اہم عالمی خبریں نشر کرتی ہے۔ ۱۶ فروری ۱۹۸۹ کو اس نے ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کو جو خبریں بتائیں، ان میں سے ایک اہم خبر یہ تھی کہ ریسرچ کرنے والوں کی ایک ٹیم نے رپورٹ دی ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے زیادہ تیز رفتار مذہب ہے۔ ان کے جائزہ کے مطابق ۲۰۲۵ تک دنیا کی آبادی میں ہر چار آدمی میں سے ایک آدمی مسلمان ہوگا۔ پچھلے سال عیسائی تنظیموں کی دو رپورٹوں میں بھی یہی بات کہی گئی تھی کہ اسلام کرہ ارض پر سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلنے والا مذہب ہے۔

امریکہ (پین نیٹڈ) سے ایک انگریزی ماہنامہ شائع ہوتا ہے جس کا نام اسلامک ہورائزنز (Islamic Horizons) ہے۔ اس نے اپنے شمارہ مارچ - اپریل ۱۹۸۹ میں اس رپورٹ کا خلاصہ شائع کیا ہے۔ وہ اس کے الفاظ میں یہ ہے:

ABC's "World News Tonight" reported in its February 16, 1989 newscast that a new reliable study showed that Islam is the fastest growing religion in the world. According to researchers, one out of every four people in the world will be Muslim by the year 2025, about one generation from now. At least two reports from Christian organisations last year marked Islam as not only the fastest blooming religion on the planet but in the United States, as well (p.21).

نیویارک میں دسمبر ۱۹۸۸ میں "مسلم ورلڈ ڈوے" کے نام سے ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع کی کارروائیاں نیویارک کے پنٹا ہوٹل (Penta Hotel) میں انجام پائیں۔ اس موقع پر امریکہ کی کئی مشہور شخصیتیں بھی شریک ہوئیں۔ ان میں سے ایک امریکہ کے ممتاز بیرونی امور کے ماہر ویلیئم کنسٹلر (William Kunstler) بھی تھے۔

ویلیئم کنسٹلر کی تقریر نیویارک کے انگریزی ہفت روزہ دی مینارٹ (The Minaret) میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں موصوف نے اسلام کی غیر معمولی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ کچھ دنوں بعد اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہوگا۔ کل وہ دنیا کی آبادی کا چالیس فی صد حصہ ہو جائے گا اور اگلے پچاس برسوں میں وہ دنیا کی آبادی کا ساٹھ فی صد حصہ ہوگا:

Someday it will be the major religion of the world. Two-fifth tomorrow and three-fifth in the next 50 years.

۱۰ ستمبر ۱۹۸۹ کو ڈاکٹر محمد طاہر صاحب (میدر آباد) سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے لائبریری سائنس میں ماسٹر ڈگری لی ہے۔ اور انگریزی زبان میں چھپنے والی کتبوں اور مقالات پر ریسرچ کیا ہے۔ ان کے ریسرچ کا عنوان تھا:

English language material on Islamic studies.

انہوں نے ۱۹۱۰ سے لے کر اب تک انگریزی کی اسلامی مطبوعات کا جائزہ لیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ۸۰ ہزار چھپی ہوئی چیزوں (references) کے اعداد و شمار جمع کئے۔ انہوں نے پایا کہ اسلام پر انگریزی کتبیں اور مقالے موجودہ زمانہ میں اتنے زیادہ چھپے ہیں کہ ان کو ایک عظیم انفجار (tremendous explosion) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں انگریزی اسلامی کتابوں کے افسانہ کی شرح یہ رہی ہے:

۱۹۱۰ ————— ۱۹۵۱ ۱۹۵۰ ————— ۱۹۸۰

۲۵ فی صد ۷۵ فی صد

گویا بیسویں صدی کے نصف اول میں اضافہ ۲۵ فی صد تھا، جب کہ اس صدی کے نصف ثانی میں یہ اضافہ ۷۵ فی صد تک پہنچ گیا۔ یہ واقعے کے حسیب آموز ہے۔

اسلام کو اس تیز رفتاری سے ترقی کا راز کیا ہے، اس کا راز یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری دین ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح کامل اور مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے۔ وہ بڑھتا ہی رہے، یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جس کی پیشین گوئی حدیث میں ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ زمین کی سطح پر کوئی پکائی یا پکا ہوا کچھ نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو گیا، جو (لا یبقی علی ظہر الارض بیت مدبر ولا ویر الا دخلہ اللہ کلمۃ الاسلام)

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں مسلمانوں کے تمام معروف لیڈر انگریزوں اور فرانسیسیوں سے لفظی یا عملی لڑائی روکنے میں مشغول تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس مغرب استعمار کو اگر ختم نہ کیا گیا تو وہ اسلام کو مٹا ڈالے گا۔ اس لئے سب سے پہلے کام اس سے لڑ کر مسلم دنیا پر اس

کے غلبہ کو ختم کرنا ہے۔ مسلم رہنماؤں کی روانی کا تو یک طرفہ جانی و مالی نقصان کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں نکلا۔ البتہ دوسری عالمی جنگ نے ان مغربی قوموں کو اتنا کمزور کر دیا کہ وہ ایشیا اور افریقہ سے اپنی فوجوں کو واپس بلائیں۔

اب مسلم ممالک مغرب کے سیاسی غلبے سے آزاد ہو گئے۔ اس کے بعد ان ملکوں میں متحلی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ان حکومتوں کے تمام ذمہ دارانہ مناصب پر وہ مسلمان قابض تھے جنہوں نے مغربی ملکوں میں تسلیم پائی تھی اور مغربی کچھروا کو اپنا رکھا تھا۔ اب دوبارہ مسلم رہنما خود اپنے حکمرانوں سے لڑ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ "مغرب زدہ" مسلمان ہمارے لئے سابق مغربی ملکوں سے بھی زیادہ برے ہیں۔ ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان کو اقتدار کی کرسیوں سے ہٹایا جائے۔ ورنہ یہ لوگ اسلام کا خاتمہ کر دیں گے اور آئندہ اسلام کے لئے کام کرنے کے مواقع باقی نہیں رہیں گے۔ یہ ناکام جنگ تادم تحریک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ مگر کسی بھی ملک میں وہ تبدیلی اقتدار کے مرحلہ تک نہیں پہنچی۔

اسلامی رہنماؤں کی اس سیاسی ناکامی کے باوجود اسلام کا نظریاتی قافلہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے بلکہ وہ ہمیشہ سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف ثانی میں ہمیشہ سے زیادہ اسلامی لٹریچر شائع ہوا ہے۔ ہمیشہ سے زیادہ اسلامی ادارے ساری دنیا میں قائم ہوئے ہیں۔ ہمیشہ سے زیادہ تعداد میں لوگ اسلام قبول کر کے اسلام کے حلقہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ وغیرو

اس قسم کے بے شمار واقعات بتاتے ہیں کہ سیاسی حالات خواہ کچھ ہوں، اسلام کا سفر مسلسل جاری رہتا ہے۔ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی طاقت عطا کی ہے جو کسی بھی خارجی سبب سے ختم ہونے والی نہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خارجی حالات کی مساعدت یا ناساعدت سے بے پروا ہو کر اسلامی دعوت کے میدان میں سرگرم رہیں، وہ سیاسی دفاع کے بجائے ہمیشہ نظریاتی اقدام کے میدان میں اپنا جہاد جاری رکھیں۔

میسور کے سلطان جمپوانگریزوں سے لڑتے ہوئے ۱۷۹۹ء میں شہید ہو گئے۔ اقبال کے نزدیک یہ اتنا بڑا اساتذہ تھا کہ انہوں نے لکھا کہ میسور ہماری ترکش کا آخری تیر تھا جو اب ہمارے پاس نہیں رہا؛ ترکش مارا خدنگ آخریں

بیسویں صدی کے آغاز میں نرکی کی عثمانی خلافت ٹوٹنے لگی تو تمام مسلمان گھبرا اٹھے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی شبلی نعمانی کے اس شعر میں ملتی ہے:

زوال دولتِ عثمان زوالِ شرع و ملت ہے عزیز و فخر فرزند و عیال و فغاناں کب تک
مگر یہ مسلمانوں کے ٹکٹے اور بونے والوں کی کوتاہی تھی۔ انہوں نے اپنی کوتاہ فکری کی بنا پر اسلام کی
طاقتِ کاملہ تر اندازہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو کسی سلطان یا کسی سلطنت کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنی
طاقت سے زندہ رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔ کسی کی موت یا کسی حکومت کا زوال اس کا راستہ روکنے والا
نہیں۔

راہ نجات

۱۷ مارچ ۱۹۹۰ کو میں دہلی سے ایک بیرونی سفر پر روانہ ہوا۔ اردن ایئر لائنز پر سفر کرتے ہوئے اس کا انفلاٹ میگزین الاجنحة (مارچ ۱۹۹۰) پڑھنے کو ملا۔ اس کے صفحہ ۵۸ پر ایک عرب قانون یما نیبل کا مضمون چھپا ہوا تھا۔

مذکورہ عرب قانون اسپین (غرناطہ) گئیں۔ وہاں انھوں نے عرب دور کے آثار دیکھے۔ ان پر عظمت آثار کو دیکھ کر وہ رو پڑیں۔ یہاں انھوں نے تاریخ النصر العربی کو بھی دیکھا اور تاریخ الذل العلی کو بھی۔ انھوں نے کہا کہ کبھی عرب کی عظمت یہاں تھی، اور یہیں سے پانچ سو سال پہلے عرب کی ذلت شروع ہوئی۔ وہ اپنے دل سے پوچھتی رہیں کہ عرب کی یہ رات کہاں تک باقی رہے گی (انی حتی سیستمر هذا اللیل العربی)!

سفر سے واپس آیا تو ڈراما میں دہلی کا سہ روزہ دعوت (۲۸ مارچ ۱۹۹۰) موجود تھا۔ اس کے پہلے صفحہ کے مضمون کی سرخی ان الفاظ میں چھپی ہوئی تھی: اسلامی دنیا آخر اتنی بے سہارا، بے وقعت اور بے وزن کیوں بن کر رہ گئی ہے۔

اس قسم کے مضامین آج مسلم دنیا کے کسی بھی پرچہ اور کسی بھی میگزین میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر مشہور عرب ہفتہ وار الدعوة نے اپنے شمارہ ۱۳ ذی القعدہ ۱۴۰۵ھ (۲۹ جولائی ۱۹۸۵ء) میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں موجودہ حالات کا ذکر تھا۔ اس مضمون کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا گیا تھا: الیس للذین رب یحییہمہ (کیا اس دین کا کوئی رب نہیں جو اس کی مدد کرے)!

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کی دنیا میں مسلمان سب سے زیادہ پست اور حقیر اور مغلوب قوم بن گئے ہیں۔ ان کا یہ حال صرف ان ملکوں میں نہیں ہے جہاں وہ اقلیت کی حیثیت سے آباد ہیں۔ ان کا یہی حال ان ملکوں میں بھی ہو رہا ہے جہاں وہ اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں اور جہاں بنظا ہران کی آزاد حکومتیں قائم ہیں۔

یہاں بنیادی سوال یہ ہے کہ ان کی کس کس کی ہنسا پر ان کا یہ حال ہو رہا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو آج مسلمانوں کے پہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ بنظا ہران کے پاس دین اور دنیا دونوں ہمیشہ سے زیادہ

مقدار میں موجود ہیں۔

آج دنیا میں مسلمانوں کے ۵۶ بااختیار ممالک ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ایک ارب ہے۔ یہ تعداد ماضی کے کسی بھی دور کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ہے۔ مسلمانوں کے درمیان آج ہمیشہ سے زیادہ مسجدیں اور مدرسے ہیں۔ ۱۹۲۵ میں حج کافرینہ ادا کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کم تھی۔ ۱۹۹۰ میں جن مسلمانوں نے حج ادا کیا، ان کی تعداد پندرہ لاکھ (1,500,000) ہے۔ جب کہ اس سال ایرانی مسلمان حج کے لئے نہیں آئے تھے۔

قرآن اور حدیث اور دوسری اسلامی کتابیں آج اتنی زیادہ مقدار میں ہیں کہ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خدا و رسول کے نام پر آج جتنے جملے اور سنہارا اور کافر نہیں ہو رہے ہیں ان کی تعداد ساری انسانی تاریخ میں ہونے والے تمام جلسوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ آج مسلمان ایسے اسلامی اجتماعات منقہ کر رہے ہیں جن میں ۲۵ لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمی بیک وقت جمع ہوتے ہیں، جب کہ رسول اللہ کے آخری اجتماع بجمہ الوداع میں جمع ہونے والے مسلمانوں کی کل تعداد بشکل سوا لاکھ تھی۔ آج اسلامی نظام قائم کرنے کے نام پر اتنے ہنگامے جارہی ہیں کہ اگر تمام انبیاء کی مجموعی آوازیں اکٹھا کی جائیں تو ان کی آوازیں اس کے مقابلہ میں دب کر رہ جائیں گی۔ آج مسلمانوں نے اتنے بڑے بڑے اکابر پیدا کر رکھے ہیں جن میں سے کوئی "عہد آفرین شخصیت" کا حامل ہے اور کسی کے متعلق اس کے معتقدین یہ اعلان کر رہے ہیں کہ :

ہمارے حضرت والا کے فیض سے یارو تمام عالم اسلام جگمگا یا ہے

یہ تمام چیزیں مسلمانوں کے پاس وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود ساری دنیا میں پست اور حقیر ہو رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہو کہ ان سب کے علاوہ کوئی اور چیز ہے جو مسلمانوں کو عزت اور غلبہ کے مقام تک پہنچاتی ہے، اور وہی چیز آج ان کے پاس موجود نہیں۔

اگر آپ اسلام کی مطلوبہ چیزوں کی فہرست بنا کر اس معاملہ پر غور کریں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ موجودہ مسلمانوں کے یہاں اگرچہ تمام چیزیں موجود ہیں، مگر ایک چیز ان کے درمیان سے مکمل طور پر غائب ہے، اور وہ دعوت ہے۔ بد قسمتی سے جو چیز مذہب ہوئی وہی اس معاملہ میں اصل اہمیت رکھتی تھی:

ہماں وردق کہ سہ گشتہ مدعا میں جا است

آج مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر دعوت ہی ایک ایسا کام ہے جس کا ان کے یہاں سرے سے کوئی وجود نہیں۔ اس معاملہ میں ان کی دوری کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کام کرتے ہیں اور اس پر دعوت کا ٹیل لگا دیتے ہیں۔ کوئی مسلمانوں کی اصلاح کے کام کو دعوت بتا رہا ہے کوئی اپنے قومی فخر کے اظہار کو دعوت کا نام دے ہوئے ہے۔ کوئی دوسری قوموں سے قومی اور رادی جنگ لڑتا ہے اور اس کو دعوت کا عمل قرار دیتا ہے۔ کوئی شاعری اور خطابت کے مظاہرے کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ دعوت کا کام انجام دے رہا ہے۔ وغیرہ

دعوت دراصل دعوت الہیہ کا نام ہے۔ اس سے مراد وہ عمل ہے جس کو قرآن میں انذار و تنبیہ کہا گیا ہے۔ یعنی اقوام عالم کو خدا کی مرضی سے آگاہ کرنا۔ انھیں آنے والے دن سے باخبر کرنا۔ انھیں خدا کے اُس منصوبہ کی اطلاع دینا جو خدا نے زندگی اور موت کے بارہ میں مقرر فرمایا ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ خدا کے بندوں کو جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے پر لگانے کی کوشش کا نام دعوت ہے۔ دعوت کا یہ عمل ہمیشہ محبت کی زمین پر آگتا ہے۔ دعوت کا کام وہ لوگ انجام دیتے ہیں جو انسانوں کے انہام آخرت کو سوچ کر تڑپ اٹھے ہوں اور انھیں خدا کی پکڑ سے بچانے کے لئے دیوانہ وار نکل پڑیں۔ مدعو کو محبوب بنائے بغیر کبھی دعوت کا کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دوسری قوموں کی طرف سے ذلت اور ہزیمت کا تجربہ ہوا۔ اس تجربہ نے مسلمانوں کے دلوں میں دوسری قوموں کے لئے نفرت پیدا کر دی۔ وہ دوسری قوموں کو دشمن یا حریف کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے لئے محبت کا موضوع نہ رہیں، وہ صرف نفرت کا موضوع بن کر رہ گئیں۔ یہی وہ اصل سبب ہے جس نے مسلمانوں سے داعیانہ جذبہ کو چھین لیا۔ اور ان کے درمیان دعوتی عمل کو زندہ ہونے نہیں دیا۔

دینِ رحمت کی پیڑم رسانی کے لئے داعی کے اندر محبت و شفقت کا جذبہ ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔ کوئی شخص ایسے لوگوں کے اوپر دعوت کے فرائض انجام نہیں دے سکتا جو اس کی نظر میں منحوس بنے ہوئے ہوں۔ مسلمانوں نے دوسری قوموں سے نفرت کر کے اپنے اندر داعیانہ صلاحیت کھو دی ہے۔ موجودہ حالت میں ان کا دعوت کا نام لینا صرف ایک مذاق ہے، وہ کسی سنبیدہ ارادہ کا اظہار نہیں۔

دعوت الہیہ کی لازمی شرط صبر ہے۔ مسلمانوں کو داعی بننے کے لئے سب سے پہلے صابر بننا پڑے گا۔

دوسری قوموں سے خواہ انھیں کتنی زیادہ ناخوشگواری کا تجربہ ہو۔ دوسری قوموں کی طرف سے انھیں خواہ کتنا ہی زیادہ مادی نقصان پہنچایا جائے۔ دوسری قوموں کی جانب سے خواہ انھیں کتنا ہی زیادہ اشتعال انگیزی کا تجربہ ہو، ان سب کے باوجود انھیں دوسری قوموں کا غیر خواہ بنے رہنا ہے۔ انھیں ایک طرفہ طور پر تمام ناخوشگوار باتوں کو صبر کے خاندن میں ڈال دینا ہے۔

ایک طرفہ صبر و دعوت کے عمل کو انجام دینے کی لازمی شرط ہے۔ اس ایک طرفہ صبر کے بغیر مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دوسری قوموں پر اپنی دعوتی ذمہ داری کو ادا کر سکیں۔ اور جب تک مسلمان اپنی دعوتی ذمہ داری کو انجام نہ دیں، ان کے حالات کبھی بدلتے والے نہیں۔ کوئی دوسرا عمل خواہ کتنی ہی زیادہ چڑی مقدار میں کیا جائے، وہ ان کے احوال کو بدلنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اتنی سنگین ہے کہ اس میں معمولی کوتاہی بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ناقابلِ متوجہ ہے، لہذا اس کو مستقل طور پر ترک کر دیا جائے۔

یہ معاملہ سیدنا یونس علیہ السلام کی مثال سے بخوبی طور پر واضح ہے۔ حضرت یونس قدس سرہ عراق (نینوا) میں دعوت کو مید کے لئے بھیجے گئے۔ انھوں نے اہل نینوا کو دعوت دی۔ مگر ابھی دعوت کا عمل اپنی تکمیل (تمام) حجت تک نہیں پہنچا تھا کہ وہ قوم کو چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ روش پسند نہیں آئی۔ ان کو مچھلی کے پیٹ میں ڈال دیا گیا۔ قرآن کا بیان ہے کہ اگر وہ اپنی کوتاہی کا اقرار کر کے دوبارہ اپنی مخاطب قوم کی طرف ہانکے لئے تیار نہ ہوتے تو وہ قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہتے (الصافات ۱۱۳) موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ انھوں نے اپنی مدعو اقوام پر دعوت کا عمل سرے سے انجام نہیں دیا۔ بلکہ اپنی نفرت بڑھانے والی سرگرمیوں کے ذریعہ اس کی راہ میں مزید رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اس غفلت کے نتیجہ میں وہ خدا کی گرفت میں آگئے ہیں۔ وہ آج خدا کے عتاب کی زد میں ہیں۔ وہ تمام زیادتیوں جن کا تجربہ انھیں دوسری قوموں کی طرف سے ہوا ہے اور جس کو وہ دوسری قوموں سے منسوب کر کے ان کے فسوف احتجاج یا ٹکڑاؤ کر رہے ہیں، وہ سب یقینی طور پر خدا کی طرف سے ہیں۔ یہ خدا کی تنبیہ ہے نہ کہ دوسری قوموں کا ظلم یا سادھش۔

معاملہ کی اس نوعیت کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ ایک معاملہ جو خدا کی طرف سے ہو، اس کو آپ انسان کی طرف سے سمجھیں تو آپ اس سے خلاصی کی تدبیر کو بھی صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ اپنی آخری صورت میں عین وہی ہے جو اپنی اہمیت ذاتی صورت میں بلاشبہ حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آج دنیا بھر کے مسلمان "مسائل کے پیٹ" میں ہیں۔ ان کو مسائل کی عظیم پھیل نے نگل رکھا ہے۔ ان کو فالتقہ الحوت کا تجربہ کرایا جا رہا ہے۔ مسلمان اس پیٹ سے ہرگز نکل نہیں سکتے جب تک وہ دعوت الی اللہ کے معاملہ میں اپنی کوتاہی کی تلافی نہ کریں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ اس فدائی کام کے لئے اٹھیں اور اس کو اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ انجام دیں۔ وہ اس وقت تک عین سے نہ چھٹیں جب تک توام عالم پر خدا کی رحمت پوری نہ ہو جائے۔

اگر مسلمانوں نے اپنی اس کوتاہی کی تلافی نہ کی تو وہ قیامت تک مسائل کے بطن (پیٹ) میں پڑے رہیں گے۔ کوئی دوسرا عمل، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی اچھا ہو اور کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں کیا جائے، انہیں اس گرفتاری سے نجات دینے والا نہیں۔ جب گرفتاری کے اس معاملہ کا سبب دعوتی کوتاہی ہے تو دوسرا عمل کیوں کر انہیں اس گرفتاری سے نکلانے والا بن سکتا ہے۔

دوڑنے والوں کو خدا کی طرف دوڑنا چاہئے۔ اگر وہ انسانوں کی طرف دوڑتے رہے تو وہ انسانوں کو بھی کھو دیں گے، اور خدا کو تو وہ پہلے ہی سے کھوئے ہوئے ہیں۔

اصل قابل لحاظ بات یہ نہیں کہ ہمارے نزدیک کس چیز کی اہمیت ہے۔ اصل قابل لحاظ بات یہ ہے کہ خدا کے نزدیک کس چیز کی اہمیت ہے۔ ہم بطور خود کسی چیز کو اہم سمجھ کر اس کی طرف دوڑنے لگیں تو اس سے ہماری نجات ہونے والی نہیں۔ ہماری نجات کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اپنے ذاتی دائرہ سے اوپر اٹھیں اور بے آمیز ذہن کے تحت خدا کی مرضی کو معلوم کریں۔ اور پھر خدا کی جو مرضی ہے اس پر اپنی تمام کوششوں کو ڈال دیں۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ ہم کو کامیابی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔

خدا کے نزدیک ان قومی مسائل کی کوئی اہمیت نہیں جن کو خود مسلم رہنماؤں نے اپنی نادانی سے پیدا کیا ہے اور اب انہیں کو سب سے اہم بتا کر ان میں الجھے ہوئے ہیں۔ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو نوعیت حیات سے باخبر کیا جائے۔ زندگی کے بارہ میں خدا کا جو منصوبہ ہے اس سے کوئی شخص غافل نہ رہے۔ تاکہ قیامت میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم توبہ نہ کرتے۔

پاکستان کی مثال لیجئے۔ اہل پاکستان نے دوسری قوم کے ظلم اور تعصب سے بچنے کے لیے
 علمدگی کی سیاست چلائی۔ مگر علمدگی کے بعد وہ اور بھی زیادہ ظلم اور تعصب میں پھنس کر رہ گئے۔

۱۹۴۷ میں پاکستان بنا تو پاکستان کے بانی مسٹر محمد علی جناح نے اس کو کٹا پھٹا پاکستان
 (Truncated Pakistan) قرار دیا۔ یہ کٹا پھٹا پاکستان بھی ۱۹۷۱ میں دو ٹکڑے ہو گیا۔ پاکستان کے
 لیڈروں کا کہنا تھا کہ جو ناگزیر، حیدرآباد اور کشمیر، یہ سب پاکستان کے حصے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی ایک
 کو بھی وہ حاصل نہ کر سکے، حتیٰ کہ باقاعدہ لڑائی کے بعد بھی نہیں۔

پاکستان کے قیام کو تقریباً پچاس سال ہو رہے ہیں، مگر آج تک وہاں کوئی متفقہ دستور نہیں بنا۔
 کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ اس دوران پاکستان کے کئی لیڈر قتل یا ہلاک ہو چکے ہیں۔ جب بھی ایسا
 کوئی واقعہ یا اس قسم کا کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو پاکستان کے دانشور فوراً یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ روس یا
 امریکہ یا بھارت کی سازش کے نتیجے میں پیش آیا۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کہہ کر وہ اعتراض کر رہے ہیں
 کہ پاکستان اگرچہ بن گیا، مگر اب بھی کوئی "پھیل" اس کو نکلے ہوئے ہے۔ اور وہ پاکستان کو ابھرنے نہیں
 دیتی۔ یہ توجیہ خود پاکستان کی منطق کو غلط ثابت کر رہی ہے۔ مسٹر محمد علی جناح نے کہا تھا کہ میں نے
 پاکستان کی صورت میں اسلام کا ایک قلعہ بنایا ہے۔ پھر وہ کیسا قلعہ ہے جہاں اسلام کو داخل
 حفاظت بھی حاصل نہ ہو۔

یہ صورت حال بے حد غور طلب ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ "قائد اعظم" کی سیاست، مولانا اشرف علی
 تھانوی کی دعائیں، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی رہنمائی، مرد مومن ضیاء الحق کا طویل
 اور مطلق اقتدار، اور اس طرح کی دوسری بہت سی مادی اور معنوی ساداتوں کو حاصل کرنے کے باوجود
 پاکستان تباہ حال ہے۔ اسلام کا منار بننا تو درکنار، وہ اسلام کی زیر زمین بنیاد بھی نہ بن سکا۔

اس کا جواب، ایک لفظ میں یہ ہے کہ، پاکستان خدا کی سنت کے خلاف بنا۔ اور جو چیز خدا کی سنت
 کی خلاف ورزی کر کے بنائی جائے، وہ اس دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

پاکستان کے رہنا پاکستان کے قیام کو "ہجرت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے جب
 پاکستان کی تحریک چل رہی تھی، پاکستانی مفکرین زور و شور کے ساتھ اس کے حق میں یہ قرآنی دلیل پیش
 کر رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے مطالبہ کیا تھا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ

یعنی ہم کو اجازت دو کہ ہم بنی اسرائیل کو لے کر علیحدہ خط میں چلے جائیں۔ اسی طرح ہم بھی انگریزوں اور ہندوں سے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

مگر یہ استدلال صرف ایک بے جا جھڑپ ہے۔ کیوں کہ ہجرت، دعوت کے بغیر جائز نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو علیحدہ خط میں لے جانا، یا دوسرے پیغمبروں کا اپنے وطن سے ہجرت کرنا ایک داعیانہ فعل تھا نہ کہ کوئی قومی فصل۔ وہ دعوت الی اللہ کے اگلے مرحلے کے طور پر عمل میں لایا گیا نہ کہ قومی اور سیاسی نزاع کے طور پر پیش آیا۔

ہندستان کی شرعی صورت حال یہ ہے کہ ہندو قوم مسلمانوں کے لیے مدعو قوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندو کے سلسلہ میں مسلمانوں کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ ہندو کی طرف سے پیش آنے والی تہامیں اور زیادتیوں کو ایک طرف طور پر برداشت کرتے ہوئے دعوتی عمل کو جاری رکھیں ہندوؤں کی طرف سے بدخواہی کا معاملہ کیا جائے تب بھی وہ آخری حد تک ہندوؤں کے خیر خواہ بنے رہیں۔ دعوت کا کام جب تک تکمیل یا اتہامِ حجت کے مرحلے تک نہ پہنچ جائے۔ اس وقت تک مسلمانوں کے لیے صرف صبر و اعراض ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

تیلینی جماعت مسلمانوں کے درمیان اصلاح کا کام کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالفین کی طرف سے خواہ کتنا ہی زیادہ برا سلوک کیا جائے، وہ اپنے طے شدہ اصول کے مطابق ایک طرف طور پر صبر کے طریقہ پر قائم رہتے ہیں۔ وہ زیادتی کرنے والوں کے حق میں صرف دعا کرتے ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہی ایک طرف صبر و اعراض کا طریقہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے سلسلہ میں بھی اختیار کرنا ہے۔ موجودہ حالت میں اس کے سوا کوئی بھی دوسری روش مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔ موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کو دعوت تو نہ دی، البتہ ان کے تمام اصافرو اکابر نصف مدی سے اس قسم کی دعائیں کرنے میں مشغول ہیں کہ: **اللہم قم اھلک الکفرۃ و المشرکین**۔ دعوت سے پہلے مدعو کے خلاف اس قسم کی دعا امر سنت الہی کے خلاف ہے، اس لیے وہ ہرگز قبول ہونے والی نہیں۔ خواہ ہمارے تمام اعظم و اکابر جمع ہو کر اس دعا پر باواؤ بند آئیں کہہ رہے ہوں۔

پاکستان کی تحریک چلانے والوں نے ثابت شدہ طور پر اپنی دعوتی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔

خدا کے حکم کے مطابق، انہوں نے ہندو قوم کو اسلام کی طرف دعوت نہیں دی اور نہ دعوتی عمل کو تکمیل (اتہامِ جہت) کے مرحلے تک پہنچایا۔ اس کے برعکس وہ آفاذہبی میں جغرافیائی تقسیم کا مطالبہ لے کر کھڑے ہو گئے۔ ایسی تحریک کا یقینی طور پر ہجرت کے سترہویں اصول سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ہجرت ہمیشہ دعوت کے بعد ہوتی ہے۔ دعوت سے پہلے ہجرت کے طریقہ پر عمل کرنا مرے سے جائز ہی نہیں۔

اس معاملہ میں حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ایک رہنما مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام شہر نینوا (Nineveh) کی طرف بھیجے گئے۔ یہ قدیم اسیریا کا ایک شہر تھا۔ بابل کے بیان کے مطابق وہاں کی آبادی ایک لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اہل نینوا کو توحید کی طرف دعوت دی۔ مگر انہوں نے سرکشی دکھائی۔ ان کی مخالفت اور سرکشی کے باوجود حضرت یونس علیہ السلام نے ان پر دعوتی عمل جاری رکھا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت یونس علیہ السلام نے بطور اجتہاد یہ سمجھا کہ اہل نینوا پر اتہامِ جہت ہو گیا ہے، اور اب وہ لمننے والے نہیں ہیں۔ اس خیال کے تحت وہ نینوا سے ہجرت کر کے چلے گئے۔

قرآن میں یہ قصہ محل طور پر اور بابل میں نسبتاً مفصل طور پر موجود ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک سمندری سفر کے دوران حضرت یونس کو ایک بڑی مچھلی (غالباً وہیل) نے نگل لیا۔ وہ کئی ہفتے تک اسی طرح مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ انہیں احساس ہوا کہ ان سے اجتہادی کوتاہی ہو گئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں وہ دعا کی جو سورہ الانبیاء (آیت ۸۷) میں موجود ہے۔ بابل کے مطابق، حضرت یونس نے خداوند اپنے خدا سے کہا کہ میں حمد کرتا ہوں کہ میں اپنی نذر میں ادا کروں گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں مچھلی کے پیٹ سے خلاصی عطا فرمائی۔ بابل میں ہے :

”اور خداوند کا کلام دوسری بار یوناہ پر نازل ہوا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوا کو جا اور وہاں اس بات کی منادی کر جس کا میں تجھے حکم دیتا ہوں۔ تب یوناہ خداوند کے کلام کے مطابق اٹھ کر نینوا کو گیا۔ یوناہ شہر میں داخل ہوا۔ اس نے منادی کی اور کہا کہ چالیس روز کے بعد نینوا برباد ہو جائے گا۔ تب نینوا کے باشندوں نے خدا پر ایمان لاکر روزہ کی منادی کی۔ اور ادنیٰ اور اعلیٰ سب نے ٹاٹ اوڑھا۔ یہ خبر نینوا کے بادشاہ کو پہنچی۔ وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس کو آڑ ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ کے فرمان سے نینوا میں یہ اعلان کیا گیا کہ سب خدا کے حضور گریہ و فزاری کریں۔

ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے۔ شاید نعدارحم کرے اور اپنا ارادہ بدلے اور اپنے
 قہر شدید سے باز آئے۔ اور ہم ہلاک نہ ہوں۔ جب خدا نے ان کی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی بری روش سے
 باز آئے تو وہ اس عذاب سے جو اس نے ان پر نازل کرنے کو کہا تھا باز آیا اور اسے نازل نہ کیا (یوناہ)

حضرت یونس خدکے پیغمبر تھے۔ اس کے باوجود ان کا قبل از وقت اپنی قوم سے ہجرت کرنا
 خدا کو پسند نہ آیا۔ حتیٰ کہ انہیں دوبارہ اپنی قوم کی طرف واپس آنا پڑا۔ اب کیا پاکستان کے لوگوں کا
 درجہ پیغمبروں سے بھی زیادہ بڑھا ہوا ہے کہ ان کی بلا سبب اور قبل از وقت ہجرت اللہ تعالیٰ کے یہاں
 قبول ہو جائے اور ان پر رحمتوں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل پاکستان کے
 لیے سببات کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ وہ حضرت یونس کی طرح دوبارہ اپنی ہجرت سے
 رجوع کریں۔ جس مدعو قوم کو انہوں نے دعوت کے بیڑ چھوڑا تھا، اس کی طرف واپس آکر دوبارہ وہی کلام
 کریں جو حضرت یونس نے کیا، یعنی انہیں دعوت الی اللہ کا مخاطب بنانا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا اہل
 اہل پاکستان کو سببات دینے والا نہیں، خواہ وہ اسلام کے خوشنام سے کیوں نہ انجام دیا گیا ہو۔

تاہم واپسی کا یہ عمل اپنی حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہے نہ کہ اپنی ظاہری صورت کے اعتبار
 سے۔ یعنی اہل پاکستان کو حضرت یونس کی طرح ارضی اور جزائی واپسی کی ضرورت نہیں۔ ان سے جو واپسی
 مطلوب ہے وہ فکری اور مزاجی واپسی ہے۔

اہل پاکستان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے سابقہ مزاج کو ختم کریں جس کے نتیجہ میں انہوں نے
 ہندوؤں سے بے جانفرت شروع کر دی، اور جو آج تک ان کے عوام اور ان کے تلامذہ اور علماء
 میں آخری حد تک موجود ہے۔ وہ ہندو قوم کو حریف کے بجائے مدعو کی نظر سے دیکھیں۔ وہ ہندو قوم سے
 صلوات کے بجائے محبت کا طریقہ اختیار کریں۔ ہندو قوم کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں کو یک طرفہ
 طور پر برداشت کریں۔ ہندو قوم سے اپنے تمام مادی نزاعات کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں، خواہ وہ ان کی
 اپنی نظر میں کتنے ہی زیادہ اہم کیوں نہ ہوں۔

حضرت یونس علیہ السلام دوبارہ اللہ کی رحمت کے مستحق اس وقت ہوئے جب کہ انہوں نے
 اپنی مدعو قوم کی طرف ارضی مراجعت کی۔ اسی طرح اہل پاکستان بھی اللہ کی رحمت کے مستحق صرف اس
 وقت ہو سکتے ہیں جب کہ وہ اپنی مدعو قوم کی طرف فکری اور جذباتی مراجعت کریں۔ اس کے سوا کوئی بھی

دوسری تدبیر پاکستان کو نجات دینے والی نہیں۔

پاکستان پچھل نصف صدی سے مختلف مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ وہ خارجی مسئلہ سے بچنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ مگر بننے کے بعد وہ شدید تر انداز میں مختلف خارجی اور داخلی مسائل کے اندر گھبر گیا۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی واقعہ ہے جو حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی طرح پاکستان آج "مچھلی کے پیٹ" میں ہے۔ لایعنی مسائلی نے اس کو پوری طرح گھبر لیا ہے۔ اب اس کو حضرت یونس کے انداز میں مراجعت کرنا ہے۔ اگر اس نے مراجعت کے اصول پر عمل نہ کیا تو وہ قیامت تک اسی طرح "مچھلی کے پیٹ" میں پڑا رہے گا، کوئی بھی دوسری تدبیر اس کو اس قید سے خلاص دینے والی نہیں۔

پاکستان کے لوگ پرفور طور پر پاکستان کو "مملکت خداداد" کہتے ہیں۔ یہ محض خوش فہمی ہے۔ پاکستان پاکستانیوں کی اپنی خواہش کا منظر ہے نہ کہ خدا کی رضا کا منظر۔ زیادہ صحیح طور پر پاکستان کا قیام اس قرآنی آیت کی تصویر ہے: **وَذَٰلَٰلِئِنَّ اِذْ ذَٰہَبَ مَغَاصِبًا فَنُظِنُ اَنَّ لَکُمْ نَفْسًا عَلَیْہِ (الانبیاء ۸۷) قرآن کے مطابق، برصغیر ہند کے مسلمانوں کا پاکستان کی صورت میں ایک ملک بنا کر الگ ہو جانا ذہاب مغاصب کا واقعہ ہے نہ کہ وہ واقعہ جس کو تشریح میں ذہاب الی الرب (الصافات ۹۹) کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ان کے حوصلوں کی تکمیل نہ بن سکا۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد اہل پاکستان "مچھلی کے پیٹ" میں چلے گئے، پاکستان کو مسائل کے عزیمت نے نکل لیا۔**

قرآن میں صراحتاً یہ بات بتائی گئی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اگر مراجعت پر راضی نہ ہوتے تو وہ قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے، اور انھیں کبھی اس سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ تشریح کی سورہ نمبر ۲۷ میں ارشاد ہوا ہے:

"اور بے شک یونس رسولوں میں سے تھے۔ جب کہ وہ سجاگ کر بھری ہوئی کشتی پر پہنچے پھر قرعہ ڈالا تو وہی خطا وار نکلے۔ پھر ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اور وہ اپنے کو ملامت کر رہے تھے۔ پس اگر وہ توبہ کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن (قیامت) تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔ پھر ہم نے ان کو ایک میدان میں ڈال دیا۔ اور وہ اس وقت نڈھال تھے اور

ہم نے ان پر ایک سیل دار درخت اگا دیا۔ اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا۔ پھر وہ لوگ ایمان لائے تو ہم نے ان کو فائدہ اٹھانے دیا ایک مدت تک (الصفات ۴۸ - ۱۳۹) مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونس کی جس تسبیح کا یہاں ذکر ہے، وہ ان کی وہ دعا تھی جو سورہ الانبیار (آیت ۸۷) میں بتائی گئی ہے (لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ) سنت الہی کے مطابق یہ مطلوب تھا کہ قوم کے انحراف اور ایذا رسانی کے باوجود آئینہ اپنی قوم کے درمیان ٹھہریں، یہاں تک کہ تکمیل دعوت کا مرحلہ آجائے۔ مگر انھوں نے قبل از وقت اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ مگر ان کے اس عمل نے جب انھیں مچھلی کے پیٹ میں پہنچایا تو اس وقت انہیں احساس ہوا کہ مجھ سے کوتاہی ہو گئی۔ یہی احساس تھا جو مذکورہ دعا کی شکل میں ان کی زبان پر جاری ہو گیا۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ ایک سچے داعی کا جذبہ لے کر دوبارہ اپنی قوم کی طرف جائیں۔ اس کے بعد حکم الہی کے تحت وہ مچھلی کے پیٹ سے باہر آ گئے۔ اور پھر اپنی قوم میں دوبارہ واپس جا کر اللہ کے حکم کی مستادی کی۔

یہی تاریخ اہل پاکستان کو دہراتا ہے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ ہندو قوم کی طرف داعی خیر خواہی کا جذبہ لے کر واپس لوٹیں۔ ایک طرف مستربانی کے ذریعہ ہندو اور ہندوستان سے اپنے تعلقات کو خوش گوار بنائیں۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو وہ قیامت تک "مچھلی کے پیٹ" میں پڑے رہیں گے، وہ کبھی اس قید اور مغلوبیت سے نکل نہیں سکتے۔

اسلام کی دعوت بدلتی ہوئی دنیا میں

خدا کے جن قوانین کے تحت موجودہ دنیا چلائی جا رہی ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے — اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع ذکر تار ہے تو خائفاتیں اور گرہا اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں خدا کا نام کثرت سے لے لیا جاتا ہے، ڈھانڈے جاتے۔ اور خدا ضرور اس کی مدد کرے گا جو خدا کی مدد کرے۔ بے شک خدا زبردست ہے، زور والا ہے (۴۰/۲۲)

خدا کے اس قانون کا انہماک انسانی زندگی میں مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ مثلاً اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اس کا ایک نمایاں اظہار اس طرح ہوا کہ وقت کی دو بڑی جہاں براہِ سلفستوں — رومی شہنشاہیت اور ساسانی شہنشاہیت کو توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد اشاعتِ حق کے جو آزادانہ مواقع کھلے، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام اس وقت کی آباد دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں پھیل گیا۔

یورپ میں صنعتی دور آنے کے بعد نوآبادیاتی نظام (Colonialism) دنیا پر چھایا۔ اس نے دو بارہ، اگرچہ نسبتاً کم تر شدت کے ساتھ، انسانی دنیا میں جبر کی صورت حال پیدا کر دی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آیا۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹-۴۵)، پیش آئی۔ اس کے نتیجے میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتیں بے حد کمزور ہو گئیں اور آخر کار اس نظام کا خاتمہ ہو گیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون دفع کا ایک نمایاں اظہار حالیہ برسوں (۱۹۸۹-۹۰) میں ہوا ہے۔ اس بار اس قانون کا نشانہ کیونسٹ ایپارٹھائیڈ کیونسٹ روس میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کئے کہ بظاہر ناقابل شکست سوویت ایپارٹھائیڈ گئی۔ اس طرح اشاعتِ حق کی آخری دکاوت کبھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ بظاہر اب اس قسم کا نظام جبر دوبارہ دنیا میں آنے والا نہیں۔

مصلحت خداوندی

موجودہ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ امتحان کی مصلحت کا لازمی تقاضا ہے کہ دنیا میں آزادی کا ماحول ہو۔ یہاں ہر آدمی کے لئے فمن شاد فلیؤمن ومن شاد فلیکفر

(اہکف ۲۹) کا موقع باقی رہے۔

ایسی حالت میں دنیا کے اندر جبر کا نظام قائم کرنا براہ راست مصلحت خداوندی کے خلاف ہے۔ کوئی شخص جب کسی علاتے میں جبر کا نظام قائم کرتا ہے تو گویا وہ خدا کے قائم کئے ہوئے نظام میں مداخلت کرتا ہے۔ خدا ایسے شخص یا گروہ کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ وہ ایسے لوگوں سے طاقت چھین کر انہیں باہر پھینک دیتا ہے۔

کچھ لوگ جہاد (بمعنی قتال) کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس کا مقصد موانع دعوت کو ہٹانا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ جہاد (بمعنی قتال) صرف دفاع کے لئے ہوتا ہے۔ جہاں تک موانع دعوت کا تعلق ہے وہ خود خدا کی طرف سے ہٹائے جاتے ہیں۔ موانع دعوت خدا کا مسئلہ ہے، وہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ ہمارا مسئلہ دعوت پہنچانا ہے، اگر ہم دعوت پہنچانے کا کام کریں تو خدا کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ وہ ضرور موانع دعوت کا خاتمہ کر دے گا۔

بائبل کی پیشین گوئی

بائبل میں اسرائیلی پیغمبر کی زبان سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ — وہ کھڑا ہوا اور زمین تیرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پر اگت مدہ ہو گئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہو گئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں (حقوق ۳ : ۶) :

وقف وفاسم الارض۔ نظرفرجف الامم وکذکت الجبال الدهر بة ونخسف
آکامم الیتدم۔ مسالک الازل له (حقوق ۳ : ۶)

اس پیشین گوئی کا تعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس میں "ازلی پہاڑ" اور "قدیم ٹیلے" سے مراد رومی اور ساسانی سلطنتیں ہیں۔ یہ سلطنتیں جبر پر قائم تھیں۔ انہوں نے قدیم زمانہ میں چیز پید ا کر رکھی تھی جس کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے۔ اور جس کو ہنری پیرین (Henri Pirenne) نے شاہانہ مطلقیت (Imperial absolutism) سے تعبیر کیا ہے۔ اس شاہانہ مطلقیت نے قدیم زمانہ میں دعوت حق کے نام مواقع ختم کر دیے تھے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اللہ تعالیٰ نے عرب طاقت کے ذریعہ ان شہنشاہتوں کو توڑ دیا۔

اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار آزاد اداؤں اور وفکر کا دور شروع ہوا۔ اس طرح وہ حالات پیدا

ہوئے جبکہ اہل حق آزادانہ طور پر خدا کے دین کی تبلیغ کریں اور لوگ آزادانہ غور و فکر کے تحت اس کو قبول کر لیں۔

دور جدید کا نظام جبر

موجودہ زمانہ میں مذکورہ قسم کی شاپاہد مطلقیت دوبارہ نئی صورت میں قائم ہو گئی۔ یہ وہ نظام جبر ہے جو کمیونسٹ نظریہ کے تحت سوویت یونین میں ۱۹۱۷ء میں قائم ہوا۔ یہ جاہل نظام دوبارہ شدید تر صورت میں دعوت حق کی راہ میں مانع بن گیا۔ بیسویں صدی کے اس نظام جبر میں تاریخ کی سب سے بڑی طاقت کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی کہ خدا اور مذہب کو آخری حد تک انسانی زندگی سے مٹا دیا جائے۔

مگر دوبارہ خدا کا قانون دفع حرکت میں آیا۔ خدا نے اپنی برتر مدخلت کے ذریعہ اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سوویت یونین، مائٹ میگزین ۱۲ مارچ ۱۹۹۰ء کے لفظوں میں، سوویت ڈس یونین (Soviet Disunion) بن گیا۔

مارکسزم کا خاتمہ

۱۹۵۸ء میں راقم الحروف نے ایک کتاب لکھی تھی، اس کا مائٹل تھا؛ مارکسزم، تاریخ جس کو رد کر چکی ہے۔ اس وقت لوگوں کو یہ مائٹل بڑا عجیب معلوم ہوا تھا، مگر آج ۱۹۹۰ء میں ساری دنیا کے اخبارات و رسائل میں ایسے مضامین چھپ رہے ہیں جن کی سرخنی اس قسم کی ہوتی ہے :

The Collapse of Socialist system
Soviet Empire is Crumbling
The End of Communist History
Marxism is Over
Total Failure of Communism
Fragmented Empire of the U.S.S.R.

ہندستان مائٹس ایکم جنوری ۱۹۹۰ء نے کسی مغربی اخبار سے ایک کارٹون نقل کیا تھا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک ویران قبرستان ہے۔ اس کے ایک طرف کارل مارکس کی قبر بنائی گئی ہے۔ قبر کے اوپر ایک پتھر لگا ہوا ہے۔ اس پتھر پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے :

Marx: Finally buried 1989

اسی طرح ہندوستان کے دوسرے انگریزی اخبار ٹائٹس آف انڈیا (۱۳ مئی ۱۹۹۰) نے اپنے پہلے صفحہ پر ایک کارٹون چھاپا تھا۔ اس میں ایک گلوب ہے جس میں دنیا کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ اس گلوب کے سامنے روسی لیڈر مشر گور باچیف آتشیں شیشہ (magnifying glass) لئے ہوئے کھڑے ہیں اور اس کے نقشہ میں اپنا ملک سماش کر رہے ہیں۔ آخر کار وہ اپنی بیوی سے کہہ اٹھتے ہیں کہ رئیس، وہ یہاں ہے، میں نے اس کو پایا، سوویت یونین:

Raisa, It's here! I found it – the Soviet Union!

سوویت یونین میں ہونے والے اس انقلاب کا کریڈٹ ٹائم مگکین نے مینائیل گور باچیف کو دیا ہے۔ اس نے اپنا شمارہ یکم جنوری ۱۹۹۰ء استثنائی طور پر گور باچیف نمبر کے طور پر نکالا ہے اور گور باچیف کو دہے کی شخصیت (Man of the Decade) قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ گور باچیف نے دنیا کو بدل دیا:

Gorbachev has transformed the world (p. 14).

اس میں شک نہیں کہ سوویت یونین میں جو انقلابی واقعہ ہوا، اس کو ظہور میں لانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے گور باچیف کو وسیلہ بنایا ہے۔ اس معاملہ میں زیادہ بڑے پیمانہ ان کا وہی درجہ ہے جو فرانس کے جنرل ڈیگال کا تھا۔ ڈیگال نے حالات کا اعتراف کرتے ہوئے فرانس کے افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا۔ اسی طرح مینائیل گور باچیف نے اندوئی اور بیرونی حالات کا اعتراف کرتے ہوئے سوویت روس میں انقلاب کے بند دروازے کھول دیئے۔ اس سلسلہ میں ٹائم کا یہ ریکارڈ بہت ہامنی ہے کہ گور باچیف ایک ماہر سیاست دان ہیں۔ وہ بہت سے ملکوں میں الیکشن جیت سکتے ہیں مگر غالباً خود اپنے ملک میں نہیں:

A master politician, Gorbachev could win election in many countries, but probably not his own.

سوویت روس میں لانے جانے والے اس انقلاب کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک اہم پہلو وہ ہے جو مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ کمیونسٹ حکومت کے قیام (۱۹۱۷ء) کے بعد پورے سوویت روس میں مذہب پر مکمل پابندی مائد کر دی گئی تھی۔ اسی طرح اسلام بھی وہاں محسوس ہو کر رہ گیا تھا۔

ہزاروں مسجدیں اور مدرسے بند کر دئے گئے۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ اسلامی تعلیم یا اسلامی سرگرمیاں جرم قرار پائیں۔ مگر نئے انقلاب نے دوبارہ سوویت روس میں اسلامی سرگرمیوں کے دروازے کھول دئے ہیں۔

اسلام کا دور

سوویت روس میں عبادت خانے بند کر دئے گئے تھے۔ مذہب کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے ایک مستقل حکم قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ سوویت روس سے مکمل طور پر مذہب کے خاتمہ کی تدبیر میں اختیار کرے۔ مگر آج یہ تمام چیزیں عملاً ختم ہو چکی ہیں۔

سوویت روس میں اب ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی ہیں۔ اسلامی لٹریچر شائع کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۰ میں وہاں سے ایک اسلامی جریدہ "نور الاسلام" کے نام سے نکالا گیا ہے۔ روسی حکومت کی منظوری کے تحت خود روس کی ہوائی کمپنی ایروفلٹ نے قرآن کے ایک ملین نسخے جدہ سے ماسکو پہنچائے ہیں، جب کہ اس سے پہلے قرآن کا ایک نسخہ بھی روس کے اندر لے جانا ممنوع تھا۔

کیونرٹ انقلاب کے بعد سوویت روس میں حج کا سفر بند کر دیا گیا تھا۔ اب خود سوویت پوٹین کے صدر میخائیل گورباچیف نے روسی ایئر لائن ایروفلٹ کو ہدایت کی ہے کہ وہ روسی حاجیوں کو عرب پہنچانے کا خصوصی انتظام کرے اور اس مقصد کے لئے ماسکو، تاشقند، ہاکو، تاتار، قازان اور دوسرے بڑے روسی شہروں سے جدہ تک براہ راست پروازیں جاری کرے۔ اسی کے ساتھ گورباچیف نے روسی وزیر خراجہ سے کہا ہے کہ سوویت روس سے جو مسلمان حج کے لئے جانا چاہیں، ان کے لئے سہولت دینا جاری کیا جائے۔

سوویت روس میں اسلام کے لئے جو نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں، ان کے سلسلے میں یہ چند باتیں بطور مثال ہیں ذکر بطور حصر۔ انہیں چند مثالوں سے بقیہ باتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کارل مارکس نے اپنی ایک تقریر میں مذہب کے خلاف نہایت سنت ریمارک دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ مذہب عوام کی افیون ہے:

مگر آج خود کیونسٹ روس میں ایسے اہل علم پیدا ہو چکے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مارکسزم خود بدترین قسم کی ذہنی انیون تھی۔ مارکس خود اس انیون میں مبتلا ہو اور دوسرے بہت سے لوگوں کو اس میں مبتلا کیا۔ اسٹالن نے روس کے ۲۵ ملین انسانوں کو یا تو ہلاک کر دیا یا انہیں سخت ترین سزائیں دیں۔ اس کے باوجود وہ کیونسٹ نظام کو مستحکم نہ کر سکا۔

۵۰ ماہ میگزین نے اپنے شمارہ ۱۲ مارچ ۱۹۹۰ میں سوویت روس کے بارہ میں ایک مفصل رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نئے انقلاب کے بعد اب روس میں مذہب کی حیثیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کا بھی تفصیلی حال درج کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ روس کے تقریباً ۵۵ ملین مسلمان نئی مذہبیں رواداری کا فائدہ حاصل کر رہے ہیں :

Some 55 million Soviet Muslims enjoy the fruits of new religious tolerance.

اس باتصویر رپورٹ کی سرخی نہایت بامعنی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں — کارل مارکس محمد کے لئے جگہ خالی کرتا ہے:

Karl Marx makes room for Muhammad

کیسا عجیب ہے یہ انقلاب جو تاریخ انسانی میں پیش آیا ہے۔
آزاد دنیا میں دور خاتمیت

یہ وہ صورت حال ہے جو دوسری دنیا (second world) میں پیش آئی۔ اسی طرح پہلی دنیا (first world) میں بھی ایک اور انداز سے دور رس تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور یہ تبدیلیاں بھی مین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں۔ ان تبدیلیوں نے مغربی دنیا میں موانع دعوت کا حصار توڑ کر وہاں دعوت کے نئے وسیع تر امکانات کھول دئے ہیں۔

امریکہ کے دانشور طبقہ میں پچھلے چند برسوں میں ایک نیا فکری پیدا ہوا ہے۔ اس فکر کو خاتمیت (endism) کا نام دیا گیا ہے۔ "آزاد دنیا" نے حیرت انگیز طور پر اپنی تہذیب میں اپنے سابقہ یقین کو کھودیا ہے۔

لامحدود آزادی کا نظریہ حقائق فطرت سے ٹکرا گیا۔ صنعتی ترقی کے مسائل نے دنیا میں جنت

تعمیر کرنے کے خواب کو بر باد کر دیا۔ جاپان کی غیر متوقع اقتصادی طاقت نے مغرب کی نوجوبی طاقت کو غیر موثر بنا دیا۔ انسانی ساخت کے تمام نظریات اپنے تجربہ میں غیر معتبر قرار پا گئے۔ ادوی ترقیاں انسان کی روح کو مطمئن کرنے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ وظیفو

ناکامیوں کی اس فہرست میں سب سے اہم اور دور رس نتائج والی ناکامی وہ ہے جو فکری سطح پر پیش آئی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اہل مغرب نے یہ یقین کر لیا تھا کہ ان کی سائنس ان کے لئے اہمائی مذہب کا بدل ہے۔ سائنس فکری اعتبار سے انھیں وہ سب کچھ دے سکتی ہے جس کی امید مذہب سے کی جاتی ہے۔ مگر موجودہ صدی کے آخر میں پہنچ کر اصل سائنس نے آخری طور پر اپنے اس یقین کو کھو دیا ہے۔ اب انسان دوبارہ وہاں کھڑا ہے جہاں اس کو فکری اعتقاد اور نظریاتی یقین کے لئے دوبارہ اسی چیز کی ضرورت ہے جس کو مذہب کہا جاتا ہے۔ سائنس کی اس ناکامی پر موجودہ زمانہ میں کثیر تعداد میں کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں کا مشترک خلاصہ یہ ہے کہ سائنس کی تمام تحقیقات نے اس کو اس مقام پر پہنچایا ہے کہ انسان جو کچھ جاننا چاہتا ہے، وہ اس کو سائنس مطالعہ کے ذریعہ نہیں جان سکتا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں انسان نے "انسائیکلو پیڈیا آف نالج" چھاپی تھی، اب موجودہ صدی کے خاتمہ پر وہ ٹائموس جہالت (Encyclopaedia of Ignorance) چھاپ رہا ہے۔

یہاں میں ایک کتاب کا حوالہ دوں گا جو ۱۹۸۹ میں نیو یارک سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے مصنف اسٹیفن ہاکنگ (Stephen W. Hawking) ہیں۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کے پروفیسر ہیں۔ میتھمیٹکس کی یہ چیر نیوٹن کے نام پر قائم کی گئی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آئن سٹائن کے بعد وہ نظریاتی طبیعیات میں سب سے زیادہ ممتاز سائنس دان ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب وقت کی مختصر تاریخ (A Brief History of Time) کو ان سطروں سے شروع کیا ہے:

ایک مشہور سائنس دان اچھے لوگوں کا کہنا ہے کہ بڑے پندرہ برس انے ایک بار فلکیات پر ایک عوامی لکچر دیا۔ اس نے بتایا کہ زمین کس طرح سورج کے گرد گھومتی ہے اور پھر سورج کس طرح ہلکشاں کے مرکز کے گرد گھومتا ہے جو کہ بہت سے ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ لکچر کے آخر میں ایک چھوٹی بوڑھی عورت کمرہ کے پچھلے حصے سے اٹھی اور کہا۔ جو کچھ تم نے ہمیں بتایا وہ لٹو ہے۔ زمین درحقیقت ایک

چھٹی پلیٹ کی طرح ہے اور وہ ایک بڑے کھوے کی پست پتھی ہوئی ہے۔ سائنس داں برتری کے احساس کے تحت مسکرایا اور پھر کہا کہ یہ کھو ا کس چیز کے اوپر ہے۔ خاتون نے کہا کہ نوجوان، تم بہت چالاک ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کھوے کے نیچے کھوا ہے، اور اسی طرح یہ سلسلہ نیچے تک چلا گیا ہے۔ بہت سے لوگ دنیا کی اس تصویر کو مضحکہ خیز سمجھیں گے کہ یہاں کھووں کا ایک لاقتا ہی کھبا قائم ہے۔ مگر ہم کیوں یخیاں کرتے ہیں کہ ہمارا علم اس سے بہتر ہے۔ ہم دنیا کی بابت کیا جانتے ہیں اور کس طرح جانتے ہیں۔ دنیا کہاں سے آئی اور وہ کہاں جا رہی ہے۔ کیا دنیا کا ایک آغاز ہے، اور اگر ایسا ہے تو اس سے پہلے کیا پیش آیا۔ وقت کی نوعیت کیا ہے۔ کیا وہ کبھی ختم ہو جائے گا۔ علم طبیعیات کے عالیہ انکشافات جو نئی حکمت الہی کے ذریعہ ممکن ہوئے ہیں، وہ ان میں سے بعض سوالات کا کچھ جواب دیتے ہیں۔ یہ جواب اُسندہ اتنے ہی بدیہی دکھائی دے سکتے ہیں جتنا کہ زمین کا سورج کے گرد گھومنا یا شاید وہ اتنے ہی مضحکہ خیز نظر آئیں جتنے کہ کھووں کا کھبا۔ صرف وقت ہی اس کے بارہ میں کچھ بتا سکتا ہے:

A well-known scientist (Some say it was Bertrand Russell) once gave a public lecture on astronomy. He described how the earth orbits around the sun and how the sun, in turn, orbits around the center of a vast collection of stars called our galaxy. At the end of the lecture, a little old lady at the back of the room got up and said: "What you have told us is rubbish. The world is really a flat plate supported on the back of a giant tortoise." The scientist gave a superior smile before replying, "What is the tortoise standing on?" "You're very clever, young man, very clever," said the old lady. "But it's turtles all the way down!"

Most people would find the picture of our universe as an infinite tower of tortoises rather ridiculous, but why do we think we know better? What do we know about the universe, and how do we know it? Where did the universe come from and where is it going? Did the universe have a beginning, and if so, what happened before then? What is the nature of time? Will it ever come to an end? Recent breakthroughs in physics, made possible in part by fantastic new technologies, suggest answers to some of these longstanding questions. Someday these answers may seem as obvious to us as the earth orbiting the sun or perhaps as ridiculous as a tower of tortoises. Only time (whatever that may be) will tell.

ایک اور مثال

اسٹیفن ہاکنگ نے اپنی کتاب میں مختلف پہلوؤں سے بحث کر کے دکھایا ہے کہ کائنات نے بے شمار امکانی ڈٹوں میں سے اسی ایک ماڈل کو اختیار کیا ہے جو انسان جیسی مخلوق کی زندگی اور

ترقی کے لئے ضروری تھا۔" کائنات ویسی کیوں ہے جیسی ہم اسے دیکھتے ہیں: ان کے الفاظ میں ، اس سوال کا جواب بالکل سادہ ہے۔ اگر کائنات کسا اور ڈھنگ کی ہوتی تو ہم یہاں موجود ہی نہ ہوتے :

"Why is the universe the way we see it?" The answer is then simple: If it had been different, we would not be here! (p. 131).

انہوں نے بگ بینگ (big bang) نظریہ کا حساب کر کے بتایا ہے کہ اس میں بے شمار ایسے پہلو ہیں جن کے متعلق ماننا پڑتا ہے کہ وہ کسی ناقابل توہیدہ سبب (unexplained reason) کی بنا پر ہوا۔ کیوں کہ معلوم مادی قوانین میں اس کی توہیدہ موجود نہیں۔

مثال کے طور پر انہوں نے بتایا ہے کہ بگ بینگ کے بعد کائنات کی جو توسیع شروع ہوئی اور جو اب تک مسلسل جاری ہے، اس کی توسیع کی شرح (rate of expansion) انتہائی حد تک حسابی (well-calculated) ہے۔ اس توسیع کی شرح رفتار میں اگر ایک سکند کے جزء (fraction) کے بقدر بھی فرق ہوتا تو کائنات اب تک مہندم ہو چکی ہوتی۔

اس قسم کی مختلف تفصیلات دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ بتانا بے حد مشکل ہے کہ کائنات اس خاص طریقہ سے کیوں شروع ہوئی، سو اس کے کہ یہ مانا جائے کہ وہ ایک خدا کا عمل ہے جس نے چاہا کہ وہ ہمارے جیسی مخلوق پیدا کر کے یہاں رکھے :

It would be very difficult to explain why the universe should have begun in just this way, except as the act of a God who intended to create beings like us (p. 134).

کائنات کا سائنٹفک ماڈل تھا فضا کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا مانا جائے۔ خدا کو دمانے کی صورت میں یہ ماڈل ناقابل فہم بن کر رہ جاتا ہے۔

سائنس کی تصدیق

موجودہ زمانہ عقل (reason) کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان ہر چیز کو عقل کے معیار پر پرکھ کر اختیار کرنا چاہتا ہے۔ مگر آج کے انسان نے جب موجودہ مذاہب کو عقل کے معیار پر پرکھا تو اس نے پایا کہ تمام مذاہب کی کتابیں غیر عقلی تعلیمات سے بھری ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر بائبل میں زمین پر انسان کے ظہور کی جو تاریخ دی گئی ہے، اس کے لحاظ سے حساب لگایا جائے تو ۱۹۹۱ میں زمین پر انسان کے ظہور کی مدت ۵۲۷۵۷ سال ہوگی۔ سائنسی نقطہ نظر سے انسانی عمر کا یہ تین مضحکہ خیز ہے۔ مگر اس قسم کی غیر علمی اور غیر تاریخی باتیں تمام مذہبی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

اس میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ قرآن کا ہے۔ قرآن میں اس قسم کی کوئی مثال مطلق طور پر موجود نہیں۔ اس موضوع پر مختلف کتابیں چھپ چکی ہیں۔ فرانس کے ڈاکٹر مورس بوکانی (Dr Maurice Bucaille) کی مشہور کتاب (The Bible, the Qur'an and Science) خاص اس موضوع پر ہے جو پہلی بار فرانسیسی زبان میں ۱۹۷۶ میں شائع ہوئی تھی۔ اور اب تک ۱۰ زبانوں میں اس کے ترجمے کئے جا چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر بوکانی کی دوسری کتاب ۱۹۸۳ میں پیرس سے شائع ہوئی ہے۔ ۲۲۰ صفحہ پر مشتمل اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن کا نام یہ ہے:

What is the Origin of Man?

ڈاکٹر مورس بوکانی نے اس کتاب میں خاص طور پر ان آیات کا مطالعہ کیا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جسم باور کے اندر انسان کی ابتدائی تخلیق کس طرح ہوتی ہے۔ مثلاً: اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک حلقہ کی شکل دی۔ پھر حلقہ کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا۔ پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا (۱۲/۲۳-۱۳) ڈاکٹر بوکانی نے دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے ایہام کا زمانہ ۶۱۰ سے ۶۳۲ تک ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مشرق و مغرب میں ہر طرف علمی تاریخی خیالی (scientific obscurantism) کا ذہن چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ اس دور کی تمام کتابوں میں اس زمانہ کے غیر علمی خیالات کا انوکھا س پایا جاتا ہے۔

مگر قرآن حیرت انگیز طور پر اس عمومی تاثر سے مستثنیٰ ہے۔ قرآن میں اپنے زمانہ کی کوئی ایک بھی علمی

غلطی راہ نہ پاسکی۔ حتیٰ کہ قرآن اگر اس زمانہ کی کسی رواجی بات کو نقل کرتا ہے تو وہ صرف اس کے صحیح اجزاء کو نقل کرتا ہے، اور اس کے غیر صحیح اجزاء کو حذف کرتا پلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مورس بوکانی نے اس سلسلہ میں ان آیتوں کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے جن کا تعلق انسان کی پیدائش اور رحم مادر میں اس کے ارتقاء سے ہے۔ انہوں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ انسان کی پیدائش کے بارہ میں قرآن کے جو بیانات ہیں وہ حیرت انگیز طور پر جدید تحقیقات کے عین مطابق ہیں۔ وہ تحقیقی نتائج جو پہلی بار صرف بیسویں صدی کے نصف آخر میں سامنے آئے ہیں، وہ ۱۳۰۵ سال پہلے کی کتاب قرآن میں کیوں کر موجود ہیں، یہ ظاہرہ (phenomenon) انتہائی مد تک عجیب ہے۔

ڈاکٹر بوکانی اس قسم کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علم کی تاریخ ہم کو اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتوں کی موجودگی کی کوئی انسانی توجیہ ممکن نہیں:

The history of science leads us to conclude that there can be no human explanation for the existence of these verses in the Qur'an (p. 188).

اس طرح کی کثیر مثالیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ علم کا دریا (river of knowledge) جو لوگوں کو انیسویں صدی میں الماد کی طرف جاتا ہوا نظر آ رہا تھا، اب بیسویں صدی میں وہ اپنا رخ موڑ کر مذہب کی طرف جا رہا ہے۔ مذہبی عقائد عین سائنسک سطح پر ثابت شدہ حقائق بنتے جا رہے ہیں۔ مذہب آج خالص سائنس کی روشنی میں، سب سے زیادہ قابل فہم اور قابل اعتبار آئیڈیالوجی بن گیا ہے۔

یہاں میں انساں ذکر کروں گا کہ مذہب کی صداقت کا ثابت ہونا اسلام کی صداقت کا ثابت ہونا ہے۔ کیوں کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب تہذیبی اور اضافی بنا پر اپنا استناد دکھو چکے ہیں۔ اب میدان میں صرف اسلام ہے جس کو مستند اور قابل قبول مذہب کا درجہ دیا جاسکے۔

سائنس کی طرف سے مایوسی

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کی سائنسی دریافتوں نے انسان کو علم سے زیادہ بے عملی تک پہنچایا ہے۔ مثلاً بلیک ہول کا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ ہماری کائنات کا صرف ۳ فی صد حصہ ہمارے لئے

قابل مشاہدہ ہے۔ بقیہ ۹ فی صد حصہ روشنی خارج نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے لئے قابل مشاہدہ ہی نہیں۔

یہ سادہ طور پر مادہ (mass) کی بات ہے۔ جہاں تک مادی مشاہدات کی توجیہ کا سوال ہے تو اس معاملہ میں سائنس نے ہمیں کسی بھی یقینی جواب تک نہیں پہنچایا ہے۔ ہر چیز جس کو آدمی جانتا چاہتا ہے، بہت جلد وہ دیکھتا ہے کہ اس کی حد (limit) آگئی۔ اور اس کے آگے معاملہ کو جانتا یا سمجھنا آدمی کے لئے موجودہ حالت میں ناممکن ہے۔

ان تجربات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں آدمی نے سائنس کے بارہ میں اپنے یقین کو کھود دیا ہے۔ کیونست دنیا کا مسئلہ اگر جبر تھا، تو آزاد مغرب دنیا کا مسئلہ ذہنی گھمنڈ (intellectual arrogance) تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو سائنس کی محدودیت (Limitations) بتا کر ان کے مٹی گھنڈ کو چور چور کر دیا۔

یہاں میں انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا (۱۹۸۳) کا ایک پیرا گراف نقل کروں گا۔ اس نے "ہسٹری آف سائنس" کے آرٹیکل کے تحت لکھا ہے کہ ابھی حال تک، سائنس کی تاریخ کامیابی کی تاریخ تھی۔ سائنس کی کامیابیاں بڑھتے ہوئے علم، اور جہات اور توہم پرستی پر فتح کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ سائنس سے ایجادات کا ایک سیلاب نکلا تھا جو انسانی زندگی کو ترقی دینے والا تھا۔ مگر حال میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار ہے۔ لامحدود تکمیل ترقیوں سے پیدا ہونے والے خطرات نے مورخین کو مجبور کیا ہے کہ وہ سائنس کے بارہ میں اپنے ابتدائی سادہ خیالات کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں :

Until recently, the history of science was a story of success. The triumphs of science represented a cumulative process of increasing knowledge and a sequence of victories over ignorance and superstition; and from science flowed a stream of inventions for the improvement of human life. The recent realization of deep moral problems within science, of external forces and constraints on its development, and of dangers in uncontrolled technological change has challenged historians to a critical reassessment of this earlier simple faith. (16/366)

خلاصہ کلام

دوسری دنیا (کیونست دنیا) میں اسلامی دعوت کے لئے کام کرنے کے مواقع محدود ہو گئے

تھے۔ اب وہاں اسلامی دعوت کے مواقع دوبارہ کھل گئے ہیں۔ جہاں تک پہلی دنیا (آزاد دنیا) کا تعلق ہے، وہاں کام کے مواقع پہلے سے موجود تھے۔ اب نئے حالات نے ان مواقع میں صرف مزید اضافہ کیا ہے۔

ان حالات میں ہماری ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اب ہمیں مزید طاقت اور سرگرمی کے ساتھ ان مواقع و دعوت کو استعمال کرنے میں لگ جانا چاہئے۔

اسلام کا احیاء اور مسلمانوں کی ترقی تمام تر دعوت کے عمل سے وابستہ ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں دعوت کے مواقع آخری حد تک کھول دئے گئے ہیں۔ اب تاریخ منتظر ہے کہ کچھ لوگ انہیں اور ان مواقع کو استعمال کر کے اسلام کی دعوت کو تمام بندگان خدا تک پہنچادیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف ہر قسم کے دعوتی مواقع کے دروازے کھل گئے ہیں۔ دوسری طرف وسائلِ اعلام (communication) کے جدید ذرائع نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ خدا کی دعوت سارے عالم میں پہنچائی جاسکے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہو جائے جس میں آپ نے فرمایا کہ زمین کے اوپر کوئی بھی مکان یا خیرہ نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے۔ تاریخ ہمیں یہ علم کریدت دینے کے لئے تیار ہے، بشرطیکہ ہم ان ضروری شرائط کو پورا کر دیں جس کے بعد کسی کو اس قسم کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔

تعمیر خویش

جاپان کے موجودہ بادشاہ آکی ہیٹو (Akihito) ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ کو باقاعدہ طور پر تخت پر بیٹھے۔ اس سلسلہ میں جو خبریں چھپی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے جو ٹائٹس آف انڈیا (۱۳ نومبر ۱۹۹۰) سے لے کر یہاں نقل کی جا رہی ہے:

In 1953 Akihito faced embarrassment when he was asked to represent his father, at the coronation of the British Queen Elizabeth and the London newspaper Daily Express polled British opinion on: should the Japanese crown prince attend the coronation? 67 per cent of those responded had said "no". Twenty-six years later when asked to comment on this experience, Akihito told Japanese journalists: "I strongly felt then how necessary it was for people of a country to live in plenty." Today Prince Charles, the eldest son of Queen Elizabeth and the heir to the British throne, attends Akihito's enthronement when Japan far surpasses Britain in wealth and is riding high the acme of its still growing economic power.

(The Times of India, November 13, 1990)

۱۹۵۳ میں آکی ہیٹو کو پریشانی لاحق ہوئی تھی جب کہ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ لندن میں منعقد ہونے والی برطانیہ ملکہ الزبتھ کی تاج پوشی کی تقریب میں اپنے والد کی نمائندگی کریں۔ اس وقت برطانیہ کے انبساطی اکیپرس نے برطانیہ عوام کی رائے معلوم کی۔ اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا جاپانی ولی عہد کو تاج پوشی کی تقریب میں شرکت کرنا چاہئے۔ ۶۷ فی صد انگریزوں نے جواب دیا کہ "نہیں" اس واقعہ کے ۲۶ سال بعد جب آکی ہیٹو سے اس تقریب پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے جاپانی صحافیوں کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس وقت میں نے نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ کسی ملک کے عوام کے لئے یہ کتنا ضروری ہے کہ ان کو خوش حالی اور فراوانی حاصل ہو۔

اب شہزادہ چارلس، ملکہ الزبتھ کے بڑے لڑکے اور برطانیہ تخت کے وارث، آکی ہیٹو کی تخت نشینی کی تقریب میں اس وقت شریک ہو رہے ہیں جب کہ جاپان دولت میں برطانیہ سے بہت زیادہ بڑھ چکا ہے اور اپنی بڑھتی ہوئی اقتصادی طاقت کے عروج پر پہنچ چکا ہے۔ ۱۹۵۳ میں جاپان کی تصویر یہ تھی کہ وہ ایک کمزور اور شکست خوردہ ملک ہے۔ اس

کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے (اور اسی طرح دنیا کی دوسری قوموں نے، اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جو واضح طور پر تمغیر اور تبدیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب جاپانیوں کے لئے ایک صورت یہ تھی کہ وہ رد عمل کا انداز اختیار کریں۔ وہ دوسری قوموں کے خلاف شکایت اور احتجاج کا لفظی طوفان برپا کریں۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

اس کے برعکس جاپانیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس قسم کی تمام اشتعال انگیز باتوں کو انہوں نے اعراض کے منانہ میں ڈال دیا۔ انہوں نے اپنی تمام طاقت اور اپنے تمام وسائل کو صرف ایک کام میں لگا دیا۔ اور وہ وہی تھا جس کو جاپان کے سابق شہنشاہ، میرقہیٹونے جاپان کی تعمیر نو سے تعبیر کیا تھا۔

اس کا نتیجہ میرت ناگ مدینک شاندار نکلا۔ آج جاپان دنیا کی نمبر ایک طاقت بننے کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ وہ ساری دنیا کو قرض دے رہا ہے۔ اس کی اسی ترقی کا نتیجہ ہے کہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ کو جب آکی ہیٹو کی تخت نشینی کی رسم ٹوکیو میں ادا کی گئی تو برطانیہ سمیت دنیا کی ۱۶۳ قوموں کے نمائندے اس میں شرکت کے لئے موجود تھے۔ حکومت جاپان نے اس تقریب پر ۹۵ ملین ڈالر خرچ کیا۔

اس دنیا میں ترقی کارا زہ ہے کہ آدمی دوسروں کی ناخوش گوار باتوں پر مہر کرے۔ وہ یکسو ہو کر صرف اپنی تعمیر میں لگا ہے۔ اگر آپ اپنے کو دوسروں سے اوپر اٹھالیں تو دوسروں کی زیادتیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔ آپ کسی مطالبہ کے بغیر دوسروں کے درمیان عزت اور سرفرازی کا مقام حاصل کر لیں گے۔

اصل عمل وہ ہے جو اپنے آپ پر کیا جائے۔ مگر نادان لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے مسئلہ کے حل کے لئے دوسروں کے اوپر مدد و جہد شروع کرتے ہیں۔

دوسرا انسان ہمیشہ آپ کے قابو سے باہر ہوتا ہے۔ مگر اپنی ذات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اپنی ذات پر عمل کرنے کی قدرت آپ کو ہمیشہ حاصل رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسرا اگر آپ سے چھینتا ہے تو خواہ وہ کتنا ہی زیادہ آپ سے چھین لے، پھر بھی ایک سب سے قیمتی چیز آپ کے پاس باقی رہے گی۔ اور وہ خود آپ کا اپنا وجود ہے۔ اس پیچے ہوئے سرمایہ کو استعمال کیجئے،

اور پھر آپ کو کسی سے شکایت باقی نہ رہے گی۔

تخریب نہیں تعمیر

دو آدمی ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ شروع میں دونوں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعد کو ایک خاندان تجارت کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس نے کافی پیسہ کمایا۔ اس نے اپنا گھر بھی بڑا بنا لیا۔ اس کے بعد ان لوگوں میں غرور آگیا۔ وہ اپنے کو بڑا سمجھنے لگے۔

اب دوسرے خاندان میں ردعمل پیدا ہوا۔ انہوں نے پہلے خاندان کے خلاف تخریب کاری کے منصوبے بنائے۔ انہوں نے طے کیا کہ اس کے سامان میں آگ لگائیں اور اس کے آدمیوں پر گولی اور ہم سے حملہ کریں۔ اس دوران ان کی ملاقات ایک تجربہ کار آدمی سے ہوئی۔ اس کو تخریبی منصوبہ کا حال معلوم ہوا۔ اس نے خاندان والوں سے پوچھا کہ تم کیوں ایسا کرنا چاہتے ہو۔

انہوں نے جواب دیا کہ پہلے ہم دونوں برابر تھے۔ ہماری لکیر بھی ایک فٹ کی تھی اور ان کی لکیر بھی ایک فٹ کی۔ اس کے بعد انہوں نے تجارتیں کیں اور اس کے ذریعہ سے اپنی لکیر کو دو فٹ بنالیا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ان کی لکیر کو کاٹ کر دوبارہ ایک فٹ بنا دیں۔ اس کے بغیر وہ لوگ ہمیں چین سے رہنے نہیں دیں گے۔

تجربہ کار آدمی نے کہا کہ لکیر کو چھوڑنا کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے جو زیادہ یقینی ہے۔ اگر تم چپا ہو تو میں تم کو یہ دوسرا کامیاب طریقہ بتاؤں۔ انہوں نے کہا کہ بتائیے۔ تجربہ کار آدمی نے کہا کہ وہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنی لکیر کو تین فٹ بنا لو، اس کے بعد ان کی دو فٹ کی لکیر اپنے آپ چھوٹی ہو جائے گی۔ خاندان والوں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ تجربہ کار آدمی نے کہا کہ تمہارے پڑوسی نے تجارت کے میدان میں اپنی لکیر کو بڑھا لیا ہے۔ تم اپنی لکیر کو مسلم کے میدان میں بڑھا لو۔

یہ بات خاندان والوں کی سمجھ میں آگئی۔ ان کے گھر میں ایک درجن چھوٹے بڑے لڑکے تھے سب کو انہوں نے یکسو کر کے تسلیم کے میدان میں لگا دیا۔ ۲۰ برس کے بچے آفتاب بائبل دوسرا

تھا۔ اب اس خاندان میں ہر قسم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جمع ہو گئے اور دھیرے دھیرے بڑے بڑے ہمدوں پہ پہنچ گئے۔ ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، آئی اے ایس افسر، ممبر اسمبلی، وغیرہ۔ دوسرے خاندان کی حیثیت پہلے خاندان سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ پہلے خاندان والوں کا سارا غرور اپنے آپ ختم ہو گیا۔

تخریب کاری کے ذریعہ یقین نہیں تھا کہ دوسرے کی لکیر چھوٹی ہو جاتی۔ اور اگر بالفرض چھوٹی ہوتی تو وہ بھی اس قیمت پر ہوتی کہ پہلے خاندان کی لکیر بھی مزید چھوٹی ہو چکی ہو۔ مگر تعمیر کاری کا طریقہ صدنی صد کامیاب رہا۔ اب کسی بھی قسم کا ذاتی نقصان کئے بغیر دوسرے خاندان کی لکیر اپنے آپ چھوٹی ہو گئی۔

دنیا میں جتنے جھگڑے ہیں، ان سب کا خلاصہ صرف ایک ہے۔ اور وہ دوسرے کی بڑھی ہوئی لکیر کو چھوٹا کرنے کا جنون ہے۔ آج ہر فرد اور ہر گروہ اسی کوشش میں سرگرم نظر آتا ہے۔ ہر ایک اپنی ساری توجہ اس کام میں لگائے ہوئے کہ وہ دوسرے کی بڑھی ہوئی لکیر کو کسی نہ کسی طرح چھوٹا کر دے۔ تاکہ دونوں کی حیثیت برابر ہو جائے۔

” دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنا “ بجائے خود کوئی برا جذبہ نہیں۔ یہ جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اسی جذبہ کی وجہ سے دنیا میں مقابلہ و مسابقت کی فضا بنتی ہے۔ اسی کی وجہ سے تمام سرگرمیاں ظہور میں آتی ہیں۔ اگر لوگوں میں یہ جذبہ ختم ہو جائے تو دنیا سے تمام سرگرمیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ مگر اس جذبہ کا صحیح استعمال تعمیر کا میدان ہے نہ کہ تخریب کا میدان۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنے کی فکر نہ کرے بلکہ اپنی لکیر کو بڑا کرنے میں لگ جائے۔ اس کے بعد سلا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ ضرورت نہ ہو گی کہ علیحدہ سے فریق ثنائی کی لکیر کو چھوٹا کرنے کی کوشش کی جائے۔

دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنے کے لئے دوڑنا تخریب کاری ہے، اور اپنی لکیر کو بڑا کرنے کے لئے محنت کرنا تعمیر کاری۔ تخریبی سرگرمیوں سے پورا سماج برباد ہوتا ہے۔ مس کا ایک حصہ خود تخریب کار کو بھی مٹا ہے۔ اس کے برعکس تعمیری سرگرمیوں سے پورا سماج ترقی کرتا ہے، اور دوبارہ اس ترقی کے فوائد مختلف صورتوں میں خود تعمیر کار کو بھی ضرور پہنچتے ہیں۔

آپ کو جب بھی مسوسس ہو کہ دوسرے شخص کی لکیر بڑی ہو گئی ہے تو دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنے کے پیچھے نہ پڑئے۔ آپ صرف یہ کیجئے کہ وہی طاقت تمیر کے راستوں میں لگا کر اپنی لکیر کو بڑا کر لیجئے۔ اس کے بعد وہی مقصد زیادہ بہتر طور پر حاصل ہو جائے گا جو آپ اپنے تحریری منصوبوں کے ذریعہ ناکام طور پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اگر آپ کھلی آنکھ سے دیکھیں تو دونوں قسم کی مثالیں آپ کو اپنے آس پاس ہی دیکھنے کو مل جائیں گی۔ وہ مثالیں بھی جب کہ ایک شخص نے دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنا چاہا، مگر آخر کار جو نتیجہ ہوا وہ یہ کہ خود اس کی اپنی لکیر مزید چھوٹی ہو کر رہ گئی۔ اسی کے ساتھ وہ مثال بھی جب کہ ایک شخص دوسرے کے پیچھے پڑنے کے بجائے خود اپنی لکیر کو بڑا کرنے میں لگ گیا۔ اور چند برسوں کے بعد تمام دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کی لکیر بڑی ہو گئی ہے اور دوسرے کی لکیر چھوٹی۔ اگرچہ دنیا میں پہلے قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں، اور دوسرے قسم کی مثالیں اس کے مقابلہ میں بہت کم۔

تعبیر و ترقی کی یہ کارگر تدبیر ایک شخص کے لیے بھی ہے اور پوری قوم کے لیے بھی۔ انفرادی سطح کی کامیابی بھی اسی طریقہ سے حاصل ہوتی ہے اور اجتماعی سطح کی کامیابی بھی اسی طریقہ سے موجودہ دنیا میں حقیقی اور پائدار کامیابی حاصل کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں۔

ملت کے کارواں کی شاہراہ ابدی طور پر شریعت میں مقرر کر دی گئی ہے۔ اور رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی زندگیوں کی صورت میں اس کا ایک مکمل نمونہ تاریخ میں قائم کر دیا گیا ہے۔ اب مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے ذریعہ اس شاہراہ حیات کو معلوم کریں اور رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے نمونہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ اسی میں ان کی دنیا کی فلاح ہے اور اسی میں ان کی آخرت کی فلاح بھی۔

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN 81-8506-394-X



9 7881 8506 3942